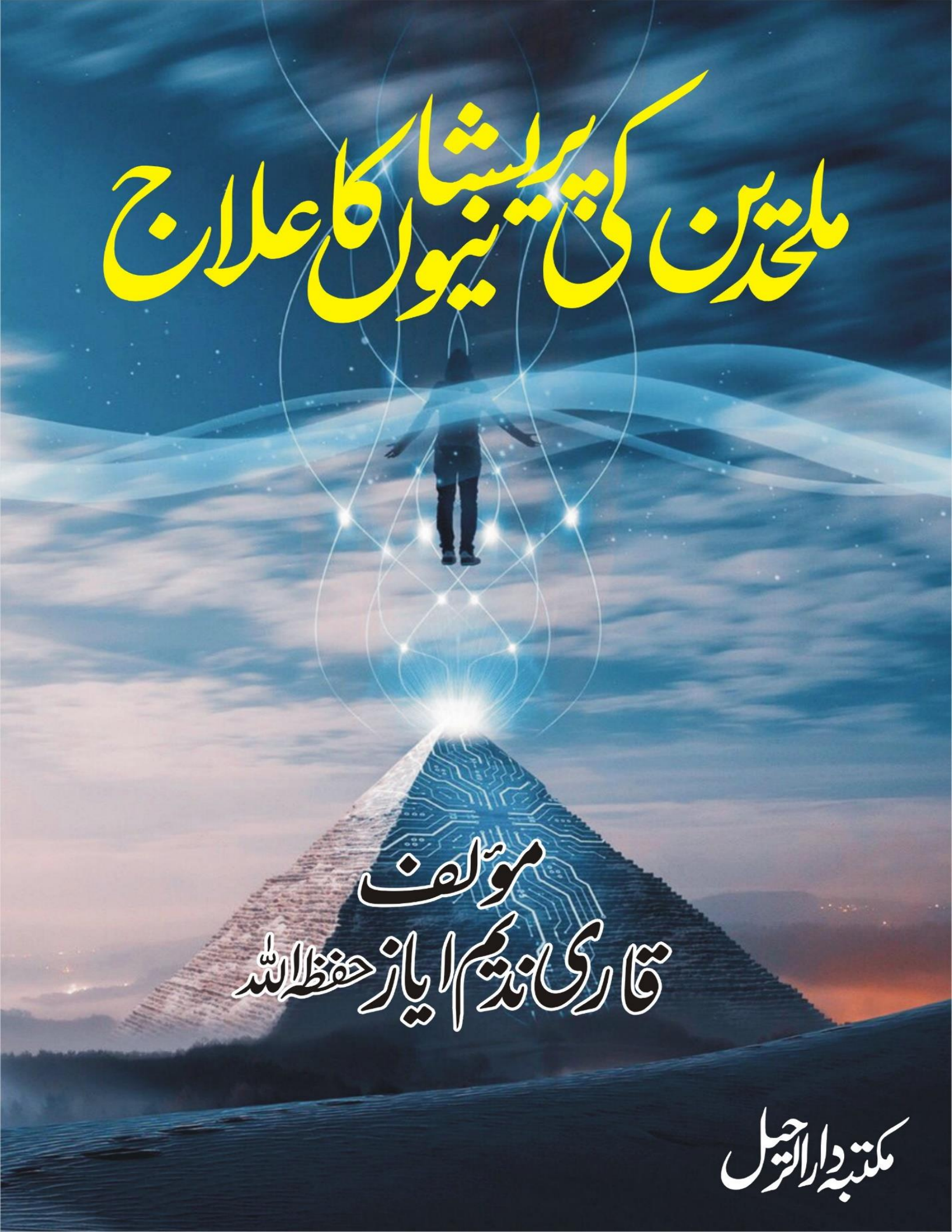
ملحدین کی پریشانیوں کا علاج
مؤلف
قاری ندیم ایاز حفظہ اللہ
مکتبہ دار الترحیل

فہارس

بسم اللہ الرحمن الرحیم 4

مقدمہ 4

خدا کو کس نے بنایا ایک سائنسی رخ 5

عہد الست کیا ہے اور انسان اسکا مکلف کیوں ہے؟ 17

جب خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے تو انہیں جہنم میں کیوں کر ڈالے گا؟ 22

زلزلہ ٹیکٹانک پلیٹوں کی میکانکی حرکت کا مظہر ہے یا خدا کے غضب کا؟ 28

خدا اور شیطان کی بحث 32

خدا اور شیطان کا معاملہ - چند بڑے اعتراضات کا جائزہ 37

خدا کو ہماری عبادت کی کیا پرواہ؟ 43

اچھے کام کرنے والوں کی زندگی تنگ کیوں ہو جاتی ہے 47

خدا کیوں چاہتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں؟ 50

کیاخدا کو ہماری عبادت کی ضرورت ہے؟ 56

کائنات کو بنانے سے پہلے خدا کیا کر رہا تھا؟ 62

ہم خدا کی عبادت کیوں کریں؟ 66

خدا کی واحدانیت((Divine Singularity 81

خدا اور کوئی کیوں نہیں ہو سکتا؟ 86

خدا ایک سے زائد کیوں نہیں ہو سکتے 91

انسان خدا کو کیوں نہیں سمجھ پاتا؟ 97

خدا کے نشانات 111

مسئلہ رویت باری تعالیٰ اور قرآن 122

خدا خود کو آخر ظاہر کیوں نہیں کرتا؟ 129

عقل، سائنس اور خدا کی تلاش 133

انکارِ خدا کے فلسفے کی بنیادی دلیل کی معقولیت 137

انکارِ خدا، سائنسدانوں کی گواہی اور عقل 141

وجودِ خدا، انبیاءؑ کی گواہی اور عقل 147

انبیاءؑ کی گواہی پر اعتبار اور اسکی معقولیت پر ایک بحث.....155

خدا اور مادی اسباب 163

تجرباتی علم پر وجود خدا کو پرکھنے والوں کی بنیادی اغلاط 167

بن دیکھے خدا پر یقین کیوں؟.....170

غیب بالشہود+شہود بالغیب=علم 176

خدا اور معروضی اخلاقیات[[Objective Morality 180

خدائی شہادت-قرآن.....194

خدا کے بغیر زندگی—الحاد کے اثرات.....252

کیا سائنس نے خدا کو مسترد کر دیا ہے؟ جھوٹے الحادی مفروضوں کا تنقیدی جائزہ.....265

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے " ملحدین کی پریشانیوں کا علاج " کے عنوان سے اہل علم کے کچھ موضوعات تلاش کرکے مرتب کردئیے یقینا پڑھنے والوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ ان شاء اللہ

یہ اس سلسلے میں دوسری تالیف ہے بعد میں اور تالیفات کا اضافہ کیا جائیگا ۔ آپ حضرات وخواتین ہم سے فیس بک پیج peaceofmind.na کے ذریعے رابطے میں رہئیے تاکہ نئی تالیف کے آنے پر بروقت مطلع ہوسکیں۔

مضامین نگار چونکہ بہت سے ہیں ضروری نہیں کہ ہم یا آپ ان سب سے یا انکی سب باتوں سے متفق ہوں جو بات دلیل کے مطابق ہوں وہ ہم قبول کریں گے مجموعی طور پہ اہل علم کی تحریروں میں خیر ہی غالب ہوتا ہے الحمد للہ ۔

کتاب سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ فہرست پڑھئیے اور جو عنوان آپکو پسند آئے وہ مطالعہ کیجئے اور یقینا اس فہرست میں کافی دلچسپ عنوانات ہیں۔

آپ حضرات اپنا مشورہ دینا چاہیں تو بلا جھجھک رابطہ کریں لیکن خیال رہے کہ صرف میسیج پر ہی غور کیا جائیگا فون پہ بات کرنا ممکن نہیں کیونکہ وقت کی شدید قلت کاسامنا ہے۔

نوٹ : اس تالیف سے مقصد کسی قسم کی دنیوی نفع بالکل نہیں ہے اور نہ ہی یہ برائے فروخت ہے بلکہ بالکل مفت فراہم کی جارہی ہے۔

قاری ندیم ایاز ۲۳ اگست ۲۰۲۱

مکتبہ دارالرحیل

www.peaceofmindna.com

peaceofmina.na facebook 00923172134743 whatsapp

خدا کو کس نے بنایا ایک سائنسی رخ

شعور کے خوگر انسان کے لیے خدا کا وجود ہمیشہ ایک معمّہ ہی رہا ہے اور ہر دور میں علم، منطق اور عقل کی روشنی میں خدا کو جاننے کی کاوشیں جاری رہی ہیں۔ آیئے! اسی عقل، منطق، علم اور سائنس کی دریافتوں کی روشنی میں خدا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن خدا کے وجود کا پیرایہ سمجھنے سے پہلے وجود کی ماہیّت سمجھنا ضروری ہے کہ وجودیت خود کیا ہے!

وجود کا قفس:Cage of Existence

انسان اور اس کی عقل و شعور کا موجود ہونا بذات خود ایک عجوبہ ہے۔ انسان جب کائنات کی تخلیق کے حوالے سے خدا کے وجود پر غور کرتا ہے تو اس کی عقل اس لیے معطّل ہو جاتی ہے کہ وہ وجودیت کے پیرائے کو اپنے شعور میں ایک فطری اور سختی سے پیوست تاثر کا پرتو ہی سمجھنے پر مجبور ہے۔ انسان طبعی وجودیت میں قید ہے اور اپنے محدود شعور کے باوصف وجود کے حوالے سے اسی طبعی وجودیت کو حرف آخر سمجھتا ہے۔ یہی ایسی بھول بھلیّاں ہے جس میں انسان صدیوں سے گھوم رہا ہے اور نکل نہیں پا رہا۔ جدید علوم اور نئی دریافتوں نے اس مخمصے میں اضافہ کیا ہے۔ حقیقت آشنائی

کے لیے اب کسی اچھوتی سوچ کی ضرورت ہے جو اس طبعی وجودیت کے قفس کے قفل کو توڑ دے جس میں انسانی تخیّل مقیّد ہے اور ایک عقلی اور شفّاف نقطۂ نظر سے کائنات، وجودیت اور خدا کو جانے۔ اس کے لیے سائنسی طریقہ کار اپنانا ہو گا کہ مفروضات hypothesis کا سہارا لے کر علم اور عقل کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جائے۔ آئیں ہم غور کرتے ہیں کہ کیا وجودیت اور زندگی خود بھی مخلوق ہیں؟

زندگی کی ساخت: Fabric of Life

وجود زندگی سے ہے اور زندگی کی ساخت ایٹم اور خلیے سے ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی مدّ نظر رہے کہ ہر عنصر کی اکائی (ایٹم) ایک پس پردہ فطرت اور جبلّت کی خوگر ہوتی ہے۔ آکسیجن اگر آگ جلاتی ہے تو کاربن اسے بجھاتی ہے۔ یہ ان کی جبلّت ہے۔ سائنس اسے خاصہ یّت یا property کہتی ہے۔ کسی بھی عنصر کی کارکردگی اس کی جبلّت کے طابع اور متعیّن حدود میں ہی ہو گی۔ منطقی طور پر کسی بھی زندگی کی حواسی اور شعوری صلاحیّت اس کو پروان چڑھانے والے بنیادی عوامل کی جبلّت کے رنگ میں ہی عیاں ہو گی۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اگر زندگی فوٹون سے ابھرتی ہے تو کیونکہ فوٹون غیر مرئی ہے اور اس کی جبلّت بے قراری ہے یعنی یہ ایک سیماب صفت اکائی ہے جو بہت رفتار سے چلتی ہے تو اس سے متعلق زندگی بھی غیر مرئی اور برق سے زیادہ تیز رفتار ہو سکتی ہے۔ اسی طرح عناصر اور کائناتی قوتوں کی اکائیاں بھی اپنی جدا خاصیّتوں کے ساتھ موجود ہیں۔

خلوی زندگی: Cellular Life

سائنسی دریافتیں بتاتی ہیں کہ وجود میں آنے کے بعد کائنات رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی، پھر ایک وقت میں زمین پر حالات ایسے سازگار ہوئے کہ پانی میں ایٹم سے بنے خلیے سے زندگی پھوٹ پڑی جس میں طویل ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے بقول سائنسداں انسان اپنے شعور کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کیا ہے؟

زندگی ایک فعّال اور بے چین معمّہ یا "چیز" ہے جو اپنے آپ کو خاص ماحول میں عیاں کرنے کی جبلّت رکھتی ہے۔ زندگی ایک آزاد اور کھلا راز ہے جو ہر طرح کے ماحول میں ابھرنے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ یہ ایک غیر مرئی سچّائی اور وقوعہ Phenomenon ہے جو موجود ہے۔

سائنس کے مطابق کائنات ایٹم سے بنی اور زندگی خَلیے cell میں شعور کا نام ہے۔

تو پھر شعور کیا ہے؟

شعور احساس زندگی ہے مگر سائنس کے مطابق شعور زندگی کی پہیلی کا ایک حصہ اور غیر حل شدہ عُقدہ ہے۔

اب سوال اٹھتے ہیں کہ:

کیا حیات صرف خلیات ہی میں محصور ہے؟

کیا حیات صرف اور صرف پانی سے ہی ابھر سکتی ہے؟

اجنبی حرارتی اور مقناطیسی زندگی: Alien Thermal & Magnetic Life

اب ایک دوسرا رخ بھی دیکھے۔ سائنس کے نظریے کے مطابق کائنات بگ بینگ سے وجود میں آئی۔ اس نظریے کا سادہ سا تجزیہ کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس ابتدائی وقت میں نہ صرف توانائی اور قوّتیں موجود تھیں بلکہ ہر طرح کے مادّے، اجرام فلکی اور ہر طرح کی حیات اور فطری قوانین بھی آپس میں ضم تھے۔ شروع میں ہر طرف آگ تھی جو ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی اور جوں جوں کائنات پھیلی تو رفتہ رفتہ تمام چیزیں عیاں ہوتی گئیں۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس دوران زندگی کی سچّائی بھی ایک غیر مرئی صورت میں موجود رہی ہو گی اور مختلف ادوار میں قدرتاً مختلف صورتوں میں عیاں ہوئی ہو گی۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ جس طرح عناصر خلیات بناتے ہیں اسی طرح کچھ مخصوص پارٹیکل یا قوّتیں مل کر ایسی چیز بناتے ہوں جس میں ایک بالکل جدا پیرائے کی حیات اور شعور ابھرتے یا ظاہر ہوتے ہوں! پانی سے پہلے کیا زندگی توانائی، قوّت اور حرارت کے پیرائے جیسے روشنی یا ثقل سے پیدا ہو کر کسی اجنبی شعور کے ساتھ ارتقاء پذیر نہ ہوئی ہو گی؟ ہم کس منطق یا علم کے تحت ایسی حیات کو مسترد کریں گے جو شاید کائنات کے کسی گوشے میں موجود بھی ہو۔

سوال یہ ہے کہ: ایسا کیوں نہیں ہوا ہو گا؟

کیونکہ زندگی موجودہ دور میں بھی زمین پر آتش فشانی ماحول میں ایک اچھوتے پیرائے میں خود کو ظاہر کر رہی ہے لہذٰا ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں خود کو آتشی ماحول میں عیاں کرنے کی قوّت ہمیشہ سے موجود ہے۔ ہماری زمین پر ہی سمندر کی گہرائی میں آتش فشانی وینٹ میں حالیہ دریافت شدہ ٹیوب وارم جو سورج کی روشنی کے بغیر زندہ ہیں اور توانائی حاصل کرنے کے لیے کیمیکل پر انحصار کرتے ہیں، ایک عجوبہ ہیں۔ یہ شعاعِ ترکیبی photosynthesis کے بجائے کیمیا ترکیبی Chemosynthesis سے توانائی حاصل کرتے ہیں اور دلچسپ امر یہ ہے کہ گو کہ دونوں طریقوں میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی استعمال ہوتے ہیں لیکن کیمیا ترکیبی میں آکسیجن کے بجائے سلفر خارج ہوتی ہے۔

Instead of photosynthesis, vent ecosystems derive their energy from chemicals in a process called “chemosynthesis.” Both methods involve an energy source (1), carbon dioxide (2), and water to produce sugars (3). Photosynthesis gives off oxygen gas as a byproduct, while chemosynthesis produces sulfur.

اس سے ہمارے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے کہ کائنات میں حرارت اور روشنی سے مختلف حیات کا عیاں ہونا بعید از قیاس نہیں کیونکہ اِس وقت زمین پر معتدل حالات میں بھی مذکورہ بالا زندگی کا ایک نئ طرز میں ظاہر ہونا زندگی کی اپنی طاقتور اور ہمہ جہت جبلّت اور وصف کا مظہر ہے۔ یعنی زندگی کا وقوعہ Phenomenon of Life مختلف ماحولیات میں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ گویا یہ کثیر الجہت Multi dimensional ہے۔ ایک منطقی بات یہ سامنے آتی ہے کہ اگر زندگی کی جہتیں ایک سے زیادہ ہوں گی تو وجود کی ماہیّت بھی مختلف ہو سکتی ہے کیونکہ ان کی آفرینش کے جبلّی پیرائے غیر طبعی اور عام انسانی حواس سے ماوراہوں گے لہذا اس بنیاد پر پیدا ہونے والی زندگی بھی اپنے وجود کے حوالے سے انسان کے لیے نہ صرف غیر مرئی ہو گی بلکہ انسانی حواس سے ماوراہو گی جیسے ثقل، مقناطیس، روشنی سے منسلک زندگی نامعلوم پیرائیوں میں موجود ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے اپنے وجودی پیرائے میں زندہ ہوں گی اور اپنے اپنے شعوری اور عقلی دائرے میں علمی ارتقاء کی طرف گامزن بھی ہو سکتی ہیں۔ یعنی انسان ہی اپنے علم کے تئیں کائناتی زندگی کی ابتدا کو پانی تک محدود سمجھتا رہا ہے جبکہ حقیقت اس کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔

مشترک اور مختلف جبلّت: Common & Diverse Intrinsic

ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ زندگی کے لیے مانوس ماحول ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پیدا ہوا تو اور دوسرے عناصر کے ملاپ سے کیوں نہ پیدا ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ دو عناصر ایک ایسی چیز بناتے ہیں جس کی جبلّت سے زندگی کی مختلف جہتوں میں سے کوئی ایک جہت مانوس یا ہم آہنگ Compatable ہے جس کی وجہ سے حیوانی زندگی پانی میں نمودار ہوئی۔ ہم اس لیے اس زندگی کو بآسانی پہچانتے ہیں کہ زندگی اور ہمارے ذہن و دماغ ایک ہی مشترک خلوی منبع cellular origin سے ابھری ہیں اور یہ فطری اور جبلّی طور پر آپس میں ہم آہنگ ہیں۔ اسی طرح جب تخلیقی جبلّت مختلف ہو گی تو کسی غیر عنصر یا توانائی و حرارت سے متعلّق زندگی کا ادراک جبلّی ہم آہنگی کے فقدان کی وجہ سے ہمارے ذہن اور حواس سے ماوراء ہو گا اور وہ ہمارے لیے معدوم اور ''بے وجود'' ہی رہے گی۔ اس کا منطقی اور اصولی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر نامعلوم پیرائے کی زندگی ہمارے لیے طبعی طور پر معدوم رہے گی۔

شعور کی قسمیں: Forms of Conciousness

اسی کرۂ ارض پر خلیات پر مبنی حیات جانور، پرند، حشرات الارض، درختوں اور پھولوں کی شکل میں بھی موجود ہے جو شعور کے حامل ہیں اور جوڑے pairs بھی رکھتے ہیں، گویا خلوی حیات کے کئی متوازی نظام ہمارے سامنے رواں دواں ہیں مگر اس کے باوجود ابھی انسان ان کے شعور اور آپس کے روابط کی حقیقت نہیں جان پایا جس سے انسان کی کم علمی بھی عیاں ہے۔ ثابت یہی ہوتا ہے کہ جب خلوی حیات اور اس سے منسلک شعور کی لاتعداد قسمیں ہمارے سامنے ہیں تو غیر خلوی حیات اور اس سے منسلک شعور اور وجود بعید از قیاس کیسے ہو سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے انسان کیوں کسی اجنبی پیرائے کی حیات کی تصدیق نہیں کر پاتا؟

وجود کا دائمی ذہنی ادراک: Constant Mental Perception of Existense

اگر زندگی کسی توانائی مثلاً فوٹون Photon سے آشکارا یا نمودار ہو تو کیا ہم یہ جان سکتے ہیں کہ :

اس کے شعور کے پیرامیٹر کیا ہوں گے ؟

اس کے حواس کس طرز کے ہوں گے ؟

اس کی قوتوں کے پیرائے کیا ہوں گے ؟

اُس طرزِ حیات کے ارتقاء کے مراحل کیسے ہوں گے اور اس کی عقل اگر ہوئی تو اس کی ماہیّت کیا ہو گی ؟

یقیناً ہم یہ نہیں جان سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وجود کے حوالے سے ہمارے تصوّر اور تخیّل کے پیرائے ہماری اساس یعنی خلوی حیات cellular life سے منتھی یا منسلک ہیں، ہمارے ذہن میں وجود کا متعیّن ادراک فطری طور پر طبعی ہے۔ ہم کبھی بھی کسی اجنبی وجودیت یا اجنبی زندگی کے حقیقی پیرائے Alien Life Parameters کو اپنے تخیّل کے فطری خلوی پیرائے Natural Cellular Thought Parameters میں رہتے ہوئے نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ یہ آپس میں مانوس اور ہم آہنگ compatible نہیں ہیں۔ اسی اساسی خلوی جبلّت کے پرتو ہمارے ذہن میں وجودیت ایک خاص طبعی پیرائے میں اس سختی سے ثبت ہے کہ یہ ادراک perception اب ایک جنّیاتی ورثے Genetic Heritage کی طرح ہر خاص و عام کا مستقل ذہنی وصف بن چکا ہے۔ تمام انسان بشمول اسکالر اور سائنسداں اپنے اطراف کے پُراثر طبعی ماحول کے پیدائشی اور مستقل اسیر ہوتے ہیں اور وجود اور عمل سے منسلک خیالات اور احساسات بھی خلوی شعور کے زیر اثر ایک خاص طبعی تاثر کے آفاقی دائرے میں گردش کرتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے لیے کسی اجنبی پیرائے میں زندگی کا وجود ذہناً ناقابل قبول ہو جاتا ہے۔ اپنے شعور اور عقل کے با

وصف ہم یہ نتیجہ تو اخذ کر سکتے ہیں کہ زندگی مختلف نہج Dimensions میں ظاہر ہو سکتی ہے یا ہوئی ہے لیکن جبلّی ہم آہنگی کے فقدان کی وجہ سے کیونکہ ہم اپنے تجربات، عقل اور علم کی روشنی میں کسی غیر خلوی حیات کی نمو پذیری کی تصدیق نہیں کر پاتے، اسی لیے ہم اس کو اپنی عقل کے پرتو مسترد کرتے رہے ہیں۔

خلوی شعور کے حوالے سے یہ واضح رہے کہ آگ سے ابھرنے والی زندگی اور اس کے شعوری پیرائے آتشی ہی ہوں گے، اسی طرح برقی جبلّت سے آشکارا یا نمو پذیر زندگی کا شعور بھی برقی شعور ہی کہلائے گا کیونکہ اس کی اساس برقی ہو گی جبکہ روشنی کے پیرامیٹر کی زندگی کا شعور شُعاعی ہو گا۔ ایسی کسی حیات یا وجود کی طبعی یا سائنسی تصدیق فی الوقت ممکن نہیں بلکہ ان کی قبولیت ایمانیات اور عقائد کے زیر اثر ہی ہو سکتی ہے۔

وجودیت کے پیرائے: Parameters of Existence

اس بحث سے صرف یہ اخذ کرنا تھا کہ ہم جسے وجود کہتے ہیں، وہ ایک مخصوص احساس یا تاثر ہے جو ہمیں کسی ایسی ہستی یا چیز کا ادراک دیتا ہے جس کا تعلق کسی یکساں، مختلف یا منفرد حیات سے ہو سکتا ہے۔ یہ بھی واضح ہوا کہ کائنات میں موجود مختلف عناصر اور توانائیوں میں حیات کے ابھرنے کے مواقع منطقی بنیاد پر دور از کار نہیں۔ گویا وجود مختلف دائروں میں مختلف جہتوں میں جلوہ گر ہو سکتا ہے۔ اس طرح وجود کے ایک دائرے میں رہائش پذیر حیات دوسرے دائرے کی حیات سے جدا خصوصیت کی حامل ہو گی۔ ان کا آپس میں ربط ان کے بنیادی اجزاء کی باہمی ہم آہنگی پر منحصر ہو گا۔

ہم نے ابھی یہ سمجھا کہ موجود ہونے کے بہت سے پیرائے یا رنگ ہو سکتے ہیں اور یہ مختلف دائروں میں عیاں ہو سکتے ہیں۔ کائنات اور خود انسانی تمدّن میں جاری نظم ایک آفاقی حقیقت ہے، اس کے بموجب یہ قیاس کرنا منطقی ہوگا کہ وجود یا موجود ہونے کے کائناتی نظام پر حاوی کوئی نظام ہو سکتا ہے جو وجودیت کو مختلف پیرائے اور رنگ دینے کی صلاحیّت رکھتا ہو ورنہ مختلف طبعئی حیات کا ہونا غیر حقیقی ہو جائے گا۔ اب اگر ایسا ہے تو یقیناً وہ حیات یا نظم یا قوّت، جس نے وجود کے دائرے تخلیق کیے، وہ یقیناً تمام موجود کائناتی حیات سے انتہائی جدا اور برتر ہو گی۔ اسی نے انسان کو ایک ذہنی قید خانے محصور کر رکھا ہے۔

جب ہم ایک وائرلیس ریموٹ کے ذریعے بہت دور سے کسی مشین کو کنڑول کرتے ہیں تو بظاہر کوئی واسطہ نظر نہیں آتا لیکن در حقیقت وہ مشین ایک نہ نظر آنے والے نظام سے منسلک ہوتی ہے۔ ایک لا علم کے لیے یہ ایک عجوبہ یا Baffle ہوگا جبکہ جاننے والوں کے لیے یہ ایک مربوط نظام ہے۔ بالکل اسی طرح انسان اطراف میں مخفی نظام ہائے کائنات کی ہیئت سمجھنے میں مشغول تو ہے لیکن مکمل نظم System کو ابھی تک سمجھنے سے قاصر اور حقیقی کائناتی نظام سے بہت حد تک لا علم ایک مخلوق ہے۔ مختصراً، اگر کائنات ایک تخلیق ہے تو اس میں موجود زندگی بھی ایک تخلیق ہی ہے اور انسان کے شعور کے بموجب وجودیت بھی ایک غیر مرئی مخلوق ہوئی الّا یہ کہ جدید علوم عملی طور پر Practically یہ ثابت کر دیں کہ عدم سے وجود یا نیست سے ہست things from nothing خود بخود کیسے ظاہر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اچانک کائناتی تخلیق spontaneous creation میں زندگی اور شعور کا عیاں ہونا بھی ایک نا قابل تشریح عجوبہ ہی ہے۔

وجود خدا کی حقیقت: Reality of Existence of God

وجود ایک ذہنی تاثر ہے جس کی وجہ سے ہم موجود ہونے کو ہی وجود گردانتے ہیں کیونکہ ہماری نموپذیری شعور کے احساس وجود میں ہوتی ہے۔ خدا ایک ایسی ہستی ہے جس نے یہ نظام تخلیق کر دیا جس میں موجود ہونے کا شعور ہی زندگی کہلایا۔ ہمارا خلوی شعور وجود کا ایک فطری طبعی تاثر ہمارے ذہن میں تخلیق کیے رہتا ہے۔ انسان خدا کو سمجھنے کی کوشش وجود اور عدم وجود یا حاضر اور غائب کے اُنھی طبعی پیرایوں میں کرتا ہے جو خلوی شعور کے بموجب مستقل فطری تاثر بن چکے ہیں۔ یہ سوال کہ خدا کو کس نے بنایا؟ تجسّس میں اسی فطری تاثر سے اٹھتا ہے اور انسان خدا کو بھی اپنی طرح کی زندگی اور وجود کا خوگر سمجھتے ہوئے جاننے کی کوشش کرتا ہے جو کہ خدا کے حوالے سے ایک غیر حقیقی تصوّر illusion ہے۔ خدا یقیناً ایک زندہ ہستی ہے لیکن اس ہستی کا پیرایہ کیا ہوگا اُس کو انسان اپنی عقل کی خلوی ساخت Cellular Based Wisdom کی وجہ سے سمجھنے کا مکلّف ہی نہیں ہے۔

دیکھیے بجلی یا برق Electric کی ساخت کی بھی ایک جبلّت ہے جس کو قابو کر کے انسان نے کمپیوٹر اور روبوٹ بنا کر ان کو مصنوعی زندگی اور مصنوعی عقل دی۔ جس طرح انسان کے تخلیق کردہ الیکٹرانک ماحول میں مقیّد کوئی سپر روبوٹ بھی اپنی برقی Electronic جبلّت کی محدودیت اور نامانوس جبلّی ساخت کی وجہ سے خلوی زندگی Cellular life کے پیرائے نہیں سمجھ سکتا بلکہ اس کی رمق تک بھی نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح انسان خدا کو طبعی اور خلوی پیرایوں میں مقیّد رہ کر شاید کبھی نہ سمجھ پائے۔ ریڈار ایک مصنوعی ''حواس'' کا خوگر نظام ہے کہ اس سے خارج ہونے والے سگنل کسی جسم سے ٹکرا کر اس کا الیکٹرونک تاثر لے کر واپس آتے ہیں اور اس کی موجودگی کو ظاہر کرتے ہیں لیکن اسٹیلتھ تکنیک Stealth Technology اس کو غیر مؤثر کر دیتی ہے۔ یعنی اگر چار جہاز اُڑتے آرہے ہیں اور ان میں ایک اسٹیلتھ ساخت کا ہے تو ریڈار صرف تین جہاز دکھائے گا۔ اسٹیلتھ نظام سے آراستہ کوئی جسم اس کو نظر نہیں آئے گا۔ گویا جہاز، ایک ٹھوس جسم کھلی فضا میں موجود ہوتا ہے لیکن ایک مقیّد ماحول یعنی ریڈار کے کنٹرول روم، یعنی کسی خاص پیرائے میں موجود سے معدوم ہو جاتا ہے۔ یہی صورتحال انسان کے حواس اور تخیّلات کے

بموجب خدا کے وجود کی ہے کہ انسان سب کچھ دیکھ سکتا لیکن خدا کو نہیں کیونکہ کائنات کا ماحول اسی ریڈار کے کنٹرول روم کی طرح ہے جس میں انسان اپنے حواس کے طابع ہر چیز کا شعور حاصل کر سکتا ہے جبکہ خدا کسی نامعلوم اسٹیلتھ جیسے پیرائے میں رہ کر ہر چیز پر حاوی ہے۔ اگر خدا اس طبعی ماحول سے کسی ایسے پیرائے میں بھی منسلک ہوتا جس کا فی الوقت انسان کو علم ہے تو انسان اب تک خدا کے وجود کا پیرایہ جاننے کی طرف پیش قدمی کر چکا ہوتا۔ در حقیقت میٹافزکس جوں جوں فزکس میں ضم ہوتی رہے گی، خدا کو سائنسی طور پر قبول کرنے کے مواقع اتنے ہی بڑھیں گے۔

منکرین کے مخمصے: Confusion of Nonbeleivers

الحاد دراصل کائنات اور وجود کی حقیقت کی تلاش میں سر گرداں سوچتے ہوئے انسانی ذہن کا مخمصہ ہے اور بس! کیونکہ کوئی بھی بڑے سے بڑا منکر خدا خواہ وہ کوئی عظیم اسکالر یا سائنسدان ہی کیوں نہ ہو، آج بھی کائنات اور زندگی کے عجوبے کی تشریح خدا کو خارج کر کے نہیں کر سکا۔ ان کے پاس نہ زندگی اور شعور کی سائنسی وضاحت ہے اور نہ ہی انسانی جذبات و خیالات کے اجراء کی توضیح ہے۔ علم، عقل اور منطق کے سہارے سائنسی نظریات کا دفاع کرتے ہوئے جہاں بے بس ہو جاتے ہیں تو کچھ اس طرح کہہ دیتے ہیں کہ یہ ایک حیران کن مسٹری ہے جس کا پتہ کبھی چل جائے گا۔ سائنس کی محدودیت اس بات سے ہی عیاں ہے کہ یہ صرف ان سوالات کا جواب دیتی ہے جو کیا اور کیسے سے شروع ہوتے ہیں اور بہت سے انتہائی ضروری 'کیوں' سے شروع ہونے والے سوالات کا جواب نہیں دے سکتی بلکہ لفظ کیوں اس کی لغت سے ہی خارج ہے۔

سائنس آج بھی جن سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی ان میں سے چند یہ ہیں۔

کائنات عدم سے خود بخود کیسے ظاہر ہوئی؟ کائنات کیوں بنی؟

بگ بینگ سے پہلے کیا تھا؟کائنات میں ہر جگہ ایک نظم کیسے ہے؟اور کیوں ہے؟

زمین کے ہر گوشے میں پیدا ہونے والی زندگی اپنے گروپ میں یکساں اور آفاقی جبلّت کیوں رکھتی ہے؟

بے پایاں علوم بھی کیا بگ بینگ سے قبل موجود تھے؟ان کا منبع کیا ہے؟

زندگی کیا ہے اور کیوں ہے؟شعور کیا ہے اور کیوں ہے؟

اچھے برے خیالات کا اجراء کہاں سے اور کیوں ہوتا ہے؟وغیرہ وغیرہ

جدید علوم خدا کا متبادل پیش کرنے میں کھلے ناکام ہیں اسی لیے ہر اسکالر، فلاسفر اور ہر دہریہ کسی بھی مباحثے میں مذکورہ بالا سوالات کے جوابات سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتا ملے گا، جس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس اپنی محدودیت کی وجہ سے انسان کی صرف خادم بن سکتی ہے رہنما نہیں۔

ان گزارشات سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ خدا کے ناقد عقلی، منطقی اور سائنسی طور پر کسی حد تک یہ جان چکے ہوں گے کہ موجودہ فزیکل پیرایوں میں یہ سوال کہ خدا کو کس نے بنایا، غیر متعلّق Irrelevant ہو جاتا ہے۔اس کے بجائے جو سوالات ابھرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:

انسان کیوں ہے؟کیسے بنا؟کس نے بنایا؟

ذرا سوچیے!

(خدائی سرگوشیاں سے ماخوذ)

عہد الست کیا ہے اور انسان اسکا مکلف کیوں ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عہد الست کو گویا بطور ''انسان سے بیرونی کسی خبر'' کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مثلا جیسے کسی تاریخ کی کتاب سے پڑھ کر مجھے پتہ چلا کہ 1947ء میں پاکستان بننے کا واقعہ ہوا۔ تو اب اگر مجھ تک تاریخ کی وہ کتاب نہ پہنچی یا میں اس کتاب کو معتبر نہ مانوں جس میں یہ لکھا ہے تو اب یہ واقعہ ''میرے لیے'' کوئی واقعہ نہیں یا میں اسے ماننے کا مکلف نہیں۔ چنانچہ جو شخص قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتا تو آخر وہ عہد الست کو کیونکر مانے گا؟ اور اگر ایسا کوئی عہد ہوا بھی تو وہ اب کسی کو یاد تھوڑی ہے، وہ تو یادداشت کی گرفت میں ہی نہیں رہا۔

• عہد الست'' کے بارے میں مذہب کا مقدمہ سمجھنے کے لیے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ''عہد الست'' ہر نفس کا یہ اقرار تھا کہ ''اللہ میرا رب ہے'' اور یہ اقرار ہر نفس میں'' بائے ڈیفالٹ'' فکس کر کے اسے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی یادداشت کے لیے'' قابل گرفت نہ ہونے'' کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں کہ ایک وجود

اپنے سے خارج کسی بات کو یاد کر کے معلوم کر لے، بلکہ یہ تو عین انسانی وجود (" being) جس حال میں وہ تخلیق کیا گیا اور موجود ہے" کا بیان ہے۔ یعنی یہ بات کہ "میں کسی کی مخلوق ہوں"، یہ انسان کا "دائمی حال" ہے، نہ کہ اس سے باہر کوئی واقعہ۔ چنانچہ "یاد کرنے کا سوال" تو اس چیز پر ہوتا ہے جو محو یا عدم وجود کا شکار ہو سکے، یہ تو ہمہ وقت طاری حال ہے۔ قرآن میں "عہد الست" کا ذکر انسانی نفس کے اس حال کا بیان ہے، یعنی انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ جو تمھارے قلب میں اپنے کسی خالق کے تصور و اقرار کا ازلی دیا جل رہا ہے تو یہ یونہی کہیں سے نہیں آ گیا بلکہ یہ تمہاری ارواح کا کیا ہوا اقرار ہے۔

مذہب کہتا ہے کہ یہ "عہد الست" کی بازگشت ہے جسے کھرچ سکنا کسی صورت ممکن نہیں، کیونکہ یہ تو "تمھارا حال" ہے، اس بارے میں انسان زیادہ سے زیادہ بس یہ کر سکتا ہے کہ وہ کسی جہالت کی وجہ سے اپنے اس حال کا انکار کر دے اور یا پھر سرکشی کی راہ اختیار کر کے جھوٹ بولے۔ اس کا متبادل جواب وہ ہے جو سوشل سائنسز کے بعض ماہرین دیتے ہیں جن کے مطابق بعض مظاہر قدرت کے سامنے اپنی بے بسی کی وجہ سے انسان نے اپنے سے زیادہ طاقتور قوتوں کو ڈر کے مارے خدا مان لیا تھا کہ ان کی منت سماجت کرنے سے شاید وہ ان کے برے اثرات سے بچ سکے وغیرہ۔ مذہب بتاتا ہے کہ ایسی چیزوں کو خدا وغیرہ بنا لیا جانا، یہ بعض انسانوں کی جہالت و سرکشی کا نتیجہ تھا جس کے سبب انھوں نے خالق کے تصور کو بگاڑ دیا تھا، اسی بدیہی تصور کی درست تفصیلات بتانے کے لیے انبیاء بھیجے گئے۔

ہر انسان کے قلب میں جو خدا کی ذات کا شعور پیوست ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ قدیم انسان جب کائنات کو سمجھنے سے عاجز آ گیا تو اس نے خدا کا تصور گڑھ لیا، بلکہ اسکی وجہ ہر انسان کی روح کا خدا کے حضور کیا گیا وہ اقرار ہے کہ "الست بربکم قالوا بلی"۔ "کیا خدا ہے؟" یہ سوال دھریہ بھی اٹھاتا ہے اور یہ سوال اٹھانا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کا وجود شعور میں پیوست ہے. ملحد بس یہ کرتا ہے کہ اس تصور کی الٹی سیدھی توجیہہ کر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوشل سائنسز کے ان ماہرین کا یہ تجزیہ دور از کار تاویلات پر مبنی ہے اور یہ جہالت و سرکشی ہی کی ایک صورت ہے۔

تاریخ میں گزری ہوئی ہر تہذیب کے بسنے والے انسانوں نے یہ گواہی دی ہے کہ ''خدا ہے''، ایسی کسی انسانی تہذیب کا سراغ نہیں ملتا جس میں خالق (یعنی انسانی ذات کے مخلوق ہونے) کا تصور نہ رہا ہو۔ دنیا میں پیدا ہونے والا ہر انسان، چاہے وہ منکر خدا ہی کیوں نہ ہو، اس سوال کا شعور رکھتا ہے کہ آیا ''میرا کوئی خالق ہے؟'' تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر طویل تاریخ اور اس قدر وسیع و عریض کرہ ارض پر پھیلے ہوئے ہر دور کے انسانوں کے یہاں اس قدر تسلسل کے ساتھ خالق کا یہ تصور کہاں سے آ گیا؟

یہ اقرار کہ ''میرا ایک رب ہے''، یہ قلب انسانی میں جلتی ہوئی عہد الست کی بازگشت ہے۔ رہی یہ بات کہ ''وہ خالق کون اور کیسا ہے (یعنی اس کا تعارف کیا ہے)، وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے (یعنی میرا اس کے ساتھ تعلق کیسا ہونا چاہئے) وغیرہ'' تو اس کے لئے انبیاء کو مبعوث کیا گیا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ''خدا وہ جو رسول کی خبر کے مطابق ہو، جسے میں نے اپنے ذھن سے تراش لیا ضروری نہیں وہ خدا ہو''

عہدِ الست کے بعد رسولوں کی ضرورت؟

مختصراً چند نکات پیشِ خدمت ہیں:

1۔ عہدِ الست کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کے باب میں کوئی عذر بروزِ قیامت قبول نہیں ہو گا۔

2۔ اس عہد کی یاددہانی کے لیے مزید اہتمام کے طور پر اور نیز دنیوی زندگی میں اس عہد کے عملی تقاضے پورے کرنے کے لیے تفصیلی رہنمائی کے لیے رسولوں کی بعثت ہوتی ہے۔ (جن اہلِ علم نے اس سیاق تذکیر کو رسول کی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے ان کا مطلب مقصدِ بعثت کو تذکیر تک محدود رکھنا نہیں تھا۔)

3۔ جن لوگوں تک رسول کی دعوت پہنچی ان کی ذمہ داری مزید بڑھ گئی اور ان کے محاسبے میں مزید سوالات کا اضافہ بھی ہوا۔ البتہ جن تک رسول کی دعوت نہیں پہنچی ان کا محاسبہ بنیادی سوال تک ہی محدود رہے گا۔ اس بحث کو ایک خاص پہلو سے فقہاے کرام یوں ذکر کرتے ہیں کہ کیا کفار شرائع کے مخاطب ہیں یا نہیں؟

4۔ جو لوگ اللہ کی توحید کے قائل ہیں لیکن اس عقیدے کی تفصیلات یا مقتضیات میں ان سے غلطی ہوئی ہو تو ان کی غلطی کے اسباب اور اس غلطی سے نکلنے کے مواقع کے جائزے اور ان کو صفائی کا موقع دے چکنے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے عدل اور رحمت کے تقاضوں کے مطابق ایسا فیصلہ کرے گا جس کے بارے میں ہر کوئی کہہ اٹھے گا کہ یہی قضاء بالقسط اور قضاء بالحق ہے۔ تاہم جنھوں نے عہدِ الست کے باوجود شرک کو بطور دین قبول کیا، یا سرے سے اللہ کے وجود کے منکر ہو گئے، تو ان کے متعلق اللہ پہلے ہی اعلان کر چکا ہے کہ عہدِ الست سے غفلت کے متعلق ان کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔

5۔ بہ الفاظِ دیگر، توحید کے اقرار کے بعد شرک بالتاویل کے باب میں تو عذر پیش کیے جانے کا امکان ہے لیکن شرک بطور عقیدہ قبول کرنے، یا اللہ کے وجود سے یکسر انکار کرنے، کے بعد اسی حالت میں مرنے پر کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ مشرکانہ معاشرے میں، یہاں تک کہ عرب جاہلیت میں بھی، ایسے کئی لوگ تھے جنھوں نے شرک چھوڑ کر توحید کا عقیدہ اپنا لیا تھا لیکن تفصیلات کا علم نہ ہونے کی وجہ سے سرگرداں رہتے تھے۔

• جن صاحب نے اس بحث کو شروع کیا ہے، ان سے یہ سوال بھی پوچھنا چاہیے کہ اعمال کے حسن و قبح کے بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے؟ غامدی صاحب تو متعدد آیات سے یہی استدلال کرتے رہے ہیں کہ انسان بوجہ اللہ تعالی کے انسانی نفس پر الہام ان سے پوری طرح واقف ہے اور اس معاملے میں، ماسواء چند امور، کوئی ابہام موجود نہیں ہے، (اور انھی چند کی وضاحت کے لیے وحی آتی ہے)، یعنی اس معاملے میں انسان کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔ مثلاً عمار خان ناصر صاحب کی حالیہ پوسٹ میں ''قتل'' والی مثال ہی کو لے کر اگر ابو یحی صاحب سے یہ سوال کیا جائے کہ ''میں نے قتل

کے فی نفسہ ۔ برا ہونے پر کافی کتابیں پڑھی ہیں مگر میں اس کی اخلاقی قباحت پر مطمئن نہیں ہو سکا، تو میرے لیے کسی کو قتل کرنے کا کیا حکم ہے وغیرہ؟'' تو پھر دیکھتے ہیں یہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں ان کا جواب غالبا غامدی صاحب کے نظریے کے مطابق ہی ہو گا، تو کیا کسی کو قتل کرنے کی برائی اللہ تعالی کے وجود سے زیادہ واضح حقیقت ہے؟ اگر تقوی و فجور والا الہام انسان پر حجت ہے تو ''عہد الست'' والا کیوں نہیں؟ بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ عہد الست سے تو بس ایک احساس ہی پیدا ہوتا ہے، یہ کوئی قطعی حجت تھوڑی ہے۔ تو یہی بات اگر ''اخلاقی معاملات والے الہام'' کے بارے میں کہہ دی جائے تو کیسا رہے گا کہ ''وہ تو بس ایک مبہم سا احساس ہے، وہ انسان کے لیے کوئی قابل اتباع حجت تھوڑی ہے''، اس کے بعد پھر آپ کا'' نظریہ اخلاق و فطرت'' کہاں کھڑا ہو گا؟

ڈاکٹر زاہد مغل، ڈاکٹر مشتاق

جب خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے تو انہیں جہنم میں کیوں کر ڈالے گا؟

نوٹ: ستر ماوں سے زیادہ محبت والی بات ثابت نہیں ہے۔

ایک سوال آج کل ملحدوں میں بڑا رائج ہے کہ جب خدا اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے تو تو انہیں جہنم میں کیوں کر ڈالے گا؟ وہ بھی ہمیشہ کی جہنم۔

جواب: سب سے پہلے تو اس نکتے کو اچھی طرح دل و دماغ میں بٹھا لیں کہ اس دنیا میں جیسی بھی زندگی آپ کو ملی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ آپ بادشاہ ہوں یا فقیر۔ صاحب اولاد ہو یا بے اولاد۔ صحت مند ہوں یا معذور۔ یہ فیصلہ اللہ کرتا ہے اور انسان اس فیصلے کو صرف قبول کرتا ہے۔ مگر اس کے بعد آنے والی زندگی میں کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں۔ یہ فیصلہ اللہ نہیں کرتا بلکہ انسان خود کرتا ہے۔ اپنے عمل کے ذریعے۔ اللہ صرف انسان کے کیئے گئے اس فیصلے کو قبول کرتا ہے اور اس پہ عمل درآمد کرواتا ہے۔ اب اس کو سمجھتے ہیں۔

اس موضوع کو ہمیں انسانیت کے آغاز سے سمجھنا پڑے گا۔ قران میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو وہ سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر بن گیا ﴿۳۴﴾ اور ہم نے کہا کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور جہاں سے چاہو بے روک ٹوک کھاؤ (پیو) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں (داخل) ہو جاؤ گے ﴿۳۵﴾ پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس میں تھے، اس سے ان کو نکلوا دیا۔ تب ہم نے حکم دیا کہ (بہشت بریں سے) چلے جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے ﴿۳۶﴾ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے (اور معافی مانگی) تو اس نے ان کا قصور معاف کر دیا بے شک وہ معاف کرنے والا (اور) صاحبِ رحم ہے ﴿۳۷﴾ (سورہ البقرہ 34 سے 37)

اب یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں۔

ابلیس کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اس نے نہیں کیا۔ یہ اللہ کی حکم عدولی تھی۔ آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ایک درخت کا پھل نہیں کھانا۔ انہوں نے کھالیا۔ یہ بھی حکم عدولی تھی۔ فرق کیا تھا؟ صرف توبہ اور تکبر کا۔

ایک نے تسلیم کیا کہ غلطی میری ہے اور پھر اپنی غلطی کی معافی مانگ لی۔ توبہ کر لی۔ دوسرے نے کہا غلطی میری نہیں خدا کی ہے۔ اگر خدا نہ چاہتا تو میں یہ غلطی نہ کرتا۔ یعنی بجائے اس کے کہ اپنی غلطی تسلیم کرتا۔ الٹا الزام خدا پر ڈال دیا۔ اسے کہتے ہیں تکبر۔ یہ وہی عمل ہے جو ملحدین میں پایا جاتا ہے۔

اس دن سے لے کر آج تک انسان کی اور شیطان کی ایک جنگ جاری ہے۔ شیطان انسان کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس میں قصور وار تم نہیں بلکہ خدا خود ہے۔ اگر وہ نہ چاہتا تو تم گناہ گار نہ ہوتے۔ مگر اللہ کے مومن بندے اس کے اس جال میں نہیں پھنستے اور توبہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ

عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے آدم کے بیٹے جب تک تم مجھ سے دعا کرتے رہو گے اور مجھ سے امیدیں وابستہ رکھو گے میں تم کو معاف کرتا رہوں گا جو گناہ بھی تم نے کئے ہوں گے اور مجھے کچھ پرواہ نہیں (تم نے کتنے گناہ کئے)۔ اے آدم کے بیٹے، اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں پھر تم مجھ سے معافی طلب کرو تو میں تمہیں معاف کردوں گا اور مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ اے آدم کے بیٹے، اگر تم زمین کے برابر گناہوں کے ساتھ مجھ سے ملاقات کرو لیکن جب تیری مجھ سے ملاقات ہو تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو تو میں تیرے پاس ان گناہوں کے برابر بخشش کے ساتھ آؤں گا۔ (ترمذی)

پچھلی قرآنی آیت اور اس حدیث میں یہ بات واضح کی جارہی ہے کہ جہنم میں جانے والوں کا اصل جرم گناہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس گناہ پر ڈھٹائی اختیار کرلینا ہے۔

اسی طرح جنتیوں کی اصل خصوصیت یہ نہیں کہ وہ گناہ نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی اصل خصوصیت گناہ کے بعد توبہ کرلینا ہے۔ اب اس میں جنت کا حصول کتنا آسان ہے۔ انسان خطاکار ہے یہ بات اس کے خالق سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے ؟اسی لئے پکڑ خطاؤں کے بجائے اس ڈھٹائی پر رکھی گئی ہے جو ان گناہوں کے بعد اختیار کی جارہی ہے۔ پھر مزید یہ کہ ہر گناہ کی معافی رکھی گئی ہے سوائے دو گناہوں کے۔

ایک کفر دوسرا شرک۔ کفر کیا ہے ؟خدا کو ماننے سے انکار کردینا کفر کے زمرے میں آتا ہے۔ پہلے تو اس بات کو سمجھ لیں کہ کیا خدا کا انکار خدا کے وجود کا بھی انکار ہے ؟جی نہیں۔ خدا کے وجود کا انکار کرنا انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ شائد ملحد وہ مخلوق ہے جو خدا کے وجود کا انکار کرتی ہے تو یقین جانیئے ایسا نہیں ہے۔ یہ صرف ایک دھوکہ ہے جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ ملحد کا خدا کو نہ ماننا بس ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ سے کار کی فرمائش کرے اور پوری نہ ہونے کی صورت میں کہہ دے کہ تُو تو میرا باپ ہی نہیں۔ ملحد خدا کے منکر نہیں ہوتے بلکہ اپنی محرومیوں کی وجہ سے خدا سے نفرت کر بیٹھتے ہیں۔ بالکل شیطان کی طرح۔

جس انسان کو اللہ نے عقل دے کر اس دنیا میں بھیجا وہ ازل سے گواہ ہے کہ یہ پوری کائنات کسی خدا کی کاریگری کے بغیر بننا ممکن ہی نہیں۔ اور قیامت تک اس بات پر گواہ رہے گا۔ ازل سے لے کر قیامت تک اس کی زندگی میں کوئی ایسا دن نہیں آنے والا جس دن اس کے پاس ایسی کوئی دلیل آجائے جو ثابت کرے کہ خدا نہیں ہے۔ جس خدا کی تسبیحات بے جان چیزیں تک کرتی ہوں ان کا انکار صاحبِ عقل انسان کیسے کر سکتا ہے ؟ عقل رکھتے ہوئے خدا کے وجود کا انکار ناممکنات میں سے ہے۔ وقتی طور پر کوئی بغیر سوچے سمجھے کسی کی باتوں میں آکر بھٹک ضرور سکتا ہے۔ مگر جب اس کو تھوڑا وقت ملے گا سوچنے کا تو وہ واپس خدا ہی کی طرف لوٹے گا اور ان کو اس کا موقع خدا کی طرف سے ہی دیا جاتا ہے۔

زیادہ تعداد ان ملحدوں کی ہوتی ہے جو جانتے بوجھتے شیطان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ میرا کئی ملحدوں سے خدا کی ذات کے موضوع پر مکالمہ ہو چکا ہے۔ مگر آج تک کوئی ایک بھی ایسا نہیں ملا جس نے شکست کھانے کے بعد خدا کو مان لیا ہو۔ دلیل میں شکست کھا جانے کے باوجود یہ بھاگنا تو پسند کر لیتے ہیں مگر مانتے نہیں۔ یہ رویہ ہی اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ معاملہ عقل کا نہیں ڈھٹائی ہے۔ زیادہ تر ملحد خدا کا انکار کسی آزمائش میں فیل ہو جانے کی وجہ سے کرتے ہیں۔۔۔ نظامی کا دس سالہ بچہ مر گیا تو وہ ملحد ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ جس خدا کو وہ کل تک مانتا تھا اس کو آج اچانک ماننا کس دلیل پر چھوڑا؟ بیٹے کے مرنے پر ؟ تو کیا بحیثیت مسلمان یہ معلوم نہیں تھا کہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ابراہیم بھی کم عمری میں وفات پا گیا تھا؟ اللہ نبیوں کو آزما سکتا ہے تو عام بندے کو کیوں نہیں ؟

یعنی یہ بحث خدا کے وجود اور عدم وجود کی نہیں ہے بلکہ بدلے کی ہے۔

ایک ابلیس تھا جس نے عہد کیا تھا کہ ایک آزمائش میں مبتلا کر کے مجھے بھٹکنے کا جواز مہیا کیا گیا۔ لہٰذا میں ہر شخص کی آزمائش کو مشکل سے مشکل ترین بناتا چلا جاؤں گا۔۔۔ نظامی کا عمل بھی وہی تھا۔ انہوں نے بھی اللہ کی طرف سے عائد کردہ آزمائش کو اللہ کا ظلم سمجھا اور عہد کیا کہ اب وہ بھی باقیوں کو بھٹکائیں گے۔ یعنی ہم ڈوبے تو سب کو ڈبو دیں گے۔

اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ظلم انسان خود کرتا ہے اپنے آپ پر۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ۔ اور اس درخت کے پاس مت جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ اس آیت میں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے سے مراد اپنے آپ پر ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ اللہ کا ہر ہر حکم انسان کی ذاتی, معاشرتی اور دینی زندگی کے فائدے کے لئے ہوتا ہے اور اللہ کی ہر نافرمانی انسان کی ذاتی, معاشرتی یا دینی زندگی میں بگاڑ ضرور پیدا کرتی ہے چاہے اس بگاڑ کی مقدار بہت معمولی سی ہو۔

کسی شخص کے گناہ کے بعد توبہ کر لینے پر اس کی اخروی سزا کو معاف کر دینا اللہ کی پالیسی میں شامل ہے مگر اس گناہ سے دنیا میں جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اسے بدلنا اللہ کی پالیسی میں شامل نہیں۔ مثلاً اگر کوئی اپنا سر زور سے دیوار پر دے مارے اور زخمی ہو جائے تو یہ گناہ ہے۔ پھر وہ توبہ کر لے تو توبہ بھی قبول ہو جائے گی۔ مگر زخم اپنے وقت پر ہی بھریں گے۔ یعنی توبہ سے اخروی سزا معاف ہو سکتی ہے مگر دنیاوی سزا ساقط نہیں ہوتی۔ کسی شخص سے قتل ہو جائے تو وہ اس پر توبہ کر سکتا ہے۔ اللہ اسے معاف بھی کر سکتا ہے مگر اس کی دنیاوی سزا اسے پھر بھی دی جائے گی۔ کیوں کہ اس عمل میں جو ایک جان ضائع ہو گئی توبہ سے وہ واپس نہیں آ رہی۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس دنیا میں دو طرح کے لوگ بستے ہیں۔ ایک خیر پھیلانے والے اور دوسرے شر پھیلانے والے۔ اللہ جب یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے تو اس سے مراد خیر پھیلانے والے بندے ہوتے ہیں نہ کہ شر پھیلانے والے۔ جن بدبختوں کو اللہ کے وجود کا ہی انکار ہے ان کے نزدیک جہنم کیا چیز ہے؟ اگر خدا کا کوئی وجود ہی نہ ہو تو کونسی جنت اور کونسی جہنم؟ کیا مجھے کوئی سمجھائے گا کہ ملحد لوگوں کو یہ یقین کیوں دلانا چاہتا ہے کہ خدا نہیں ہے؟ اسے کون سی جنت ملنی ہے اس تبلیغ سے؟ جان جوکھم میں ڈال کر لوگوں کو یہ سمجھانا کہ خدا اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا تو انہیں جہنم میں کیوں ڈالتا؟ اگر خدا کا وجود ہی نہ ہو تو ڈر کس بات کا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ منصف ہے۔ اتنی زیادہ آسانیوں اور سہولتوں کے باوجود کوئی محض دنیاداری کی بناء پر شرک یا کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے تو ظالم وہ خود ہے۔ اپنے جہنم میں جانے کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ چند روزہ یہ زندگی محض کچھ محرومیوں یا آزمائشوں کی بناء پر برباد نہ کریں۔ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کریں اور جس سے محروم رکھا اس پر صبر کریں۔ یہی جنت میں جانے کا راستہ ہے۔

تحریر محمد سلیم

زلزلہ ٹیکٹانک پلیٹوں کی میکانکی حرکت کا مظہر ہے یا خدا کے غضب کا؟

سوال: یہ مذہبی ذہن کی ایک بہت بڑی الجھن ہے اور جدت پسندوں کی طرف سے اسے زیادہ تر طعنہ بھی اسی امر کا ملتا ہے کہ مظاہر فطرت کو بدستور الوہی تقدیس کا جامہ بھی اوڑھائے رکھنا چاہتا ہے اور انہیں دنیاوی، میکانکی امور کے طور deal کرنے سے جو فوائد ممکن ہیں، اس سے بھرپور استفادہ بھی چاہتا ہے۔ سوال ابھرتا ہے کہ کیا اہل مذہب کے لئے مظاہر فطرت میں تفکر کی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو مظاہر فطرت کو بدستور خدا کی نشانیوں کے طور پر دیکھنے اور اس زاویہ نگاہ کے اخلاقی مقاصد کو باقی رکھنے میں بھی معاون ہو، ساتھ ہی انہیں ایک میکانکی امر کے طور پر دیکھنے، ان کی ماہیت و نوعیت کی تفہیم اور انہیں انسانی تصرف میں لانے کی کوششوں کو بھی نہ صرف درست سمجھے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرے؟ اگر میں زلزلے کو بیک وقت قہر خداوندی کا مظہر بھی سمجھتا ہوں اور ٹیکٹانک پلیٹوں کے میکانزم پر یقین بھی رکھتا ہوں تو ان دونوں تصورات کے مابین تطبیق کیونکر ممکن ہے؟

جواب:

زلزلہ آتے ہی ''مذہبی'' و ''سائنسی'' نکتہ نظر رکھنے والے احباب کے مابین ہونے والی بحث ہمیشہ کی طرح ''کیوں'' اور ''کیسے'' کے خلط مبحث کا شکار ہوتی ہے۔

''زلزلہ کیوں آتا ہے''اور زلزلہ کیسے آتا ہے'' دو الگ سوالات ہیں۔ اول الذکر کا تعلق اس واقعے کی ''مقصدیت'' (انسان کے ساتھ اسکے تعلق) جبکہ مؤخر الذکر کا ''پراسس'' سے ہے۔ چنانچہ جب اہل مذہب کہتے ہیں کہ ''یہ زلزلے انسانوں کو خدا کی طرف سے تنبیہہ ہیں'' تو اسکی مقصدیت بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسکے مقابلے میں اہل سائنس کی طرف سے یہ کہا جانا کہ زلزلے زیر زمین تہوں میں ہلچل کی وجہ سے آتے ہیں تو درحقیقت یہ اسکی مقصدیت نہیں بلکہ پراسس کا بیان ہے۔ اپنی ماھیت میں یہ دعوی اسی نوعیت کا ہے جس نوعیت کا یہ دعوی کہ زلزلہ گائے کا سینگ بدلنے کی وجہ سے آتا ہے (کہ دونوں ہی ''کیسے'' کا بیان ہے)۔ مقصدیت اس سوال میں پنہاں ہے کہ ''زیر زمین یہ تہیں (یا گائے اپنا سینگ) کیوں بدلتی ہے؟ مقصدیت سے متعلق یہ سوال ایک مابعد الطعبیاتی سوال ہے۔ چنانچہ اس بحث میں عام طور پر جنہیں اھل سائنس کہا جاتا ہے انکا نکتہ نظر ''خود بخود ہو جانے'' کا ہے، گویا اسکا انسانی عمل سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اھل مذھب و اھل سائنس کے مابین اصل نزاع اسکے پراسس کے حوالے سے نہیں کیونکہ اھل مذھب کو سلسلہ اسباب سے انکار نہیں بلکہ اس مابعد الطبعیاتی نکتہ ھائے نگاہ سے ہے جسکی رو سے اھل سائنس کائنات و مافیہا میں معنویت یا مقصدیت دیکھتے ہیں۔

پس خوب سمجھ رکھنا چاھئے کہ زلزلہ زیر زمین تہیں ھلنے کی بنا پر آتا ہے یہ اس سوال کا جواب نہیں کہ یہ کیوں آتا ہے۔ !! کیوں کے سوال کو دونوں گروہ اپنی مخصوص مابعد الطبیعات سے حل کرتے ہیں نہ کہ مشاھدے میں آنے والے کسی طبعیاتی قانون سے۔ ایک مسلمان کے لئے سانسوں کا چلتا ہوا سلسلہ بھی خدا کے فضل کی علامت ہے جبکہ اھل سائنس کے لئے گیسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ۔ لیکن ظاہر ہے یہ سائنسی بیان کسی بھی طرح میری زندگی کے قیام و بقا کی توجیہہ نہیں۔!!

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو کسی بھی فطری مظہر کے ایک میکانکی امر اور ایک الوہی امر ہونے میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ البتہ ایک الوہی امر کی حیثیت سے ہم انہیں causation اور prediction کے عمل میں استعمال نہیں کر

سکتے، الوہی امر کی حیثیت سے ان کا اصل function یاد دہانی ہے۔ causation اور prediction کا عمل ان کی میکانکی حیثیت سے متعلق ہے۔

''زلزلہ خدائی تنبیہہ ہے'' کے خلاف یہ عجیب استدلال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ جاپان والوں نے تو پکا طرز تعمیر اختیار کر لیا مگر مسلمان اسے خدائی تنبیہہ وغیرہ سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اگر یہ طرز استدلال درست ہے تو پھر یہ صرف زلزلے تک نہیں رکے گا بلکہ بیماریوں (اور اس سے بھی آگے تک) جا پھیلے گا۔ کیا اس اصول کی رو سے اس بات کا انکار کر دیا جائے کہ ناگہانی بیماری بھی انسان کے گناہ صاف کر دینے، انسان کے صبر کا امتحان یا کسی عمل بد کی سزا ہوتی ہے؟ کیا اس اصول کی رو سے یہ مان لیا جائے کہ بیماری سے گلو خلاصی کے لئے دعا کرنا عمل عبث ہے کہ بیماری سے شفاء تو دوا سے ملنی ہے، دعا کا یہاں کیا کام؟ نیز کیا یہ کہا جائے کہ ''دیکھو انگریزوں نے تو دوائیاں بنالیں اور مسلمان دعا میں وقت برباد کرتا رہتا ہے؟''

غور کیجئے کہ کیا مسلمانوں نے اس تصور کے باعث کہ ''ناگہانی بیماریاں درج بالا امور کا اظہار ہوا کرتی ہیں'' علاج کرنا و کروانا چھوڑ دیئے؟ تو آخر زلزلے کے معاملے میں مسلمانوں کو کیونکر یہ سبق پڑھانے کی پرزور کوشش جاری ہے کہ ''بس عمارت پکی کرو، اسکے سواء اس میں کوئی معنی نہیں؟'' یاد رکھئے، کائنات ومافیہا کی توجیہہ کرنے کے ''انداز فکر میں تبدیلی'' کا یہ معاملہ صرف زلزلے تک محدود نہیں، یہ بہت دور تک جاتا ہے، بہت دور تک۔

مشہور عرب عالم شیخ عبدالعزیز بن فوزان لکھتے ہیں ''آج کی اس مادیت نے دراصل ہمارے اس دور کے بہت سے فرزندوں کو بینائی سے محروم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے 'اسباب' و 'مسببات' کے ساتھ ساتھ 'اعمال' و 'آثار' کے مابین تعلق قائم کرنا دشوار ہو رہا ہے۔ آج آپ دیکھتے ہیں کہ ان تباہیوں کے حوالے سے ان لوگوں کے 'تجزیے' اس بات سے آگے نہیں جاتے کہ زمین کا 'چھلکا' کہیں سے 'بودا' ہو گیا تھا! یا یہ کہ زمین کے اندر کہیں کوئی 'رخنہ' یا 'خلا' پیدا ہو گیا تھا! یا یہ 'پلیٹوں' کی حرکت تھی! وغیرہ وغیرہ۔ ان 'اسباب' کا انکار ہم بھی ہرگز نہیں

کرتے۔ واقعتا یہ اسباب ہیں۔ مگر جو چیز جان لی جانا ضروری ہے وہ یہ کہ ان 'مادی اسباب' کے پیچھے دراصل کچھ 'شرعی اسباب' ہوا کرتے ہیں جو انسانی زندگی پر اتنے بڑے پیمانے پر ایک تباہی لے آنے پر منتج ہوتے ہیں۔ یہ مادی اسباب جو یہ لوگ ذکر کرتے ہیں اگر تجربہ ومشاہدہ کی دنیا میں پایۂ ثبوت کو پہنچ بھی لیں تو ان کی حیثیت اس سے زیادہ بہر حال نہیں کہ گناہوں اور عقوبتوں کے مابین جو ایک تعلق پایا جاتا ہے ان 'شرعی اسباب' کے 'شرعی نتائج' ظہور میں آنے کے لئے ان 'مادی اسباب' کو ایک ذریعہ بنا دیا گیا ہو۔ پس جب لوگ اپنے اخلاق کی پستی کو آجانے دیتے ہیں اور اپنی معاشرتی حالت کو بدتری کی جانب بڑھنے دیتے ہیں تو خدا بھی اپنی اس عافیت کو جو اس نے ان پر کر رکھی ہوتی ہے، اٹھ جانے دیتا ہے۔ تب وہ ان کے امن کو خوف سے، ان کی عزت کو ذلت سے، ان کی دولتمندی کو تنگ دستی سے، صحت کو امراض اور وباؤں سے اور سکھ چین کو آفتوں اور مصیبتوں سے بدل جانے دیتا ہے۔" (شیخ عبدالعزیز بن فوزان الفوزان. بحوالہ ایقاظ)

اس سلسلے میں ایک اشکال یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ زلزلہ ہر صورت اور ہر حال میں اللہ کا عذاب ہے تو یہ سکول کے دس سالہ معصوم پر یا نیکوکاروں پر بھی کیوں آجاتے ہیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ کسی عمومی سزا میں انفرادی شناخت معنی نہیں رکھتی۔ جب گناہ اجتماعی ہوتے ہیں تو دنیا میں عذاب بھی اجتماعی آتے ہیں البتہ آخرت میں نیک اور بد کو الگ کر دیا جائے گا۔ بخاری میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک موقع پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے کسی حصے پر آنے والے عمومی عذاب کا ذکر فرمایا تو ام المومنین نے سوال کیا کہ کیا نیک لوگوں کی موجودگی میں ایسا ہوگا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں! جب خباثتوں کی کثرت ہو جائے گی تو ایسا ہی ہوگا۔۔ دوسری بات قدرتی آفات (انفس وآفاق دونوں میں) کو لازمی طور پہ خدا کا قہر سمجھنا محلِ نظر ہے۔ ہر عمل خدا کے اذن سے تو ہو رہا ہے اور سائنس خدا کے عمل کی تفہیم ہی کی کوشش ہے مگر اس دنیا میں حتمی طور پہ یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ کون سا قدرتی عمل لازمی طور پہ خدا کے قہر یا خوشنودی کا غماز ہے۔ ایک ہی عمل ایک کے حق میں سزا تو

دوسرے کے لئے آزمائش تو کسی تیسرے کے لئے باعث رحمت بھی ھو سکتا ھے۔! کنفیوژن تب پیدا ہوتی ہے جب معاملے کو صرف ایک اینگل سے دیکھا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر آج کی تفہیم میں زلزلہ ٹیکٹانک پلیٹوں کی حرکت کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والا ایک میکانکی مظہر ہے تو اہلِ مذہب کو اس سے کوئی الجھن ہے اور نہ ہی یہ ان کا موضوعِ بحث ہے۔ مگر جدید ذہن کی المیاتی کیفیت کہئے کہ اس کا ایمان علت و معلول کے مظاہر سے اوپر اٹھتا ہی نہیں ہے اور یہیں سے مذہب کا مقدمہ شروع ہوتا ہے کہ خالق علت و معلول اور مسبب الاسباب اپنے بھرپور علم وارادے کے ساتھ ہر ذرہء کائنات میں مکمل تصرّف رکھتا ہے۔ان پلیٹوں کا ملنا اور زلزلہ آنا سب امر ربی ھے۔ سائنسی توجیہہ تو صرف سبب اور طریقہ بتاتی ھے جو ایک موجود وقت کی قابل تغیر صداقت ھوتی ھے۔

استفادہ تحریر ڈاکٹر زاہد مغل، عبدالرؤف، عامر منیر

خدا اور شیطان کی بحث

ملحد کا اعتراض

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ قَالَ أَأَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ﴿٦١﴾ قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَـٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُكُمْ جَزَاءً مَّوْفُورًا ﴿٦٣﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُم بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿٦٤﴾

ترجمہ: ''اور یاد کرو جبکہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا اس نے کہا ''کیا میں اُس کو سجدہ کروں جسے تونے مٹی سے بنایا ہے؟'''' کہنے لگا کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تونے مجھ پر فضیلت دی ہے۔ اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے سے شخصوں کے سوا اس کی (تمام) اولاد کی جڑ کاٹتا رہوں گا۔ ''(اللہ نے) فرمایا (یہاں سے) چلا جا۔ جو شخص ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو تم سب کی جزا جہنم ہے (اور وہ) پوری سزا (ہے)۔ اور ان میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے بہکاتا رہ۔ اور ان پر اپنے سواروں اور پیاروں کو چڑھا کر لاتا رہ اور ان کے مال اور اولاد میں شریک ہوتا رہ اور ان سے وعدے کرتا رہ۔ اور شیطان جو وعدے ان سے کرتا ہے سب دھوکا ہے۔

اعتراض: اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ اللہ اپنا سوچا ہوا منصوبہ شیطان کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لہٰذا اس وقت جبکہ ابھی آدم میں روح ہی پھونکی گئی ہے اور دور دور تک ابھی اس کی بیوی موجود ہے نہ یہ کہ اس سے اس آدم کی اولاد بھی پیدا ہو گی، مگر ابلیس یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ آدم کی تمام اولاد کو گمراہ کرتا رہے گا۔ ہے نا کمال کی بات؟ پھر مزے کی بات یہ کہ وہ اللہ کے اس منصوبے کے عین مطابق یہ بھی پہلے سے مانتا تھا کہ تھوڑے سے لوگ ضرور ایسے ہوں گے جن پر اس کا داؤ نہ چل سکے گا۔ شاباش ہے اللہ میاں! کیا خوب انداز سے اپنا منصوبہ پہلے سے ہی شیطان کو ڈکٹیٹ کروا رکھا ہے۔ گویا جہاں صرف آدم ہی آدم ہے، وہاں شیطان کے آدم کی اولاد کو گمراہ کرنے کے اعلان پر اللہ میاں نے بھی اپنی مہر ثبت کر دی اور اسے کھلی عیاشی مارنے کی چھٹی دے دی۔ وہ بھی اس طرح کہ اپنی آواز سے بہکاتا رہ۔ (سعد رضا)

جواب:

اس اعتراض کی حقیقت دو نکات کی حقیقت جان لینے سے واضح ہو سکتی ہے:

1۔ کیا اللہ نے سجدہ کرنے کا کہنے سے پہلے آدمؑ کے متعلق تفصیل نہیں بتائی تھی؟

2۔ تقدیر اور آزمائش کی بحث

کیا اللہ نے سجدہ کرنے کا کہنے سے پہلے آدمؑ کے متعلق تفصیل نہیں بتائی تھی؟

ابلیس نے آدمؑ کی اولاد کی گمراہی کا جو دعویٰ کیا ہے یہ بغیر کسی بنیاد کے نہیں کیا بلکہ قرآن کریم میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ پاک نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے لگا ہوں اور انسان کی پیدائش کا یہ تذکرہ آدمؑ کا پتلا بنانے سے بھی پہلے کیا، ابلیس کو یہ علم تھا کہ اللہ پاک اپنا خلیفہ بنا رہا ہے اور زمین پر انسان کو آباد کرے گا، اس کی بعد کی گفتگو اسی بنیاد پر تھی۔

اسی طرح اسے یہ بھی بخوبی علم تھا کہ ہر انسان پر اس کا داؤ نہیں چل سکے گا کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ جس کو اللہ براہِ راست اپنے علم سے علم عطا کرے گا وہ میرے قابو میں نہیں آسکتا، کیونکہ وہ فرشتوں کی اطاعت بھی دیکھ چکا تھا، مزید یہ کہ خود قرآن مجید میں باری تعالیٰ نے اسے کہا کہ میرے بندوں پر تیرا زور نہیں چل سکتا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جنت جہنم کا وجود ہے، اور اس میں جہاں نافرمان لوگ جہنم میں جائیں گے تو جنت میں بھی جانے والے کچھ لوگ ہونگے۔ اس ساری معلومات کے بعد عقلاً یہ بات کوئی محال نہیں کہ ابلیس آدمؑ کی اولاد کو گمراہ کرنے کا دعویٰ پہلے سے کر رہا ہے اور پھر اسی دعویٰ میں وہ بعض کو منہا بھی کر رہا ہے۔

2۔ تقدیر اور آزمائش کی بحث:

بیان کئے گئے اعتراضات کا تعلق تقدیر سے ہے، اصل اعتراضات سے قبل تمہیدی طور پر یہ جاننا ضروری ہے کہ دو مختلف چیزیں ہیں ان میں فرق ضروری ہے:

۱) ایک اللہ تعالیٰ کا علم ہے ۲) دوسرا اللہ تعالیٰ کی مشیت/رضا ہے

ان دونوں میں فرق ہے، باری تعالیٰ کا علم ازل سے لے کر ابد تک کے ہر ہر لحظہ کو شامل ہے، چاہے وہ علم دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے اچھے حالات سے متعلق ہو یا برے حالات سے متعلق ہو، خیر سے متعلق ہو یا شر سے متعلق ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی چاہت مشیت/رضا ہمیشہ خیر میں ہے شر میں نہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک ہے صفتِ تخلیق اور دوسرا ہے منشأ تخلیق، اللہ تعالیٰ خالقِ مطلق ہے، وہ اپنے خالق ہونے کی صفت کے لحاظ سے ہر چیز کو پیدا کرتا ہے لیکن ہر چیز کو پیدا کرنے کے پیچھے اس کی منشأ کیا ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے، وہ خیر کو پیدا کرتا ہے، تاکہ لوگ اس خیر کو اپنائیں، وہ شر کو پیدا کرتا ہے تاکہ لوگ شر سے بچ کر اس کی وفاداری کا ثبوت دیں۔ باری تعالیٰ نے خیر کو بنایا لیکن مسلط کسی پر نہیں کیا، اسی طرح شر کو بنایا لیکن مسلط کسی پر نہیں کیا، بلکہ بندوں کو اختیار دے دیا، خیر کے فوائد بھی بتائیں اور شر کے نقصانات بھی اور اختیار دے دیا کہ جسے چاہو چن لو۔

اس کے ساتھ باری تعالیٰ اپنے علم ازلی کے ذریعے یہ جانتا ہے کہ کون کون اس کی بنائی ہوئی خیر کو اپنائے گا اور کون کون شر کے نرغے میں کر اس کی نافرمانی کرے گا؟ اسی کو لکھ دیا جائے تو اسے تقدیر میں لکھا ہوا کہتے ہیں۔

اب اگر باری تعالیٰ اپنے علم ازلی سے بتادے کہ ایک طبقہ جہنم میں جائے گا تو کیا یہ کہنا عقلاً درست ہے کہ وہ جہنم میں اس لئے گئے کہ وہ مجبورِ محض ہیں؟ بعینہ اسی طرح یہ کہنا بھی عقلاً درست نہیں کہ شر کو پیدا کر کے باری تعالیٰ نے کھلے

عام چھٹی دے دی کہ لوگ شر میں مبتلا ہوں، بلکہ اس نے تو اختیار دیا ہے، اب جو جس کو چاہے چن لے۔ آزمائش جس طرح انسانوں کے لیے ہے شیطان کے لیے بھی تھی

اللہ شر کے خالق تو ہیں فاعل نہیں ہیں۔ اللہ کی پیدا اشیاء کا غلط استعمال انہیں شر بناتا ہے وہ اصلا شر نہیں ہوتیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زبان جیسی نعمت عطا کی، جس سے انسان گفتگو (اچھی یا بری) کر سکتا ہے۔ اگر انسان اسی زبان سے جھوٹ بولے، فحش کلامی یا غیبت کرے، کسی پر تہمت لگائے تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ان کی نسبت اللہ کی طرف ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ زبان کے خالق ہیں اور اللہ نے ہمیں سچ اور جھوٹ دونوں کا اختیار دیا تھا۔ لیکن اس اختیار کا غلط استعمال انسان نے کیا، یہ انسان کا فعل ہے اور ورغلانے والا شیطان ہے، اس اعتبار سے جھوٹ اور غیبت وغیرہ کی نسبت انسان یا شیطان کی طرف ہونی چاہئے۔

قرآن کا پیش کردہ تصور بھی یہی ہے کہ خدا نے انسان کو ایک محدود نوعیت کی آزادی و خود مختاری دے کر اس دنیا میں امتحان کے لئے پیدا کیا ہے اور شیطان کو خود اس کے مطالبے پر آزادی عطا کی ہے کہ وہ اس امتحان میں انسان کو ناکام کرنے کیلئے جو کوشش کرنا چاہے کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ صرف ترغیب و تحریص کی حد تک ہو، زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جانے کے اختیارات اسے نہیں دیئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالی نے خود بھی انسان کو جبراً راہ راست پر چلانے سے احتراز فرمایا ہے اور صرف اس بات پر اکتفا فرمائی ہے کہ انسان کے سامنے انبیاء اور کتابوں کے ذریعہ سے راہ راست کو پوری طرح واضح کر دیا جائے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے آدمی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو خدا کی پیش کردہ راہ کو اپنے لیئے چن لے اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرے اور چاہے تو شیطان کی ترغیبات قبول کر لے اور اس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنے پر آمادہ ہو جائے جو شیطان اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان دونوں راہوں میں سے جس کو بھی انسان اپنے لیئے انتخاب کرتا ہے اللہ تعالی اسی پر چلنے کے مواقع اسے دیتا ہے کیونکہ اس کے بغیر امتحان کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ اب کیا آپ چاہتے ہیں کہ خدا اس کے مقابلے میں مداخلت کر کے زبردستی انسان کو کامیاب کرائے؟

خدا اور شیطان کا معاملہ - چند بڑے اعتراضات کا جائزہ

اعتراضات: کیا آدم کو سجدہ کرنا شرک نہیں تھا؟ شیطان خدا کو چیلنج کرتا ہے اور اللہ اسے چپ کروانے کے بجائے اس کا چیلنج قبول کرتا ہے؟ تو کیا مخلوق بھی خدا کو چیلنج کر سکتی ہے؟ شیطان کو قربانی کا بکرا بنایا گیا حالانکہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔ شیطان کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اہل مذہب کو پتا ہے کہ دنیا میں اچھائی بھی ہے اور برائی بھی، تو اچھائی کو تو خدا کے ساتھ جوڑتے ہیں اور برائی کے لیے کسی ایسے کریکٹر کی ضرورت ہے جو کہ اس کو اپنی طرف منسوب کرے۔ جب ہر اچھی یا بری چیز کا خالق اللہ ہے تو برائی ہونے کے بعد شیطان اور نفس کی طرف کیوں منسوب کی جاتی ہے؟

☆ کیا آدم کو سجدہ کرنا شرک نہیں تھا؟

سب سے پہلے تو اس بات کو سمجھ لیں کہ مسلمانوں میں گناہ و ثواب کا تصور کیا ہے۔ عمومی طور پر مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ جو بات انسان کی اپنی خود ساختہ اخلاقیات پہ پوری اترے وہ ثواب ہوتی ہے اور جو نہ پوری اترے وہ گناہ۔ حالانکہ اس بات کا کوئی سر پیر ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ملحدوں کو اس بات پر اعتراض ہوتا ہے کہ آدم ع کے بیٹے

اور بیٹیوں نے آپس میں شادی کی جو غیر اخلاقی حرکت ہے۔ سبحان اللہ۔ دین سے اخلاقیات کا درس سیکھ کر دین پہ ہی اعتراض ؟ دنیا سے سارے مذاہب نکال دیجئے پھر اس بات کا کوئی اخلاقی جواز بچے گا کہ بہن اور بھائی باہمی رضامندی سے آپس میں شادی نہیں کر سکتے ؟ یہ اخلاقیات تو سکھائی ہی دین نے ہے۔

دینِ اسلام میں گناہ و ثواب کا پیمانہ صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ جس بات سے اللہ روک دے وہ گناہ اور جس کام کے کرنے کا حکم دے وہ ثواب۔ یعنی جب آدمؑ کو اپنے بچوں کی آپس میں شادی کروانے کا حکم دیا گیا اس وقت یہ کارِ ثواب تھا اور جب اسی کام سے روک دیا تو یہی کام حرام ہو گیا۔ یہ ہے وہ نکتہ جسے نہ شیطان ہی سمجھ پایا نہ ملحد۔ جس وقت اللہ کا حکم آیا کہ آدم کو سجدہ کرو اس وقت اس کا شرک ہونا تو درکنار اس سے زیادہ ثواب کا کام کوئی نہ تھا۔ اگر اللہ مومن کو حکم دے کہ بتوں کو سجدہ کرو تو آج جو مومن بت کو سجدہ نہ کرتا وہ کافر ہوتا۔ یہ اخلاقیات ہم طے نہیں کرتے۔ یہ خالق طے کرے گا۔ جس نے دنیا بنائی وہی قانون بنانے کا بھی حق رکھتا ہے۔ جب آپ کسی کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں تو کمپنی کے مالک کے صادر کردہ قوانین کی پاسداری کے وعدے پر ہی آپ کو ملازمت ملتی ہے جس کو قوانین پر اعتراض ہے وہ نہ کرے نوکری۔ دینِ اسلام میں داخلہ کوئی سافٹ ویئر ایگریمنٹ نہیں جو بغیر سوچے سمجھے ایگری پہ کلک کر دیا۔ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد معمولی نوعیت کے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا یہ ایگریمنٹ سوچ سمجھ کر ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔

☆ شیطان خدا کو چیلنج کرتا ہے اور اللہ اسے چپ کروانے کے بجائے اس کا چیلنج قبول کرتا ہے ؟ تو کیا مخلوق بھی خدا کو چیلنج کر سکتی ہے ؟

بالکل کر سکتی ہے۔ آپ نے نہیں کیا کیا ؟ ملحدین نے نہیں کیا کیا ؟ نمرود اور فرعون نے نہیں کیا تھا کیا ؟ اگر بزورِ قوت کسی کو گناہ سے روکنا دنیا بنانے کا مقصد ہوتا تو دنیا بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟ مزید فرشتے ہی نہ پیدا کر دیتا اللہ ؟ جو بغیر

چوں چرا کئے اللہ کے ہر حکم کو بجالاتے ہیں۔ اللہ نے کہا آدم کو سجدہ کرو سارے فرشتے سجدے میں چلے گئے یہ تھا حق۔ اور جو اپنی خود ساختہ اخلاقیات پر ڈٹ گیا نافرمان کہلایا یہ تھا باطل۔

☆ شیطان کو قربانی کا بکرا بنایا گیا حالانکہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔

اس بات کو اپنے گمان سے نکال دیجئے کہ اللہ منصف مزاج نہیں۔ اللہ ہر شخص کو راہِ راست پر آنے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ نتائج کو جانتا ہے جسکی وجہ سے یہ غلط فہمی جنم لیتی ہے کہ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے مگر بات اس سے الٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقدیر میں لکھا وہ جاتا ہے جو ہونا ہوتا ہے۔ اللہ کے پاس علمِ غیب ہے اور اللہ جانتا ہے جو اعمال ہم کرنے والے ہیں لہٰذا وہ انہیں لکھ لیتا ہے۔ اس کو خدا کیوں کر کہئے گا جسے انسان کے عمل کرنے کے بعد پتہ چلے کہ انسان نے یہ عمل کیا ہے؟ آپ کو کیا لگتا ہے آپ کی تقدیر میں ملحد ہونا لکھا تھا اس لئے آپ ملحد ہو گئیں۔ جی نہیں۔ چونکہ آپ نے ملحد ہونا تھا اس لئے آپ کی تقدیر میں ایسا لکھا گیا۔ شیطان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

انسان کی پیدائش پر فرشتوں نے بھی اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا کہ آپ اسے پیدا فرمائیں گے جو زمین میں فساد و خون برپا کرے گا۔ اللہ کا جواب تھا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ کیا فرشتوں کے تحفظات غلط ثابت ہو گئے؟ جی نہیں۔ تو پھر وہ کیا علم تھا جو اللہ کو تھا فرشتوں کو نہیں؟ اس کا ایک جواب تو سیدھا ہے کہ انسان اللہ کی ایک ایسی مخلوق ہے جو اللہ کی عبادت بھی کر سکتی ہے سرکش بھی ہو سکتی ہے اور سب سے بڑی بات علم میں افضل ہے۔ یعنی بغیر کسی مجبوری اور دباؤ کے اللہ کی عبادت کرنے والی مخلوق۔ یہاں یہ بات قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ جنت کا لالچ یا جہنم سے بچنے کا دباؤ ہے۔ آپ پر کیوں نہیں ہے دباؤ جہنم کا؟ آپ کو کیوں نہیں لالچ جنت کا؟ ہر انسان یہاں اپنی مرضی سے جیتا ہے۔ علم و ہدایت موجود ہیں۔ جو چاہے استفادہ کرے جو چاہے جاہل رہے۔ اپنی اپنی مرضی ہے۔

اللہ کا اعلان صاف ہے کہ اگر تمام انسان ہدایت یافتہ ہو جائیں تو اللہ کی بادشاہت میں رتی بھر اضافہ نہیں کر سکتے اور اگر تمام انسان کفر پر مائل ہو جائیں تو اللہ کی بادشاہت میں رتی بھر کمی نہیں کر سکتے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ یہ ہم انسانوں کی ضرورت ہے کہ ہم حق پر رہیں اور حق کو پھیلائیں۔ اللہ کو جس دن یہ کام بزور کرنا ہو گا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سب سجدے میں ہوں گے۔ مگر یہ مقصد نہیں دنیا بنانے کا۔

☆ شیطان کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اہل مذہب کو پتا ہے کہ دنیا میں اچھائی بھی ہے اور برائی بھی، تو اچھائی کو تو خدا کے ساتھ جوڑتے ہیں اور برائی کے لیے کسی ایسے کریکٹر کی ضرورت ہے جو کہ اس کو اپنی طرف منسوب کرے۔

جی نہیں۔ اللہ کو اس بات کی قطعی حاجت نہیں کہ اچھائی اپنے کھاتے میں ڈال لی جائے اور برائی کسی اور کے سر منڈھ دی جائے۔ اللہ کا بڑا واضح موقف ہے کہ یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے جہاں اچھائی اور برائی میں توازن برقرار رکھا گیا ہے، شیطان کو مہلت دینے کی وجہ بھی یہی ہے۔ قرآن میں اللہ یہ بتاتے ہیں کہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے تھے جنہیں ''اللہ'' نے بابل میں اتارا اور وہ ''اللہ کے حکم سے ''لوگوں کو وہ بات سکھاتے تھے جو میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دے۔ مگر وہ نہیں سکھاتے تھے جب تک بتا نہ دیں کہ ''ہم محض آزمائش ہیں تو اس کفر میں نہ پڑ۔'' اس میں کہاں اللہ شیطان کو یا کسی شر کی قوت کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے؟ اللہ تو خود کہہ رہا ہے کہ یہ آزمائشی طریقہ ہے جو اللہ کی طرف سے ہے۔

صرف قابلِ اعتراض یہ ہے کہ کوئی انسان اپنی ارادی قوت سے برائی کرے اور موردِ الزام اللہ کو ٹھہرائے کہ اللہ نے مجھے اس برائی میں مبتلا کیا۔ معاذ اللہ۔ کیا ہدایت کے لئے انبیاء نہ بھیجے گئے؟ کیا کتابیں نازل نہ کی گئیں؟ کیا یہ واضح نہ کر دیا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟ اور جب حق و باطل واضح ہو گیا تو اب الزام اللہ پر مت دو۔ اپنے آپ کو کوسو کہ تم نے اتنی عقل ہی استعمال نہ کی کہ کیا سچ ہے کیا جھوٹ۔ اللہ نے انسان کو آزمانا ہے اس کے لئے اس کے اطراف میں

صرف اچھائیاں پھیلا دی جاتیں تو امتحان کاہے کا؟ وہی بات کہ پھر فرشتوں سے آگے مزید کسی مخلوق کی ضرورت ہی نہ تھی۔ باشعور انسان کو تخلیق کرنے کے بعد خالقِ انسان اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کو آزمائے۔

☆جب ہر اچھی یا بری چیز کا خالق اللہ ہے تو برائی ہونے کے بعد شیطان اور نفس کی طرف کیوں منسوب کی جاتی ہے؟

اب اس نکتہ کو سمجھ لیں کہ بری چیز کا پیدا کرنا اور بری چیز میں مبتلا کرنا یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ جس چیز کا اقرار ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنی بھی چیزیں اپنا وجود رکھتی ہیں چاہے آپ ان کو اچھا سمجھیں چاہے برا۔ خالق ان کا اللہ ہی ہے۔ شیطان اچھا ہے یا برا؟ اس کو کس نے پیدا کیا؟ اللہ نے۔ مگر اس کو سرکش کس نے بنایا؟ کیا اللہ نے؟ جی نہیں۔

چیزیں اپنی پیدائش کے اعتبار سے بری نہیں ہوتیں۔ میں ایک بار کرنٹ لگنے سے مرتے مرتے بچا تھا۔ کیا میں موردِ الزام بجلی کے موجد کو ٹھہراتا حالانکہ میں بجلی کے فوائد جانتا ہوں۔ احمقانہ بات ہے۔ انسانی دماغ سے زیادہ برائی کس چیز میں ہے؟ انسانی دماغ کو جسم میں سے نکال دیجئے یہ دنیا ہی جنت بن جائے گی۔ مگر بدقسمتی سے اس جنت سے مستفید ہونے کے لئے بھی تو دماغ چاہئے۔ جادو پر آجایئے۔ اب یہ بات بھی بحث طلب ہے کہ جادو اچھا ہے یا برا۔ مگر پھر وہی بات کروں گا جو آپ کا مدعا ہی نہیں کہ چونکہ اللہ نے جادو کو کفر قرار دے دیا لہٰذا اس کا کرنا گناہ ہے۔ اللہ نے جادو اتارا مگر ساتھ یہ علم بھی اتارا کہ اس کا کرنا کفر ہے۔ اب باقی انسان کی مرضی چاہے جادو کرے چاہے ایمان پہ قائم رہے۔ یہ امتحان آپ کے حلق سے نیچے اترے یا نہ اترے امتحان ایسا ہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم اپنی زبان اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی ضمانت دو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ اب اس حدیث پہ عمل کرنے کے لئے کوئی اپنے یہ دونوں اعضا کیا کاٹ ڈالے؟ جی نہیں۔ ان کی برائی سے بچا جائے اور اچھائی سے مستفید ہوا جائے۔ یہ زندگی گزارنا ایسا ہے۔ جیسے خاردار راستے پر اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا۔ انعام بھی تو دیکھئے کیا مل رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو محض جنت کا دورہ کروا کر دنیا کے کسی خوبصورت سے خوبصورت ترین مقام پہ اتار دیا جائے تو اسے وہ مقام کچرا کونڈی کی مانند لگے گا۔

خدا کو ہماری عبادت کی کیا پرواہ؟

اگر مان بھی لیا جاے کہ خدا ہے تو کیا واقعی ہی وہ انہی خصلتوں کا مالک ہو گا جو ہمیں مذہب بتاتے ہیں؟، مثال کے طور پہ کیا اتنی بڑی کائنات کے بنانے والے کو ذرا بھی فکر ھو گی کہ اربوں کھربوں ستاروں میں سے اک نقطے کی حیثیت جتنے سیارے کے چھوٹے سے شہر کی چھوٹی سی گلی میں رہنے والا اک معمولی انسان کوئ چیز کھانے سے پہلے اس کا نام لیتا ھے کہ نہیں؟ وہ اس کے نام کی تسبیح کرتا ہے کے نہیں؟ دن میں پانچ وقت اس کے لیے جھکتا ھے کہ نہیں؟ اور اگر یہ سب نہیں کرتا تو اس کے لیے پہلے سے تیار کردہ دوزخ کا عذاب انتظار کر رہا ہے؟ اگر خدا ہے بھی تو کم از کم وہ نہیں ہے جس کی عبادت کے لیے کہا جاتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں بے پرواہ ھو گا۔

اعتراض کا جواب:

انسان باشعور ہے اور یہ خدا ہی ہے جس نے انسان کو باشعور بنایا۔ خالق کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ خالق نے مخلوق کو جن خصوصیات کے ساتھ بنایا، چاہیئے کہ ان خصوصیات کے ساتھ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے۔ اس کائنات میں ان گنت کرے پائے جاتے ہیں اور وہ خدا کے طئے کردہ قانون کے مطابق سفر کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے اندر اس قسم کا شعور نہیں ہے جیسا کہ اللہ نے انسانوں کے اندر بنایا۔ اسی کرے یعنی زمین پر لاتعداد جانور پائے جاتے ہیں۔

حیاتیاتی اعتبار سے یہ جانور ہیں تو انسانوں سے کافی ملتے جلتے۔ لیکن ان کے اندر پایا جانے والا شعور انسانوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ انسانوں کے اندر پایا جانے والا شعور اور اس کی صلاحیتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ وہ اپنے خالق کو اس پورے شعور کے ساتھ محسوس کرے اور اس کے آگے سر خم تسلیم کرے۔ جس خالق نے انسانوں کو یہ شعور عطا کیا اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے شعور کے ساتھ اس کی عبادت کرے نہ کہ کسی بے جان مادے کی طرح سے یا کسی جانور کی طرح۔ یہ شعور ہی اس کی جزا و سزا کہ اصل بنیاد ہے۔ جب کوئی ملحد یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات کو اس بات کی کیا پرواکہ میں اس کا نام جپتا ہوں یا نہیں، اس کے سامنے چھکتا ہوں یا نہیں تو دراصل وہ اپنے آپ کو بے جان مادے یا جانور کی سطح پر رکھ کر سوچتا ہے (یہ شعور کا بیان ہے کہ ایسا سوچنے والا خود کو کس کے لیول پر رکھ کے سوچ رہا ہے۔ کسی کی ذاتی تحقیر مقصود نہیں)۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خالق کا انکار دراصل ایک انسان کو کس سطح پر لے آتا ہے۔ اللہ تعالی نے منکرین کے بارے میں یہ جو کہا ہے کہ **لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ**, (جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے۔ یہ لوگ جو پایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں۔ یہ لوگ غافل ہیں۔ سورہ اعراف ۱۷۹)

اور دوسری جگہ یہ کہا ہے **وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ** (اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی سو اللہ تعالی نے خود ان کی جان سے ان کو بے پروا بنا دیا یہی لوگ نافرمان ہیں۔ سورہ حشر ۱۹)

لازمی پر خدا کا انکار کرنے والے اپنی حقیقت اور اپنے شعور کا انکار کر رہا ہوتا ہے۔ یہ سوال ایسے ہی ذہن کی پیداوار ہے۔ انسان جب خدا کا انکار کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے شعور کا انکار کر رہا ہوتا ہے۔

انسان بہت کمزور ہے۔

۱۔ جب انسان کسی چیز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو دوسری چیزوں کی طرف سے اس کی توجہ کم ہو جاتی ہے۔ کوئی بندہ جب اپنی ڈیوٹی پر ہوتا ہے تو وہ اتنی شدت کے ساتھ اپنے گھر والوں کی طرف توجہ نہیں دے سکتا اور اگر وہ بہت ہی شدت کے ساتھ گھر والوں کی طرف توجہ دے گا تو پھر اپنی ڈیوٹی ٹھیک سے انجام نہیں دے پائے گا۔

۲۔ جب انسان کسی چیز کی گہرائی اور تفصیلات میں چلا جاتا ہے تو اسی چیز کی مجموعی کیفیت سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک گھر کا معائنہ کر رہا ہے۔ اگر وہ گھر کی تعمیر میں استعمال کئے گئے مٹیریل، رنگ، ٹائلز وغیرہ پر بہت زیادہ توجہ دے گا تو گھر کے مجموعی سانچے اور شکل کی طرف سے وقتی طور پر اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔

۳۔ جب انسان کا کسی چیز سے سروکار ہو جاتا ہے، اس سے اس کا جذباتی تعلق بن جاتا ہے تو پھر وہ اس کی کمزوری بن جاتی ہے۔ اور اگر اس تعلق میں کوئی رخنہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر انسان کا سکون اور چین چھن جاتا ہے۔ مثلاً اولاد اور بیوی سے تعلق میں تلخیاں کسی انسان کی نیندیں حرام کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اوپر بیان کردہ چیزیں انسان کی کمزوریاں ہیں۔ اللہ رب العالمین تمام کمزوریوں سے پاک ہے۔ اللہ تعالی کلام پاک میں اپنا تعارف لطیف اور خبیر جیسے نام سے کراتا ہے۔ لطیف کا مطلب باریک بین ہے۔ اور خبیر کا مطلب ہر چیز کی خبر رکھنے والا۔ اللہ پاک اپنی تمام مخلوقات کو پوری تفصیل کے ساتھ بہ یک وقت اور بغیر کسی کوتاہی کے خبر رکھ سکتا ہے۔ اللہ کا ایک طرف متوجہ ہونا کسی کی طرف بے توجہی کی قیمت پر نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں پائے جانے والے تمام کروں کو اس کے ایک ایک ذرے کے ساتھ خدا جانتا ہے اور خدا کا یہ سب کچھ جاننا کسی اور معاملے میں اس کی کوتاہی کا سبب نہیں بن سکتا اور نہ ہی اسے اس سے غافل کرتا ہے کہ وہ اپنی باشعور مخلوق کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرے۔

اللہ غنی ہے یعنی اللہ ہر ضرورت سے بے نیاز ہے۔ ایک طرف اللہ کو اپنے بندوں سے محبت ہے اور اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ لیکن محبت کی یہ شدت جس طرح انسانوں کی کمزوری ہے اس طرح خدا کی کمزوری نہیں ہے۔ خدا تمام انسانوں کے ساتھ بالکل ہی ذاتی تعلق رکھ سکتا بغیر اس کے کہ وہ تعلق اس کی کمزوری بنے۔

اوپر بیان کئے گئے نکات سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب ملحد اس طرح کے اعتراضات کرتا ہے تو وہ خدا کے ساتھ انسانوں کی کمزوریوں کو منسوب کر کے سوچتا ہے۔ایک بالکل عام اور سادہ ذہن آدمی بھی اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتا ہے کہ رب العالمین تمام کمزوریوں اور عیبوں سے پاک ہے اور یہ اس کے رب العالمین ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراض کرنے والے کے ذہن میں دو بنیادی الجھنیں ہیں

وہ انسان کو جانور یا اس سے بھی کمتر سطح پر رکھ کر سوچتا ہے اور وہ رب العالمین کو انسان کی سطح پر رکھ کر سوچتا ہے۔

تحریر ذیشان وڑائچ

اچھے کام کرنے والوں کی زندگی تنگ کیوں ہو جاتی ہے

سوال: آج سے ایک سال قبل دنیا کے جملہ افعال بد سے دوچار تھا، لیکن دنیا کی بہت سی آسانیاں مجھے حاصل تھیں۔ میں نہ کسی کا مقروض تھا اور نہ منت کش اور اب جبکہ میں ان تمام افعال بد سے تائب ہو کر بھلائی کی طرف رجوع کر چکا ہوں، دیکھتا ہوں کہ ساری فارغ البالی ختم ہو چکی ہے اور روٹی تک سے محروم ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اچھے اور نیک کام کرنے والوں کے لیے دنیا تنگ کیوں ہو جاتی ہے اور اگر ایسا ہے تو لوگ آخر بھلائی کی طرف کا ہے کو آئیں گے؟ یہ حالت اگر میرے لیے آزمائش ہے کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے تو یہ منزل میں کس طرح پوری کروں گا؟

جواب: آپ جس صورتحال سے دوچار ہیں، اس میں میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے اور میں آپ کا دل دکھانا نہیں چاہتا لیکن آپ کی بات کا صحیح جواب یہی ہے کہ آپ فی الواقع آزمائش ہی میں مبتلا ہیں اور اس منزل سے بخیریت گزرنے کی صورت صرف یہی ہے کہ آپ خدا اور آخرت کے متعلق اپنے ایمان کو مضبوط کر کے صبر کے ساتھ نیکی کی راہ پر چلیں۔

آپ کو اس سلسلے میں جو الجھنیں پیش آ رہی ہیں، ان کو رفع کرنے کے لیے میں صرف چند اشارات کرنے پر اکتفا کروں گا۔

بدی کی راہ آسان اور نیکی کی راہ مشکل ہونے کی جو کیفیت آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارا موجودہ اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی ماحول بگڑا ہوا ہے۔ اس ماحول نے بکثرت ایسے اسباب پیدا کر رکھے ہیں جو

برے راستوں پر چلنے میں انسان کی مدد کرتے ہیں اور بھلائی کی راہ اختیار کرنے والوں کی قدم قدم پر مزاحمت کرتے ہیں۔ اگر خدا کے صالح بندے مل کر اس کیفیت کو بدل دیں اور ایک صحیح نظام زندگی ان کی کوششوں سے قائم ہو جائے تو انشاء اللہ نیکی کی راہ بہت آسان اور بدی کی راہ بڑی حد تک مشکل ہو جائے گی۔ ایسا وقت آنے تک لا محالہ ان سب لوگوں کو تکالیف و مصائب سے دوچار رہونا ہی پڑے گا جو اس برے ماحول میں راہِ راست کو اپنے لیے منتخب کریں۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ نیکی بجائے خود اپنے اندر دشواری کا ایک پہلو رکھتی ہے، اس کے برعکس بدی کی فطرت میں ایک پہلو آسانی کا مضمر ہے۔ آپ بلندی پر چڑھنا چاہیں تو بہر حال اس کے لیے آپ کو کسی نہ کسی حد تک محنت کرنی ہی پڑے گی، چاہے ماحول کتنا ہی سازگار بنا دیا جائے لیکن پستی کی طرف گرنے کے لیے کوشش اور محنت کی ضرورت نہیں۔ ذرا اعصاب کی بندش ڈھیلی کر کے لڑھک جایئے، پھر تحت الثریٰ تک سارا راستہ کسی سعی و محنت کے خود طے ہو جائے گا۔

آپ پوچھتے ہیں کہ اگر اچھے کام کرنے والوں کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے تو دنیا اس طرف رخ ہی کیوں کرے گی؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر اچھے کام کرنے والوں کو دنیا کی تمام سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچنے لگیں اور برے کام کرنے والوں پر آفتیں ٹوٹ جایا کرتیں تو پھر کون ایسا احمق تھا کہ جو برائی اختیار کرتا اور بھلائی سے منہ موڑتا۔ پھر تو کامیابی آسان اور ناکامی دشوار ہوتی، جزا سستی اور سزا مہنگی ہو جاتی، انعام مفت ملتا اور عذاب پانے کے لیے محنت کرنا پڑتی۔

کیا اس کے بعد دنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو بھیجنے کا کوئی فائدہ تھا؟ اور کیا اس کے بعد نیک انسانوں کی نیکی کسی قدر و قیمت کی مستحق قرار پا سکتی تھی؟ جبکہ ان کو نیکی کے راستے طے کرنے کے لیے قالین بچھا کر دیے گئے ہوں؟

آپ کا یہ سوال ایک اور لحاظ سے بھی عجیب ہے۔ آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ لوگوں کے راہ راست پر آنے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی اپنی غرض اٹکی ہوئی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر آپ پوچھتے ہیں کہ اگر راہِ راست مشقتوں اور آزمائشوں سے بھری ہوئی ہے تو دنیا اس راہ پر آئے گی ہی کیوں؟ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ راہِ راست اختیار کرنے میں لوگوں کا اپنا فائدہ

ہے نہ کہ خدا کا اور اس کے خلاف چلنے میں لوگوں کا اپنا نقصان نہ کہ خدا کا۔ خدا نے انسان کے سامنے دو صورتیں رکھ دی ہیں اور اسے اختیار دیدیا ہے کہ ان میں سے جسے چاہے انتخاب کرلے۔ ایک یہ کہ وہ اس زندگی کے چند روزہ مزوں کو ترجیح دے کر آخرت کا ابدی عذاب قبول کرلے۔ دوسری یہ کہ وہ آخرت کی بے پایاں راحت و مسرت کی خاطر ان تکلیفوں کو گوارہ کرے جو دین و اخلاق کے ضابطوں کی پابندی کرنے میں لا محالہ پیش آتی ہیں۔ لوگوں کا جی چاہے تو وہ پہلی صورت کو پسند کریں۔ اگر ساری دنیا مل کر بھی اپنے انتخاب میں یہ غلطی کر گزرے تو خدا کا کچھ نہ بگاڑے گی۔ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ لوگوں کے صحیح انتخاب راہ سے اس کا کوئی مفاد وابستہ ہو۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۷۰ھ، نومبر 1950ء)

خدا کیوں چاہتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں؟

خدا ہم سے کیوں اپنی تعریف کروانا چاہتا ہے۔

خدا کیوں چاہتا ہے کہ ہم اس کی بڑائی کرتے رہیں

خدا کیوں چاہتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں؟

ہم خدا کی عبادت کریں تو خدا کو کیا فائدہ۔ اور اگر کوئی فائدہ ہے تو خدا ہمارا محتاج ہوا۔

خدا کا ہر حکم اس کی ذات پر مرکوز کیوں ہے۔

آپ کو اس طرح کے بہت سارے سوالات ملیں گے جو ملاحدہ کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے سوالات کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا اخلاقی پہلو ہے۔ تعریف، عبادت اور بڑائی کو اپنی ذات میں مرکوز کرنا اخلاقی اعتبار سے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ دوسرا یہ تجسس ہے کہ خدا ہم سے یہ سب کچھ کیوں کروانا چاہتا ہے۔ کیا اس سے خدا کو کوئی فائدہ ہے؟ اور اگر ہے تو پھر خدا ہمارا محتاج ٹھہرتا ہے اور اگر فائدہ نہیں ہے تو یہ سب کچھ بے کار ہے۔

انسان کے لئے اپنی بڑائی، تعریف، ستائش اور پرستاری چاہنا ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

1۔ انسان کے اندر پائی جانے والی خوبیاں مستقل اور لازوال نہیں ہیں۔

2۔ انسان اپنی خوبیوں پر نظر رکھنے کی وجہ سے دوسرے کی خوبیوں کو دیکھ نہیں پاتا۔

3۔ اپنی بڑائی کے زعم میں دوسروں پر زیادتی کر کے ان کی حق تلفی کرتا ہے۔

4۔ انسان کے اندر پائے جانی والی خوبیاں اس کی اپنی نہیں ہوتی۔ اس کی ترویج میں اس کا خاندان اور معاشرے کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ انسان کو فرد اور معاشرے کی حیثیت سے خدا نے پیدا کیا ہے اس لئے ان خوبیوں کا اصل خالق خدا ہے۔

5۔انسان میں خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور جب وہ صرف اپنی خوبیوں پر نظر رکھتا ہے تو اس کی کمزوریاں اس کے نظروں میں نہیں رہتی جس کی وجہ سے وہ خود فریبی کا شکار رہتا ہے۔

اب غور کر کے بتائیں کہ خدا جب اپنی تکبیر کرواتا ہے، اپنی تعریف کا حکم دیتا ہے اور اپنی عبادت کرواتا ہے تو اوپر بیان کی ہوئی کونسی وجہ خدا پر بھی صادق آتی ہے؟

ظاہر ہے کہ خدا علیم و خبیر ہے اور تمام مخلوقات کا خالق۔ ہر قابل تعریف چیز کا خالق خدا ہے۔ تو پھر خدا ہی تعریف کا حقیقی مستحق ہوا۔ خدا کے ناموں میں سے ایک المتکبر ہے۔ تکبر مخلوق کے لئے بالکل سزاوار نہیں، لیکن یہ حق ہے کہ خدا سب سے بڑا ہے اور حق ہے کہ ہم خالق کائنات کی بڑائی بیان کریں۔ انسانوں کے اندر خود ستائشی اور تکبر کے برے ہونے کے احساس کی بنیاد یہی ہے کہ ہم اسے خدا کا حق سمجھتے ہیں اور اس لئے جب کوئی انسان اس طرح کا طرز عمل اختیار کرتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خدا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب اسی چیز کی بنیاد پر خدا کی تعریف، ستائش اور تکبیر پر اعتراض کرنا خود ایک بہت بڑا تضاد ہے۔ جب خدا خود خدا ہے تو وہی خدا ہوا۔

ایک بھائی نے کہا کہ ایک روایت کے مطابق بندہ جب خدا سے دعا کرتا ہے تو خدا خوش ہوتا ہے۔ معلوم ہوا خدا ایک متکبر بادشاہ کی طرح ہے کہ جب لوگ اس کے سامنے بھکاریوں کی طرح گڑگڑائیں تو بادشاہ خوش ہوتا ہے۔ عرض کی کہ اگر معاملہ اسی نوعیت کا ہے تو یہ خدا ہی کو شیوہ دیتا ہے کیونکہ کبر اس کو زیب دیتا ہے، بندے کی بھلا کیا اوقات کے اپنے جیسے دوسرے بندوں سے بھیک منگوا کر خوش ہو؟ پس جو چیز بندوں کے لئے معیوب ہے لازم نہیں خدا کے لئے بھی معیوب ہو۔ دوسری بات یہ کہ خدا سے مانگنے پر خدا کے خوش ہونے میں محبت کا پہلو بھی شامل ہے۔ میری بیگم جب مجھ سے کچھ فرمائش کرتی ہے تو واللہ مجھے اس کی یہ ادا سب سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ''کسی کو اپنا سمجھ کر اس سے مانگنے'' میں محبت کا جو اظہار اور لطف ہے اس سے صرف محب ہی واقف ہو سکتا ہے۔ خدا اپنے بندوں سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ (زاہد مغل)

اب آتے ہیں اس پہلو پر کہ خدا کو اس سے کیا ملتا ہے۔

ایک بہت ہی اصولی بات ذہن میں رکھنا چاہیئے، ہم خدا کو اس کی صفات سے پہچانتے ہیں۔ خدا کی معرفت اس کے صفات کی معرفت ہے۔ کسی کی صفت کے بارے میں یہ پوچھنا کہ وہ ایسا کیوں ہے ایک غیر منطقی بات ہے۔ خدا نے جس طرح سے اپنا تعارف کرایا وہ ایک حتمی، بدیہی اور ابدی حقیقت ہے۔ اس کے لئے ''کیوں'' کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خدا کا تعارف ہی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے، اپنی پوری مخلوقات کا مالک ہے، ہر ایک سے بزرگ تر ہے اور اسی لئے تمام تعریفوں کا مستحق ہے۔ جب کوئی عدد ''دو'' کا تعارف اس طرح سے کراتا ہے کہ جب ایک عدد میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے تو اسے دو کہتے ہیں تو اس کے لئے ''کیوں'' کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لغوی اعتبار سے دو کا تعارف یہی چیز ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کی ''خدا'' کیوں ہے۔ خدا ہے یا نہیں اس پر تو منطقی بحث ہو سکتی ہے، خدا کیسا ہے اس پر مذہبی بحث ہو سکتی ہے۔ خدا کیوں ہے، یہ کوئی بحث کا نکتہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی مصر ہے کہ اس پر بحث ہونی ہی چاہیئے تو جو چاہے کرے۔ لیکن اس کا جواب نہ مذہب کے ذمہ ہے اور نہ منطق کے۔ اسی طرح سے یہ سوال پوچھنا کہ خدا ایسا کیوں ہے اور ویسا کیوں نہیں ہے ایسے ہی سوال کے ضمن میں آتا ہے۔ اس طرح کا سوال پوچھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھے، خدا بے رحم کیوں نہیں ہے؟ خدا سچ کو کیوں پسند کرتا ہے جھوٹ کو کیوں پسند نہیں کرتا، خدا ظلم کے خلاف کیوں ہے؟ خدا خالق کیوں ہے؟

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی صفات کے لیے ''کیوں'' پوچھنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کے وجود کے لئے ''کیوں'' کا پوچھنا۔ اس سوال کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے اور اس سوال کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کا جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے عدد ''دو'' کے تعارف کے لئے ''کیوں'' نہیں ہو سکتا۔

خدا کی ایک صفت معبود ہے۔ خدا کا حمید ہونا، خدا کا المتکبر ہونا، خدا کا البر ہونا اس کی صفات ہیں۔ اس کے لئے ''کیوں'' نہیں ہوتا۔ صفات اظہار چاہتی ہیں۔ جب خدا نے کچھ بھی نہیں بنایا تھا تو بھی خدا ''خالق'' تھا، لیکن اس نے جب ''پیدا

کیا''تواس نے اپنی اس صفت کا اظہار کیا۔ جب کوئی خدا کی عبادت نہیں کر رہا تھا تو اپنی صفت کے اعتبار سے وہ''الہ''تھا لیکن جب اس کی مخلوق نے اس کی عبادت کی تو صرف اس کی عبادت کا اظہار ہوا۔

اس پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا اپنی صفات کے اظہار کے لئے ہمارا محتاج ہے؟جواب یہ ہے کہ ہم تو تھے ہی نہیں اور خدا نے ہمیں اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا اور عبادت کرنے کا شعور، صلاحیت اور وقت بھی سب کچھ خدا نے دی، تو جب ہمارا کچھ ہے ہی نہیں اور سب کچھ خدا کا ہی ہے تو یہاں پر خدا کی محتاجی کا سوال پیدا ہی کیسے ہوتا ہے؟

خدا نے پوری کائنات بنائی اور کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کے حکم سے چل رہا ہے۔ تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا اپنی حاکمیت کے لئے کائنات کا محتاج ہے؟ حالانکہ یہ پوری کائنات اپنے وجود کے لئے خدا کی محتاج ہے۔اس طرح کا سوال پوچھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ، چونکہ خدا نے اپنی صفت خلاقیت کے اظہار کے لئے کائنات، فرشتے، انسان، اور دوسری مخلوقات کو پیدا کیا اس لئے خدا اپنی صفت خلاقیت کے اظہار کے لئے اپنی مخلوق کا محتاج ہے۔

مصوری کی صلاحیت ایک مصور کی اپنی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ خدا کی صفت کی طرح لازوال ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم مصور کو تصویر کا محتاج نہیں جانتے۔ اسی طرح اگر خدا اپنی صفت خلاقیت کے اظہار کے مخلوق پیدا کرتا ہے تو وہ اپنی مخلوق کا محتاج تو نہ ہوا بلکہ مخلوق اپنے وجود میں آنے کے لئے اس کی محتاج ہوئی۔ بالکل اسی طرح اگر خدا اپنے بندوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اپنے شعور کو اختیار کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو نہ بھی کریں تو خدا کیسے اپنی مخلوق کا محتاج ہوا؟

اللہ نے انسان کو سوچنے کی صلاحیت دی اور اس بات کا اختیار دیا کہ وہ چاہے تو خدا کی عبادت کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ اب اس اختیار کی بنا پر انسان کیسی کیسی اڑانیں بھرتا ہے اور وہ بھی اسی خدا کی عطا کی ہوئی صلاحیت کو استعمال کر کے؟

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ

کیاانسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیااور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟

سوال: اگر ھم یہ کہیں کہ اللہ عزوجل نیکیوں سے خوش ہوتا ھے۔ گناہوں سے ناراض۔ دعا سے آمادہ بر عطا ہوتا ہے۔ فلاں فلان کام سے راضی ہوتا ہے۔ تو کیا اس کا یہ مطلب نہ بن جائے گا کہ مخلوق خدا عزوجل پر اثرانداز ہوتی ہے

تبصرہ

چیزیں خدا سے متعلق ہو کر مفہوم پاتی ہیں.. مفہوم دیتی نہیں.... خدا کی ذات فعال ہے منفعل نہیں.... ہماری زبان میں اس طرح کے اظہاریے استعاراتی ہیں حقیقی نہیں تاکہ اعمال کو مفہوم مل سکے

تفصیل یہ کہ اثرانداز کوئی چیز تب ہوتی جب کوئی کمی ہو علم کی سطح پر یا وجود کی سطح پر...اور خدا ہر نقص سے پاک ہے کامل ہے مکمل ہے علم اور وجود کی کوئی حیثیت اس پر اس لیے اثرانداز نہیں ہوتی.... ہم اس طرح کے الفاظ اور جملے اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ہمارا خدا سے زندہ تعلق ہے اور ہم ناقص ہیں ہم پر چیزیں اثرانداز ہوتی اس لیے کہ ہمارا علم اور وجود منفعل ہے اور وہ فعال ہے اسے اس سے فرق نہیں پڑتا.... علمی طور پر آسان مثال اگر آپ کے علم میں کوئی چیز نہیں تو معلوم ہونے پر حیرانی ہو گی اور اس طرح وہ اثرانداز ہو گی لیکن اگر پہلے سے علم ہے تو اثر نہیں ہو گا....اور وجودی اور حقیقی طور پر خدا اکبر ہے.. ایسا نہیں ہے کہ ہمارے اللہ اکبر کہنے سے خدا بڑا ہو جاتا ہے یا نہ کہنے سے چھوٹا ہو جاتا ہے... ہمارے کہنے نہ کہنے سے اس کی بڑائی پر کوئی فرق نہیں پڑتا

تحریر ذیشان وڑائچ، عثمان رمضی

کیاخدا کو ہماری عبادت کی ضرورت ہے؟

کیاخدا کو ہماری عبادت کی ضرورت ہے؟

عام طور پر یہ سوال اسلام کے تصور سے ناواقفیت کی بنیاد پر اٹھایا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں بارہا مرتبہ یہ آ چکا ہے کہ اللہ کی ذات ہر قسم کی ضرورت سے پاک ہے۔ ''اور جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی (نفع کے) لیے محنت کرتا ہے (ورنہ) خدا تعالیٰ کو (تو) تمام جہان والوں میں کسی کی حاجت نہیں.''(سورہ العنکبوت آیت نمبر ٦)

لہذا خدا کو ہماری عبادت کی کوئ ضرورت نہیں ہے ، اسے ہماری عبادت سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اور ہمارے عبادت نا کرنے سے بھی اسکی شان، عظمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ہم خدا کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ خدا نے اپنی حکمت سے ہمیں تخلیق ہی اس طرح کیا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں، اور اس عبادت کو خدا نے ھمارے لئے جسمانی اور روحانی دونوں طرح سے فائدہ مند بنایا ھے۔

خدا نے ہمیں اپنی عبادت کے لیے کیوں پیدا کیا؟

1۔ خدا خود چونکہ سراپا اچھائی ھے لہذا وہ خود بھی اچھائی کو پسند کرتا ھے۔ چنانچہ ہر اچھا کام اسکی عبادت میں شمار ہوتا ہے اب جو اچھے کام کرے گا اسے اچھائی یعنی رب اور اسکی رحمت ملے گی۔ مختصر یہ کہ خدا نے ھمیں اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا کیونکہ وہ ھماری بھلائی چاھتا ھے وہ یہ چاھتا ھے کہ ھم اسکی رحمت جنت کے حقدار بنیں۔

2۔ خدا کے بہترین ناموں اور صفات کا اظہار ہونا تھا اس لیے عبادت کرنے والی مخلوق کا تخلیق ہونا ناگزیر تھا. چونکہ خدا معبود ہے اس لیے یہ ناگزیر تھا کہ اسکا اظہار بھی ہو، اسکی ایسی مخلوق ہو جو اسکی عبادت کرتی ہو. یہ ناگزیریت ضرورت پر مبنی نہیں ہے بلکہ خدا کے نام اور صفات کا ایک لازمی اظہار اور مثال ہے.

ہمارا علم چونکہ محدود ہے اس لیے ہم کبھی بھی خدا کی حکمت کو مکمل طور پر سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم ایسا کرنے کے قابل ھو گئے تو یا تو ہم خدا بن جائیں گے یا خدا ھمارے جیسا تصور ھو گا۔ یہ دونوں صورتیں ناممکنات میں سے ہیں۔ خدا نے اپنی دائمی حکمت کی وجہ سے ہمیں ایسا پیدا کیا ہم اسکا مکمل کھوج اپنے علم سے نہیں لگا سکتے، خدا کو بس اتنا ہی سمجھنا ممکن ھے جتنا خود اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ چنانچہ اب صورتحال یہ ہے کہ فرض کریں کہ آپ ایک چٹان کے کنارے پر کھڑے تھے اور کسی نے آپ کو نیچے سمندر میں دھکا دے دیا. سمندر کے پانی میں بہت سی شارک

مچھلیاں موجود ہیں. تاہم جس نے آپ کو دھکا دیا، اسی نے آپ کو ایک نقشہ اور ایک آکسیجن ٹینک دیا جس سے آپ کو ایک خوبصورت جزیرے پر پہنچنے میں مدد ملے گی، جہاں آپ ہمیشہ آرام میں رہیں گے. اگر آپ ذہین ہیں تو آپ نقشہ کا استعمال کریں گے اور جزیرے تک باحفاظت پہنچنے کی کوشش کریں گے. تاہم اگر آپ اسی سوال پر پھنس گئے، تم نے مجھے یہاں پھینکا کیوں تھا؟ تو یا تو آپ کو شارک کھا جائے گی یا آکسیجن ختم ھونے پر آپ سانس بند ھونے کی وجہ سے مر جائیں گے. مسلمان کے لئے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نقشہ اور آکسیجن ٹینک ہیں. یہ ہمارے وسائل ہیں جو محفوظ طریقے سے زندگی گرازنے میں ھماری رہنمائی کرتے ھیں. ہمیں خدا کو جاننا، اس سے محبت کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے۔ ہمارے پاس اس پیغام کو نظرانداز کر کے خود کو نقصان پہنچانے کا اختیار ہے، یا اسے قبول کر کے خدا کی محبت اور رحمت کا حق دار ہونے کا. اب یہ ھماری صوابدید پر ھے کہ ھم کونسا رستہ اختیار کرتے ھیں۔

صفت اور اسکے اظہار کا تعلق:

یہ سوال صفت اور اسکے اظہار کے مابین ناگزیر بیانیہ تعلق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ صفت اور اسکے اظہار کے بارے میں، 'کیوں' کا سوال ہی غیر متعلقہ ھوتا ھے کیونکہ انکے درمیان تعلق ''وجہ'' کا نہیں بلکہ ''ہے'' (to be) کا ہوتا ہے، یعنی صفت کا اظہار ہی صفت کی تعریف (یعنی ڈسکرپشن) ہوتی ہے۔ مثلاً سماعت کا معنی ھے سنائی دینا، یعنی سنائی دینے کا عمل صفت سماعت کا اظہار یا اسکی تعریف ھے اور اس اظہار سے علی الرغم اسکا کوئی معنی نہیں۔

چنانچہ خدا کی ایک صفت 'خالق' ھونا ھے، پس مخلوق کا ھونا خدا کی صفت خلاقیت کا 'اظہار' ھے، یہاں وجہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال ایسا ہی ھے جیسے کوئی کہے کہ صفت بینائی سے دکھائی کیوں دیتا ھے یا صفت سماعت سے سنائی کیوں دیتا ھے۔ ظاھر ھے یہ سوال ھی غلط ھے کیوں کہ دکھائی دینے اور بینائی کے درمیان تعلق صفت اور اسکے اظہار کا

ھے، یعنی دکھائی دینا صفت بینائی کی تعریف ھے اس پر ''مقصد'' کا سوال غیر متعلق ھے۔ بالکل اسی طرح خدا کی مخلوق کا ھونا خدا کے خالق ھونے کا اظہار ھے، یہاں اصولا ''کیوں'' کا سوال ہی پیدا نہیں ھوتا۔

اسی طرح یہ سوال کہ خدا امتحان کیوں لے رہا ہے؟ اسکا جواب بھی یہی ہے کہ خدا کی صفات 'حق' و ''عادل'' ہونا بھی ہیں، پس حق و باطل کا معرکہ اسی صفت ''حق'' اور جزا و سزا کا نظام صفت ''عادل'' کا اظہار ہے، لہذا یہاں بھی کیوں کا سوال بے محل ھے۔

ان صفات کے اظہار کا مقصد کیا تھا؟ ان صفات کا اظہار کرنے کی کیا وجہ پیش آگئی تھی؟

پہلے واضح کیا گیا کہ صفت کے اظہار پر 'کیوں' کا سوال پیدا نہیں ھوتا۔ گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل اھل مذھب کا یہ اصولی مقدمہ یاد رکھنا چاھئے کہ خدا کو بس اسی حد تک پہچانا جا سکتا ھے جس قدر خود اس نے اپنے نبی کے ذریعے اپنا اظہار کیا، اس سے زیادہ عقل کے سامنے کوئی سوال رکھنا عقل پر ایسا بوجھ ڈالنا ھے جسکی وہ متحمل نہیں ھو سکتی۔ چنانچہ خدا نے بتایا کہ میں 'خالق' ھوں تو ہمیں پتہ چلا کہ کسی مخلوق کا ھونا اس صفت کا اظہار ھے۔

اب یہ سوال کہ صفات بالقوہ کو بالفعل میں 'کس سبب و مقصد سے' تبدیل کیا گیا؟ جب ہم انسان ''مقصد'' کا سوال اٹھاتے ھیں تو وہ ''ذات سے بیرون'' کسی شے کی جستجو کا تصور ھوتا ھے۔ اب خدا سے یہ توقع رکھنا کہ ''اس سے الگ'' کوئی مقصد ھوگا جسکی وہ جستجو کرے گا یہ خدا کی صفت صمدیت (self-determined and contained) کے تناظر میں خود سے ایک تضاد ہے، یعنی خدا کے کسی عمل کا کوئی ''بیرونی مقصد'' نھیں ھو سکتا کہ جسکے حصول کا خدا یا اسکا عمل گویا ذریعہ بنے۔ اب لامحالہ یہ مقصد کا سوال ''خدا کے اندرون'' سے متعلق ھی ھو سکتا ھے اور اس اندرون کو ھم اسی قدر جان سکتے ہیں جس قدر وہ اپنی شان کے مطابق ظاھر کرے۔ خدا کے اندرون سے متعلق

ھم صرف اسقدر ہی جانتے ہیں کہ اس نے اپنا تعارف ''فعال للما یرید''(جو چاھتا ھے کر گزرتا ھے) سے کروایا ہے۔ تو گویا یوں سمجھئے کہ ''یوں عدم کو وجود بخشنا بھی ''اسکی ''صفت ارادہ ''ہی کا اظھار ھے۔ اس کے علاوہ ھم کوئی دوسری بات قطعیت کے ساتھ خدا کے اندرون کے بارے میں نھیں جانتے۔ اب اس صفت کے اظہار پر بھی اصولا 'کیوں 'کا سوال پیدا نہیں ھوتا۔

یہاں یہ اھم بات بھی ذھن نشیں رھنا چاھئے کہ خدا کی ذات کے حوالے سے اس قسم کے بہت سے سوالات اسکی صفات کو الگ الگ تصور کرنے سے بھی پیدا ھوتے ہیں۔ اھل مذھب کے یہاں خدا فعال للما یرید، خالق، عادل، علیم، حکیم وغیر ھم سب ''ایک ساتھ ''ہے۔ چنانچہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''خدا اپنے ارادے سے اپنی صفات کا (اپنی شان کے مطابق) پر حکمت اظھار کرتا ھے۔''

یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہئے کہ ہر وجود سے متعلق بہت سے سوالات غیر متعلق ھوتے ہیں اور بہت سے متعلق۔ مثلا اگر میں اپنا چشمہ اپنے کمرے میں رکھ کر جاؤں اور جب واپس آؤں تو وہ کمرے کے بجائے باہر ٹیرس پر ھو تو اس پر ذھن میں سوال آئے گا کہ 'چشمہ باھر کیسے چلا گیا'؟ اب فرض کریں چشمے کے بجائے میرا ایک دوست کمرے میں بیٹھا تھا اور میرے واپس آنے پر وہ ٹیرس میں کھڑا تھا۔ کیا اب میرے ذہن میں ''کیسے ''کا سوال پیدا ھوگا؟ نہیں، کیونکہ انسان کی ڈسکرپشن یہ ھے کہ وہ ''متحرک بالارادہ ''ھوتا ھے لیکن چشمہ نہیں۔ تو جو سوال چشمے کے تناظر میں عین عقلی تھا انسان کیلئے (اسکی صفت 'متحرک بالارادہ 'کے سبب) غیر متعلق ھو گیا۔ پس یہی معاملہ خدا کا بھی ھے کہ اس کی ذات پر بہت سے سوالات بذات خود غیر متعلق ہیں جیسے یہ کہ 'خدا ایسا کیوں ھے 'کیونکہ وہ الصمد (قائم بالذات ھستی) ھے، ایسی ھستی جو اپنے ھونے کا جواز خود اپنے اندر رکھتی ھے۔، چنانچہ خدا کی صفات پر 'کیوں 'کا سوال اٹھانے کا مطلب ہی یہ ھے کہ ھم خدا کے الصمد ھونے سے سہو نظر کر لیں۔ پس خدا کی مقصدیت کی تلاش خدا کی صمدیت کا انکار اور اسے اپنے جیسی محتاج مخلوقات پر قیاس کرنا ہے۔

کائنات کو بنانے سے پہلے خدا کیا کر رہا تھا؟

ایک ملحد کی طرف سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کائنات کو بنانے سے پہلے اللہ تعالی کیا کر رہا تھا۔اس سے پہلے کہ میں اس سوال کا جواب دوں سوال میں پائی جانے والی کچھ غلطیوں کی طرف اشارہ کر دوں۔

اس سوال میں یہ مفروضہ چھپا ہوا ہے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے ہمیں اس سب کے بارے میں معلوم ہے یا معلوم ہونا چاہئے۔ایسا کچھ نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کبھی بھی یہ دعوی نہیں کیا کہ ہمیں اللہ کے ہر ہر عمل کے بارے میں معلوم

ہے۔ سوال میں چونکہ خاص طور پر یہ پوچھا گیا ہے کہ کائنات کو بنانے سے ''پہلے ''اللہ کیا کرتا تھا، اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ گویا سوال پوچھنے والے موصوف کو پتہ ہے کہ کائنات بنانے کے بعد اللہ کیا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ کائنات بنانے کے بعد اللہ کیا کرتا ہے۔ غالبا سوال پوچھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ کائنات بنانے کے بعد اللہ کائنات کو سنبھالنے میں مصروف ہے اور مزید کچھ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اللہ رب العالمین ہے اور کائنات کو وہی چلا رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کائنات کی پالنہاری اللہ کے لئے کچھ ایسی مشغولیت ہے کہ وہ اس میں مصروف ہو جائے اور کچھ اور نہ کر پائے۔

اس سوال میں ایک اور مفروضہ یہ ہے کہ اللہ کو ''کچھ کرتے ''بھی رہنا ہے، یا کچھ کرنا اللہ کی ایسی مجبوری ہے جیسے انسان کی۔ انسان دنیا میں رہتا ہے اور اپنی زندگی، آرام اور سہولت کے لئے اسے ''کچھ کرنے ''کی مجبوری لاحق ہے۔ یہ اللہ کی مجبوری نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ اس سوال میں ایک ملحد کتنے مفروضے ساتھ لئے پھر رہا ہے۔ یہ سب مفروضات مخلوق کی کمزوریاں ہیں نہ کہ رب العالمین کی۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سوال پوچھنے والے کی دماغی کیفیت کیا ہے۔ شاید ایک ملحدانہ دماغ مخلوقانہ کمزوری سے آگے سوچنے کے قابل نہیں رہ پاتا۔ چلئے اب سوال کے جواب پر بھی آتے ہیں۔

اللہ نے جو کائنات بنائی ہے، زمان و مکان اس کائنات کا حصہ ہے۔ سائنسی اعتبار سے بھی بگ بینگ کے ساتھ ہی وقت اور خلا کا وجود ہوا۔ تو کائنات بننے سے پہلے نہ خلا کا وجود تھا اور نہ ہی وقت کا۔ انسانی شعور کسی عمل اور شئے کے ادراک کے لئے خلا اور وقت کا محتاج ہے۔ انسانی شعور بغیر وقت کے کسی بھی چیز کو سمجھ نہیں سکتا۔ اور کائنات بننے سے پہلے وقت کا وجود ہی نہیں تھا۔ ایسے میں ایک انسان کے لئے یہ سمجھنا ناممکن ہے کہ وقت کے فریم کے باہر کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔ اس لئے کم از کم یہ بات اس دنیا کے انسانی شعور کے ادراک کے باہر ہے۔

اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سوال دراصل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ سوال پوچھنے والا خدا کو مخلوق کی کمزوریوں سے متصف سمجھتا ہے۔ اور دوسری بات جو واضح ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود انسان ہوتے ہوئے اپنے شعوری ادراک کی کمزوری سے ناواقف ہے۔ آسان زبان میں اس سوال کا جواب یوں بنتا ہے۔

۱۔ ہمیں پتہ نہیں،

۲۔ ہمیں پتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں

۳۔ اور رب العالمین نے ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

۴۔ ہمیں وہی چیزیں بتائی گئیں ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے۔

۵۔ ہماری نجات کے لئے اس سوال کا جواب معلوم ہونا ضروری نہیں ہے۔

۶۔ اس سوال کا جواب سمجھنا انسانی شعور کے ادراک سے باہر ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ خدا اگر کائنات میں تصرف کرتا ہے تو اسے زمان و مکان میں شرکت کرنا ہوگی کیونکہ کائنات ان میں مقید ہے، لہذا زمان و مکان سے ماوراء خدا کا مذھبی تصور غلط ہے۔

اس اعتراض میں یہ خیال نہیں رکھا گیا کہ زمان و مکان اس کائنات سے متعلق تصورات ہیں، چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ کائنات مخلوق ہے تو اس کا معنی یہ بھی ہوتا ہے کہ زمان و مکان بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ اور یہ بات واضح ہے کہ مخلوق میں تصرف کرنے کے لئے مخلوق بننا لازم نہیں، جیسے انسان اپنی مخلوقات میں مخلوق کے اجزاء بنے بغیر اس میں تصرف کر لیتا ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ خدا کے اس تصرف کرنے کی کیفیت کیا ہے تو اس کے معلوم ہونے کے اہل مذھب مدعی ہی نہیں کہ ان سے یہ سوال کیا جائے۔ اس بارے میں اصولی پوزیشن یہ ہے کہ انسان اپنے تمام تر وجود کے ساتھ چونکہ زمان و مکان میں مقید ہے لہذا وہ زمان و مکان سے ماوراء رہتے ہوئے اس میں تصرف کی ''کیفیت'' کو سمجھ نہیں سکتا۔

خدا وہ نہیں ہوتا جسے کوئی اپنی مرضی، علم، عقل اور نفس کی طرف سے بنا کر کہے کہ ''خدا ایسا ہے یا ویسا ہے''۔ خدا وہ ہے جس کا تعارف محمد رسول اللہ ﷺ نے کروایا۔ خدا کے بارے میں مشرکین عرب کے بھی اپنی طرف سے بنائے ہوئے بہت سے تصورات تھے مگر قرآن نے انہیں رد کیا۔ اسی طرح اگر آج کوئی اپنی سائنسی تحقیقات سے کسی ایسے خدا کو تراش لے (جیسے بعض فلسفیوں نے ''کلاک میکر گاڈ'' تراش لیا تھا کہ جو گھڑی ساز کی طرح گھڑی بنا کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا یا جیسے بعض فلسفیوں نے بس ''علت اولی'' کا نام خدا رکھ لیا) جو نبی آخر الزمان کی خبر کے مطابق نہ ہو تو یہ وہ خدا نہیں ہے جس نے انسان کو بنایا بلکہ یہ وہ خدا ہے جسے انسان نے بنایا۔

تحریر ذیشان وڑائچ، زاہد مغل

ہم خدا کی عبادت کیوں کریں؟

جب ہم اپنے پسندیدہ کھلاڑی کی میدان میں بہترین کارکردگی وصلاحیت کو دیکھتے ہیں، جب کسی جرات مندانہ کارنامے کو دیکھتے ہیں، یا پھر جب حوصلہ افزا یا جذبات کو ابھارنے والی تقریر سنتے ہیں تو ہم بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہم کھڑے ہوتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، پر جوش نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہیں، تھرکتے ہیں، متاثر ہو جاتے ہیں ، ہمیں حوصلہ ملتا ہے ، ہم خوش ہو جاتے ہیں اور اپنے ان تاثرات میں پوری طرح ڈوب جاتے ہیں۔ ہم ان لمحات کو ساری زندگی بھلا نہیں پاتے۔ ایک پل کے لئے آپ ماضی کے اس لمحے میں جائیں جب آپ نے ان سب تاثرات کو محسوس کیا تھا اور کیسے آپ کا ردِ عمل بے ساختہ اور فطری تھا۔

چلئے اب ہم اپنی توجہ کائنات کی طرف موڑتے ہیں۔ ہم ایک شاندار کائنات میں رہتے ہیں۔ ہم پر امید ہیں، پیار کرتے ہیں، انصاف کو مانتے اور انسان کی برتر حیثیت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم توجیہات تلاش کرتے، محسوس کرتے، ردِ عمل دیتے اور نئی دریافتیں کرتے ہیں۔ ہم ایک لا متناہی کائنات میں رہتے ہیں جس میں اربوں ستارے، کہکشائیں اور سیارے ہیں۔ اس کائنات میں آگہی کی غیر معمولی صلاحیت کے حامل اجسام پائے جاتے ہیں۔ ہم غیر مرئی سوچ کا حامل دماغ رکھتے ہیں جو کہ بیرونی مادی دنیا سے تعلق قائم رکھتا ہے۔ کائنات کے قانون اور ضابطے ہیں جن میں زرا سی بھی تبدیلی باشعور زندگی کی نمو کو ناممکن بنا دیتی۔ ہم اپنے اندر گہرائی سے بدی کی مخالفت اور نیکی کی اچھائی کو محسوس کرتے ہیں۔

ہماری کائنات میں جانور اور حشرات ہیں، چیونٹی جیسے کیڑے جو اپنے جسمانی وزن سے کئی گنا وزن اٹھا سکتے ہیں، اور بیج، جو آگ کی گرمی سے نمو پاتے ہیں۔ ہم ایسے سیارے پر رہتے ہیں جہاں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں اور لاکھوں اقسام کے جانداروں کی نسلیں آباد ہیں۔ ہم ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں انسانی دماغ زندگی کو زمین سے فنا کر دینے والے ہتھیار بنا سکتا ہے اور ایسی تباہی کو روک سکنے والے طریقے بھی سوچ سکتا ہے۔ ہم ایسی کائنات میں رہتے ہیں جہاں اگر ان گنت ایٹموں میں سے صرف ایک کو توڑا جائے تو لامحدود توانائی کا اخراج ہوتا ہے۔ ہم ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں اگر دلوں کو جوڑا جائے تو ساری دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

لیکن پھر بھی ہم میں سے کچھ خدا کی، جو کہ ساری کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے، ستائش اور تعریف نہیں کرتے۔ کیا ہم ہر پل، لمحے اور واقعات کو پیدا کرنے والے کی تعریف نہیں کر سکتے؟ ہم بھٹکے ہوئے، فریب کا شکار، اور اس خدا کو بھولے ہوئے ہیں جس نے ہمیں پیدا کیا۔

''اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربِ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے''۔(سُورۃ اِلْاِنْفِطَار، آیت،6)

چار بڑی وجوہات:

خدا سب سے برتر و عظیم اور ہماری تابعداری اور عبادت کا حقدار ہے اسکی تین بڑی وجوہات ملاحظہ فرمائیں:

1۔ خدا کی عبادت کیے جانا اس کی موجودگی/عظمت کا بنیادی حق ہے:

ان سوالات کے جوابات کے لیے لیے یہ بہتر ہو گا کے ہم خدا کی ذات کو عبادت کے تناظر میں سمجھیں. خدا کا مطلب ایک ایسی ذات جو عبادت اور پرستش کے لائق ہو. اور یہ خدا کے ہونے کے لیے ضروری امر بھی ہے کے اس کی عبادت کی جائے. قرآن بار بار ہماری توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرواتا ہے.

''میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تم میری ہی عبادت کرو اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو'' سورہ طٰہٰ آیت نمبر ١٤

چونکہ خدا کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ ذات جو ہماری عبادت کے لائق ہے، لحاظہ مخلوق کی تمام تر عبادتوں کا محور اسی ذات کو ہونا چاہیئے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق اللہ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ اسکی ذات اقدس بہترین ناموں اور صفات کی حامل ہے اور ہر ہر صفت کاملیت کی انتہا تک پہنچی ہوئ ہے۔ جیسا کہ اسکی ایک صفت ''الودود'' ہے جس سے مراد نہایت محبت کرنے والے کے ہیں اور اس سے بڑھ کر کوئ محبت نہیں کر سکتا۔ انہی صفات کی وجہ سے یہ اللہ کی ذات کا حق ہے کہ اسکی عبادت کی جائے۔ ہم ہمیشہ اچھے اخلاق، علم اور وجدان کے حامل لوگوں کی تعریف کرتے ہیں، خدا تعالی کی ذات جو کہ الرحم الراحمین ہے، العلیم ہے اور الحکیم ہے، ہر نقص سے پاک ہے، وہ کیوں کر مخلوق کی ہمہ وقت حمد وثنا کی حقدار نہ ہو گی، یہی حمد وثنا/تعریف عبادت ہی کی ایک شکل ہے. وہ علیم وخبیر ذات ہے جس کو اپنی قدرت سے یہ معلوم ہے کہ اس کی مخلوق کے لیے کس امر میں بھلائی ہے اور وہ اپنے بندوں کے بارے میں خیر چاہتا ہے لہٰذا یہ صرف ایسی ذات کا ہی حق ہے کہ اس سے مناجات کی جائیں اور اس کو حاجت روا مانا جائے. خدا ہماری عبادات کا حقدار ہے کیوں کہ خدا میں ایسا کچھ ہے جو کہ اسے اس کا حقدار بناتا ہے۔ اس کے نام اور صفات ہر لحاظ سے کامل ہیں۔

خدا کی عبادت کرنے کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ ملحوظ رہے کہ وہ ہماری عبادت کا حقدار ہے اگر ہمیں اس کی طرف سے کوئی راحت نا بھی ملے۔ خدا کا معبود ہونا اس کا رحم کرنے والی صفت سے مشروط نہیں ہے۔ خدا کی عبادت کو دوطرفہ تعلقات کے تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا کہ اس نے ہمیں اچھی زندگی عطاء کی اور ہم بدلے میں اس کی عبادت کرتے ہیں۔ خدا کی عبادت کسی گیو اینڈ ٹیک ریلیشن شپ کی بنیاد پر نہیں ہے۔ اگر ہماری ساری زندگی مصیبتوں میں بھی گزرے، پھر بھی اسکی عبادت ضروری ہے، خدا کی ذات کی پرستش صرف اس لیے ضروری نہیں ہے کہ اس نے ہمیں

طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے بلکہ یہ اس کی ذات کی عظمت ہے جو اس بات کی متقاضی ہے کے اس کی عبادت کی جائے.

2۔ خدا ہر چیز کو پیدا اور قائم کرنے والا ہے۔

خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ اسی نے کائنات کو قائم رکھا ہے اور ہمیں اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔ قرآن نے کئی مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا ہے، جو پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں میں خدا کی عظمت اور کبریائی کو بیدار کرتا ہے۔

''وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں''۔ (سورۃ البَقَرَۃ، آیت، 29)

''کیا وہ ایسوں کو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے اور خود پیدا کیے جاتے ہیں''۔ (سورۃ الأعرَاف، آیت، 191)

''لوگو خدا کے جو تم پر احسانات ہیں ان کو یاد کرو۔ کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق (اور رازق ہے) جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس تم کہاں بہکے پھرتے ہو؟'' (سورۃ فَاطِر، آیت، 3)

لہذا، ہر وہ چیز جو ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں، تمام لوازمات جو کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے درکار ہیں، سب خدا کے مرہون ہیں۔ اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ سب تعریفیں خدا کے لئے ہی ہیں۔ جیسا کہ ہم سمیت ہر چیز کو خدا نے پیدا ہے، وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ لہذا ہمیں خدا کی عظمت اور کبریائی کو ماننا ہے۔ چونکہ خدا ہمارا مالک ہے، ہمیں اسکی تابعداری کرنی ہے۔ ان سب سے انکار نا صرف حقیقت سے انکار ہو گا بلکہ یہ انتہا درجے کی نا سمجھی، غرور اور ناشکری ہو گا۔

خدا نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری ذات کی موجودگی اس کی مرہونِ منت ہے۔ ''تم خدا سے کیوں کر منکر ہو سکتے ہو جس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو جان بخشی پھر وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔''(سورۃ البقَرَۃ، آیت، 28)

ہم خود مختار یا اپنے لیے کافی نہیں ہیں، ہم اپنی بقا کو قائم نہیں رکھ سکتے، اگرچہ ہم سے کچھ اس دھوکے میں ہیں کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ہم آرام دہ اور شاہانہ زندگی گزار رہے ہوں یا غربت اور افلاس بھری، ہم ہر لحاظ سے خدا ہی کے بھروسے پر ہوتے ہیں۔ اس کائنات میں خدا کے بنا کچھ بھی ممکن نہیں اور جو کچھ بھی ہو رہا وہ اس کی اجازت سے ہے۔۔ ہماری زندگی میں کامیابیاں اور جو بڑی چیزیں ہم نے حاصل کیں وہ بنیادی طور پر خدا ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ خدا نے کائنات میں وہ عوامل پیدا کیے جب کی بنیاد پر ہم کامیابی حاصل کرتے ہیں اور اگر خدا کی مرضی شامل نا ہو تو ہم کبھی بھی کامیابی حاصل نا کر سکیں۔ ہمارے دلوں میں خدا کے لئے احسان مندی اور انکساری کو ابھارنے کے لئے یہ سمجھ ہی کافی ہے کہ ہم ہر چیز کے لئے اس کے محتاج ہیں۔ خدا کے حضور عاجزی اختیار کرنا اور اس کی عنایات کا احسان مند ہونا بھی عبادت کی ہی شکل ہے ہے۔ خدا کی رحمت اور برکات سے انکار کی ایک بڑی وجہ خود انحصاری کا فریب بھی ہے جو کہ صرف غرور اور تکبر کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں اس بات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

''مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے۔ جب کہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے''(سورۃ العَلق، آئت 6-7)

''اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا ﴿۸﴾ اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا ﴿۹﴾ اسے سختی میں پہنچائیں گے ﴿۱۰﴾ اور جب وہ (دوزخ کے گڑھے میں) گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا ﴿۱۱﴾ ہمیں تو راہ دکھا دینا ہے ﴿۱۲﴾''
(سورۃ اللیل، آیت 8-12)

3۔ خدا کی ہم پر بے شمار عنایات ہیں۔

''اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔ کچھ شک نہیں کہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔''(سورۃ اِبراھیم، آیت 34)

ہمیں ساری زندگی خدا کا شکر گزار ہونا چاہئے کیوں کہ ہم اس کی رحمت کا کبھی بھی بدلہ نہیں چکا سکتے۔ دل کی ہی مثال لیجئے۔ انسانی دل ایک دن میں 100,000 بار دھڑکتا ہے جو کہ ایک سال میں تقریباً 35,000,000 بار بنتا ہے۔ اگر ہم 75 سال تک زندہ رہیں تو دل کی دھڑکن 2,625,000,000 بار ہو گی۔ ہم میں سے کتنوں نے کبھی اس دھڑکن کو گننے کی کوشش کی ہو گی؟ کسی نے بھی نہیں۔ اس سب کو گننے کے لئے آپ کو اپنی پیدائش کے دن سے گنتی شروع کرنا ہو گی۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ ایک عام زندگی نہیں گزار سکیں گے کیوں کہ آپ کو دل کی ہر دھڑکن کو اسی وقت گننا ہو گا۔ تاہم دل کی ہر دھڑکن ہمارے لئے قیمتی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی سونے کا پہاڑ تک خرچ کرنے کو تیار ہو گا اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ ہمارا دل ٹھیک طرح سے کام کرتا رہے۔ لیکن پھر بھی ہم اس ذات کو بھول جاتے ہیں اور اس کی نفی کرتے ہیں جس نے دل پیدا کیا اور اس کے ٹھیک طرح کام کرنے کو یقینی بنایا۔ یہ مثال اس بات کو واضح کرتی ہے کہ ہمیں خدا کا احسان مند ہونا چائے اور شکر گزاری کا یہ احساس عبادت ہی کا ایک حصہ ہے۔ اوپر کی مثال صرف ایک دھڑکن کے متعلق ہے۔ ذرا تصور کریں کہ ہمیں خدا نے ہم پر جو دوسری عنایات فرمائی ہیں ان کے لئے ہمیں اسکا کتنا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس تناظر میں دھڑکن کے علاوہ ہر چیز اضافی نفع ہے۔ خدا کی عنایات کو ہم شمار نہیں کر سکتے، اور اگر ہم ان کو گن بھی سکیں تب بھی ہمیں اس صلاحیت کے لئے بھی اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

4۔ آزاد غلام[[The free slave

وجودیت کے اعتبار سے خدا کی عبادت در حقیقت آزادی ھے۔ اگر ھم ایک خدا کی عبادت کا انکار کریں تو پھر ھمیں ایک سے زیادہ خداؤں کے سامنے جھکنا ھو گا۔ ھم اپنی ھی خواھشات اور انا کے پیروکار بن جائیں گے۔ ھر ایک بندہ سوچتا ھے

کہ وہ ٹھیک ھے اور باقی سب غلط اور وہ اپنے نظریات دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرتا ھے۔اس طرح ھم ایک اپنے ہی غلام بن کے رہ جاتے ہیں۔قرآن اس نقطے کو بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی خواہشات کو اپنا رب بنالیا ہے: ''بھلا بتاؤ جس شخص نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہو، تو (اے پیغمبر) کیا تم اس کی ذمہ داری لے سکتے ہو؟ یا تمہارا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں! ان کی مثال تو بس چار پاؤں کے جانوروں کی سی ہے، بلکہ یہ ان سے زیادہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔(سورۃ الفرقان آیت 43،44)

اپنی عبادت بعض دفعہ ہمیں مختلف قسم کے دباؤ، نظریات، معیاروں اور ثقافتوں کی عبادت تک لے جاتی ھے۔ وہ ھمارا مقصود بن جاتے ھیں، ہم ان سے محبت کرنے لگتے ہیں، ان کے بارے میں مزید جاننا چاہتے ہیں اور ھم ہر اس شخص کی اطاعت کرنے لگتے ہیں جو ہمیں یہ مہیا کردے. مثال کے طور پر مادیت پرستی۔ ہم پیسے اور مادی چیزوں سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ ہمارے سارا وقت اور کوششیں مال جمع کے لئے وقف ہیں، دنیا کی کامیابی اور آسائش کا حصول ھماری زندگیوں میں بنیادی اھمیت اختیار کر چکا ھے، اس طرح سے دنیاوی چیزیں ہمیں کنڑول کرنا شروع کرتی ہیں اور خدا کی عبادت کے بجائے ہمیں مادہ پرستی کی طرف لے جاتی ہیں.

جین ایم ٹونگ اور ٹیم کیسر کی طرف سے کی گئی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ نوجوانوں کے درمیان نسل در نسل مادیت پرستی میں اضافہ ہوا ہے—یہ مطالعہ 1976 سے 2007 تک اعداد و شمار پر مبنی تھا اور یہ بہت زیادہ ہے. سماجی عدم استحکام جیسے طلاق، بے روزگاری، نسل پرستی، انتشار کارویہ، زندگی میں عدم اطمینان اور دیگر سماجی مسائل میں اور مادیت پرستی میں کچھ نا کچھ تعلق ضرور موجود ہے.

Twenge JM & Kasser T. Generational changes in materialism (and work centrality, 1976-2007: Associations with temporal changes in societal insecurity and materialistic role modeling.

Personality and Social Psychology Bulletin. 2013,. 39 (7) 883-897(

اس کی تائید ایس۔ جے۔ اوپری کی تحقیق سے ھوتی ھے اس تحقیق کے مطابق اگر بچپن مادیت پرستی میں گزرے تو جوانی میں زندگی سے عدم اطمینان میں اضافہ ھوتا ھے۔

Opree SJ, Buijzen M, & Valkenburg PM. Lower life satisfaction (related to materialism in children frequently exposed to advertising. Pediatrics. 2012,130 (3) e486-e491; DOl: peds.2011-3148. (/10.1542

بے شک ایسی تحقیقات سو فیصد درست نھیں ھوتیں اور اس پر اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت ھے مگر اس سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ھوتی ھے کہ ایسی ترجیحات درست نھیں۔ ہماری پہچان آج کل ہماری ملازمت، آمدنی، دولت اور مال پر مبنی ہے. ہماری پہچان آہستہ آہستہ مادی چیزیں بنتی جارھی ھیں بجائے ہمارے اخلاقی معیارات، بشمول خدا اور دیگر انسانوں سے منسلک اعلی اقدار کے.

لازمی طور پر اگر ہم خدا کی عبادت نہیں کر رہے ہیں تو ھم کسی اور کی پرستش میں مبتلا ھیں۔ یہ ھماری خواہشات، انا، یا مادی چیزیں ھوسکتی ھیں۔ اسلامی تہذیب میں خدا کی عبادت یہ فیصلہ کرتی ھے کہ ھم کون ھیں کیونکہ یہ ھماری فطرت کا حصہ ھے۔ اگر ھم خدا کو بھول کر کسی اور چیز کی عبادت شروع کر دیں تو ایک دن ھم اپنی بھی شناخت بھول جائیں گے:

اور تم ان جیسے نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول بیٹھے تھے، تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ (سورۃ الحشر، آیت 19)

ہماری اپنی سمجھ بوجھ کا تعلق خدا کے ساتھ ہمارے تعلقات پر منحصر ہیں، جو ہماری عبادت اور بندگی سے پیدا ہوتے ہیں. اس معنی میں، جب ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں تو ہم دوسرے 'معبودوں' سے آزاد ہو جاتے ہیں، چاہے وہ ھم خود ھوں یا چیزیں جن کے ھم مالک ھیں یا چیزیں جن کی ھم خواہش رکھتے ہیں.

''اللہ نے ایک مثال یہ دی ہے کہ ایک (غلام) شخص ہے جس کی ملکیت میں کئی لوگ شریک ہیں جن کے درمیان آپس میں کھینچ تان بھی ہے اور دوسرا (غلام) شخص وہ ہے جو پورے کا پورا ایک ہی آدمی کی ملکیت ہے۔ کیا ان دونوں کی حالت ایسی جیسی ہو سکتی ہے؟ (۱۳) الحمدللہ (اس مثال سے بات بالکل واضح ہو گئی) لیکن ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔ (سورۃ الزمر، آیت 29)

خدا لازمی طور پر ہم سے کہہ رہا ہے کہ اگر ہم اسکی عبادت نہیں کریں گے تو ہم آخر کار کسی اور کی عبادت کرنے لگ جائیں گے۔ یہ مادی چیزیں پہلے ھمیں اپنا غلام بنائیں گی پھر ھماری آقا بن جائیں گی۔ قرآن کی مثال بتا رہی ہے ایک خدا کو نہ مان کر ھمیں بہت سے خداؤں کو ماننا پڑتا ھے اور ھر خدا ھم سے کچھ نا کچھ مانگتا ھے اور انکے آپس میں بھی اختلاف ہوتے ہیں جس سے پریشانیوں، الجھنوں اور غموں کی حالت ھمارا مقدر بن جاتی ھے۔ خدا جس کے پاس ہر چیز کا علم ہے وہ ھمارے بارے میں سب جانتا ھے اور رحیم و کریم بھی ہے ھے وہ ھمیں بتا رھا ھے کہ صرف اس کی بندگی ہی ھمیں دوسرے تمام جھوٹے خداؤں سے نجات دلا سکتی ھے جنہوں نے اس سچے خدا کی جگہ لے رکھی ھے

مشرق وسطی کے عظیم شاعر، محمد اقبال نے اس نقطہ نظر اس طرح بیان کیا ھے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ھے

ہزار سجدے سے دیتا ھے آدمی کو نجات

تحریر حمزہ اینڈریس، ترجمہ آرٹیکل از عثمان عمران، محمد نعیم، دانشکس مذہب کا خدا مانیں؟

وجود باری تعالی پر بحث کے دوران وہ لمحہ آتا ہے جب ملحد یہ سوال کرتا ہے: ''اچھا چلو ہم خدا کو مان لیتے ہیں، اب بتاؤ کونسے خدا کو مانیں، مسلمانوں کے، عیسائیوں کے یا پھر ھندوؤں کے؟ ان میں سے ہر کوئی اپنے مذہب کو سچ کہتا ہے'' ان کا یہ سوال ''کیوں'' کے بعد ہے، یعنی اگر انہیں اس پر راضی کر لیا جائے کہ خدا کو ماننا لازم ہے تب وہ یہ سوال کھڑا کرتے ہیں۔ ان کا اس سوال کو کھڑا کرنے کا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ چلو اگر خدا کو ماننا لازم ہے تو وہ کونسا خدا ہے جسے مانیں، اور انکی امید یہ ہوتی ہے کہ اب یہ مذھبی لوگ آپس میں ایک دوسرے کا رد کر کے خود ہی کیوں کو مشکوک بنا دیں گے۔

اس سوال کو دیکھنے کے متعدد زاویے ہو سکتے ہیں، ایک الزامی اور دوسرا اصولی۔ الزامی (یعنی ''منہ بند کراؤ'') پہلو سے گفتگو کرنا یہاں مقصود نہیں، فی الوقت دوسرے پہلو پر کچھ کہنا ہے۔

اس سلسلے میں پہلے اس سوال کا جواب دینا ہوتا ہے کہ اتنے خدا کیسے وجود میں آ گئے۔ مختصر جواب یہ ہے کہ خدا نے اپنی طرف بلانے کے لیے الگ الگ زمانوں میں انبیاء ورسل بھیجے۔ان انبیاء ورسل کی تعلیمات و تصور خدا امتداد زمانہ سے آلودہ ہوتا گیا، پھر اس بگاڑ کو دور کرنے کے لیے نئے نبی اور رسول بھیجے جاتے رہے، محمد ﷺ اسی سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ چنانچہ خدا ایک ہی ہے مسئلہ وقت کیساتھ تصور خدا میں در آنے والے بگاڑ اور تحریف و تبدل کا ہے۔اس کو جانچنے کا ایک طریقہ تو ہے کہ ہر مذہب کی تعلیمات کی سچائی وسند کو پرکھا جائے کہ کونسی اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔اس کے لیے وقت وذوق تحقیق چاہیے، دوسرا طریقہ آسان ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے یہ دیکھیں کہ خدا کے بغیر کائنات اور انسان کے مختلف پہلوؤں کی توجیہہ کیوں نہیں ہوسکتی۔؟ جب یہ واضح ہو جاے تو یقیناً خدا کو ان صفات کیساتھ ہی ماننا پڑے گا جو ان توجیہات کا جواب دیتی ہوں۔ مثلا خالق، مثلار حمن، مثلار حیم ،الاحد،الواحد،اسی طرح البدیع،الفاطر، الرب،المصور،الباری،الروف وغیرہ وغیرہ۔ ورنہ ہم ان صفات کی ضرورت کو کائنات اور انسان میں سے بتا کر معترض سے پوچھیں گے کہ اس فعل کا فاعل کون ہے؟

چنانچہ جب وجہ مان لی کہ خدا کا ماننا اس وجہ سے لازم ہے تو خدا کی صفات اس وجہ کے بعد خود سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً خدا کو ماننا اس لیے لازم ہے کہ مجھے ہر دم اس کی ضرورت ہے۔ تو اب ایسا خدا جو ایک مخلوق کی طرح ہی ہو، میری نہ سنے، یا سننے کے بعد میری مدد پر قادر نہ ہو، میری ضرورت کیسے پورا کرے گا؟اس طرح اس مذہب کا تصور خدا درست ہو گا جو توحید پر قائم ہے کیونکہ کائنات کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ سب ایک ہی منصوبے کا حصہ ہے. اس کی ایک ہی ماخذ سے تدبیر ہو رہی ہے۔ وہ جو الحکیم والعلیم ہے کائنات کی مسلسل نگرانی اور تدبیر کر رہا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کائنات ہر لمحہ وقوع ہو رہی ہے. جو میتھمیٹکس کی انتہا پر قائم ہے، کیونکہ ہمارے آس پاس ہر چیز نہایت نپے تلے پیمانے پر ہو رہی ہے.... مختصراً کائنات کی جس جس آیت /نشانی سے متاثر ہو کر خدا کے وجود کا اقرار کیا جاتا ہے ان تمام صفات کے حامل خدا کا تصور جو نسا مذہب پیش کرتا ہے اسکو مانا جائے گا۔ یہ تصور دین اسلام ہی میں خالص حالت میں موجود ہے۔ یہ خدا کے وجود کے اقرار کے بعد تصور خدا کی درستگی کو جانچنے کا ایک عقلی نقطہ ہے۔

خدا کی واحدانیت [Divine Singularity] – وحی کی مناسبت سے بحث

خدا کی وحدانیت کا ثبوت فراہم کرنے کا ایک سادہ سا طریقہ تو یہ ہے کہ وحی (الہامی کتب) کی طرف رجوع کیا جائے۔اس آرگومنٹ کی بنیاد یہ ہے کہ اگر خدا نے خود کو انسانیت سے متعارف کروایا ہے،اور وحی کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ خدا کی طرف سے آئی ہے تو جو بھی وہ اپنے بارے میں کہتا ہے وہ بھی درست ہو گا۔تاہم،ایک باریک بین اس دلیل میں استعمال شدہ کچھ مفروضات پر سوال اُٹھا سکتا ہے۔ان مفروضات میں خدا کا خود کو انسانیت سے متعارف کروانا اور وحی کا کتاب کی صورت میں ہونا شامل ہے۔

آیئے پہلے آخری مفروضے کا سامنا کرتے ہیں۔اگر خدا نے خود کو انسانیت سے متعارف کروایا ہے تو اس کی جانچنے کے دو طریقے ہیں: اندرونی اور بیرونی۔اندرونی سے میری مراد یہ ہے کہ آپ خدا کو صرف اپنے دل کی آواز سے اور اپنی ذات کے ادراک سے پہچان سکتے ہیں،اور بیرونی سے میری مراد یہ ہے کہ آپ خدا کو اپنی ذات کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے ہونے والے رابطے سے بھی پہچان سکتے ہیں،بہ الفاظ دیگر حقیقی دنیا میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔خدا کو اندرونی ذرائع سے تلاش کرنا درج ذیل وجوہات کی وجہ سے معقول نہیں:

1۔ہر انسان مختلف ہے؛ماہرین نفسیات اس چیز کو انفرادی فرق بھی کہتے ہیں۔ان میں ڈی این اے، تجربات، معاشرتی پس منظر،ذہنی اور جذباتی اہلیت، جنسی فرق،اور دوسرے کئی محرکات شامل ہیں۔یہ فرق ہمارے دل کی آواز اور ذات کے ادراک کی اہلیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اسی لیے سوچنے کے عمل کے نتائج مختلف نکلتے ہیں۔اگر ان تمام عوامل کو صرف اور صرف خدا کی تلاش میں استعمال کیا جاتا،تو نتیجتاً خدا کے حوالے سے ہمارے تصور میں اختلافات ابھر سکتے ہیں۔یہ تاریخی نقطہ نظر سے بھی درست ہے۔6000 سال پہلے قبل مسیح کی قدیم دنیا سے آج تک، خدا کے تقریباً 3700 مختلف تصورات اور نام ہیں۔

2۔ توجب خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے عام فہم طریقہ استعمال کیا گیا ہے، یا جسے فلسفی عقلمندانہ سوچ کہتے ہیں یا جسے مسلمان علماء دل کی آواز کہتے ہیں، تو ایسے میں اُس کی ذات کی تصدیق کی بجائے اگر یہ تلاش کیا جائے کہ خدا کون ہے تو یہ غلط ہو گا۔ دلائل کی بنیاد پر کسی چیز کو ثابت کرنے کی ہماری صلاحیت محدود ہے۔ مجرد سوچ اور ماہیاتی دنیا پر سوچ بچار ہمیں اس نتیجے پر لے جاتی ہے کہ کوئی ہے جس نے یہ سب تخلیق کیا، اور وہ طاقتور ہے، اور علم رکھتا ہے وغیرہ۔ ان نتائج سے آگے سوچنا قیاس آرائی کے مترادف ہو گا۔ قرآن بجا طور پر پوچھتا ہے، کیا تم خدا کے بارے میں وہ کہتے ہو جو تم نہیں جانتے؟ [قرآن: باب 7، آیت 28] ذاتی تجزیے اور اپنی ذات کے ادراک سے خدا کو تلاش کرنا ایسا ہے جیسے کوئی چوہا کسی کہکشاں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس لیے انسان یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کیا ہے۔ خدا ایسا بیرونی وحی کی صورت میں بتا سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل مثال پر غور کریں۔ آپ کا یہ علم کہ خدا کا وجود ہے ایسا ہے جیسے دروازے پر دی گئی دستک؛ آپ بجا طور پر یہ فرض کر سکتے ہیں کہ دروازے کی دوسری طرف کوئی موجود ہے، لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ کون؟ کسی کی آمد متوقع نہیں تھی، اس لیے یہ جاننے کا واحد ذریعہ کہ دروازے کی دوسری طرف کون ہے صرف یہ ہے کہ وہ شخص آپ کو خود بتائے جو دوسری طرف موجود ہے۔ اس لیے آپ اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اگر خدا نے کچھ کہا ہے یا کسی بات کا اعلان کیا ہے، تو یہ انسان کو بیرونی ذریعے سے ہی پتا چلے گا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی قیاس آرائی کے زمرے میں آئے گا۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق یہ بیرونی رابطہ قرآن ہے، کیونکہ یہ وہ واحد تحریری دستاویز ہے جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ یہ خدا کی طرف سے آئی ہے اور الہامی دستاویز کے معیار پر پورا اترتی ہے۔ اس معیار میں شامل ہے:

1۔ اسے دلیل اور دل کی آواز کے ساتھ مطابقت ہونی چاہیے۔ مثال کے طور پر، اگر ایک کتاب کہتی ہے کہ خدا ایک ہاتھی ہے جس کی 40 ٹانگیں ہیں، تو آپ بجا طور پر یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نہیں بھیجی گئی، کیونکہ خدا کا تصور ہی یہی ہے کہ وہ اس دنیا سے ماورا ہے اور خود مختار ہے۔ ایک ہاتھی، قطع نظر اپنی ہئیت کے ایک مجبور

ذات ہے۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ اس کی محدود جسمانی خصوصیات ہیں، جیسا کہ جسامت، شکل اور رنگ۔ ہر چیز جس کی محدود جسمانی خصوصیات ہوں مجبور ہوتی ہے کیونکہ ایسی بیرونی وجوہات ہوتی ہیں جو اس کی حدود بناتی ہیں۔ خدا اجسامی نہیں ہے اور خود مختار ہے۔ اس لیے، کوئی بھی چیز جس کی محدود جسمانی خصوصیات ہوں خدا نہیں ہو سکتی۔

2۔ اسے اندرونی اور بیرونی طور پر یکسا ہونا چاہیے۔ بہ الفاظ دیگر، صفحہ نمبر 20 پر یہ کہا گیا ہے کہ خدا ایک ہے اور پھر صفحہ نمبر 340 پر کہا گیا ہے کہ خدا تین ہیں، یہ ایک اندرونی، ناقابلِ اصلاح تضاد ہے۔ مزید برآں، اگر ایک کتاب کہتی ہے کہ یہ دنیا صرف 6000 سال پرانی ہے تو یہ ایک بیرونی تضاد ہو گا کیونکہ ہم یہ بات حقیقت کے طور پر جانتے ہیں کہ دنیا اس سے کہیں پرانی ہے۔

3۔ اسے انسانی اور عقلی نقطہ نظر سے ماورا ہونا چاہیے۔ وحی میں یہ اشارہ ہونا چاہیے کہ کہ یہ ربانی ہے اور یہ قدرتی طور پر تسلی بخش انداز میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ سادہ الفاظ میں، اس میں یہ ثبوت ہونا چاہیے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔

قرآن میں یہ ثبوت موجود ہیں کہ یہ ایک ربانی دستاویز ہے۔ قوانینِ فطرت کے مطابق اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی؛ اس لیے مافوق الفطرت وضاحتیں ہی بہترین وضاحتیں ہیں۔ ایسے کچھ ثبوتوں میں شامل ہیں:

1۔ قرآن کی لغاتی اور ادبی طور پر نقل ممکن نہیں؛

2۔ قرآن میں بیان کردی کچھ تاریخی واقعات بہ وقتِ وحی انسانی علم کی دسترس میں نہیں تھے؛

3۔ اسکی منفرد ترتیب اور تدوین۔

خلاصہ یہ کہ چونکہ خدا کو جاننے کا واحد ذریعہ بیرونی ہے اور وہ وحی ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ وحی اصلی حالت میں صرف قرآن کی شکل میں ہی موجود ہے۔ قرآن خدا کی صفات و وحدانیت کے بارے میں واضح انداز میں بات کرتا ہے۔ دنیا کے عام مذاہب نے غالباً غیر ضروری سمجھ کر ان سوالات کو نہیں چھیڑا یا چھیڑا بھی تو اس کے مختلف

پہلوؤں کو اتنا روشن نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مختلف زمانوں میں بجائے وحی و نبوت کے عقل و حواس ہی کی اس روشنی میں ان سوالات کو حل کرنا چاہا جو ہمیشہ ''عالمِ غیب'' میں جا کر گل ہو جاتی ہے، نظیروں اور مثالوں کی غلط رہنمائی نے مختلف غلطیوں کے خندقوں میں لوگوں کو گرادیا، مگر قرآن مجید جو غیبی حقائق کی تشریح کی آخری روشنی ہے، اس نے وضاحت کے ساتھ ان سوالات کو اُٹھایا اور وہ جوابات دئے ہیں جنہیں فطرت و عقل بے چینی کے ساتھ ڈھونڈھتی تھی، اس سلسلہ میں جو کچھ کہا جائے گا ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے سے دوسرا مذاہب کی الہامی یادداشتوں میں بھی اس کے تعلق کچھ تسلی مل سکے، لیکن جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے قرآن کریم کا بیان اس باب میں جتنا روشن ہے یقیناً یہ روشنی کسی دوسری جگہ میسر نہیں آسکتی۔

استفادہ تحریر: حمزہ اینڈرئیس کی انگلش کتاب ''دی ڈیوائن رئیلیٹی: گاڈ، اسلام اینڈ دی میرج آف ایتھی ازم''

خدا کی واحدانیت((Divine Singularity

آپ میں سے ہر شخص کی عقل اس بات کی گواہی دے گی کہ دنیا میں کوئی کام بھی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کبھی باضابطگی باقاعدگی سے نہیں چل سکتا جب تک کہ کوئی ایک شخص اس کا ذمہ دار نہ ہو۔ایک مدرسہ کے دو ہیڈ ماسٹر ،ایک محکمہ کے دو ڈائریکٹر ،ایک فوج کے دو سپہ سالار ،ایک سلطنت کے دو رئیس یا بادشاہ کبھی آپ نے سنے ہیں؟اور کہیں ایسا ہو تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک دن کے لیے بھی انتظام ٹھیک ہو سکتا ہے؟آپ اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں اس کا تجربہ کرتے ہیں کہ جہاں کوئی کام ایک سے زیادہ آدمیوں کی ذمہ داری پر چھوڑا جاتا ہے وہاں سخت بدانتظامی ہوتی ہے ،لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں،اور آخر ساجھے کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹ کر رہتی ہے۔انتظام، باقاعدگی، ہمواری اور خوش اسلوبی دنیا میں جہاں کہیں بھی آپ دیکھتے ہیں وہاں لازمی طور پر ایک طاقت کارفرما ہوتی ہے، کوئی ایک ہی وجود بااختیار و اقتدار ہوتا ہے،اور کسی ایک کے ہاتھ میں سررشتہ کار ہوتا ہے۔اس کے بغیر انتظام کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔

یہ ایسی سیدھی بات ہے کہ کوئی شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہو اسے ماننے میں تامل نہ کرے گا۔اس بات کو ذہن میں رکھ کر ذرا اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈالیے۔یہ زبردست کائنات جو آپ کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، یہ کروڑوں سیارے جو آپ کو گردش کرتے نظر آتے ہیں، یہ زمین جس پر آپ رہتے ہیں، یہ چاند جو راتوں کو نکلتا ہے، یہ سورج جو

صبح کو طلوع ہوتا ہے، یہ زہرہ، یہ مریخ، یہ عطارد، یہ مشتری اور یہ دوسرے بے شمار تارے جو گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں، دیکھیے! ان سب کے گھومنے میں کیسی سخت باقاعدگی ہے۔ کبھی رات اپنے وقت سے پہلے آتی ہوئی آپ نے دیکھی؟ کبھی دن وقت سے پہلے نکلتے دیکھا؟ کبھی چاند زمین سے ٹکرایا؟ کبھی سورج اپنا راستہ چھوڑ کر ہٹا؟ کبھی کسی اور ستارے کو آپ نے ایک بال برابر بھی اپنی گردش کی راہ سے ہٹتے ہوئے دیکھا یا سنا؟ یہ کروڑہا سیارے جن میں سے بعض ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑے ہیں اور بعض سورج سے بھی ہزاروں گنا بڑے، یہ سب گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک زبردست ضابطے میں کسے ہوئے اور ایک بندھے ہوئے حساب کے مطابق اپنی اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ اپنے اپنے مقررہ راستے پر چل رہے ہیں۔ نہ کسی کی رفتار میں ذرہ برابر فرق آتا ہے، نہ کوئی اپنے راستے سے بال برابر ٹل سکتا ہے۔ ان کے درمیان جو نسبتیں قائم کر دی گئی ہیں، اگر ان میں ایک پل کے لیے بھی ذرا سا فرق آ جائے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے، جس طرح ریلیں ٹکراتی ہیں اسی طرح سیارے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔

یہ تو آسمان کی باتیں ہیں۔ ذرا اپنی زمین اور اپنی ذات پر نظر ڈال کر دیکھیے۔ اس مٹی کی گیند پر یہ سارا زندگی کا کھیل جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب چند بندھے ہوئے ضابطوں کی بدولت قائم ہے۔ زمین کی کشش نے ساری چیزوں کو اپنے حلقے میں باندھ رکھا ہے۔ ایک سیکنڈ کے لیے بھی اگر وہ اپنی گرفت چھوڑ دے تو سارا کارخانہ بکھر جائے۔ اس کارخانہ میں جتنے کل پرزے کام کر رہے ہیں، سب کے سب ایک قاعدے کے پابند ہیں۔ اس قاعدے میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ہوا اپنے قاعدے کی پابندی کر رہی ہے، پانی اپنے قاعدے میں بندھا ہوا ہے۔ روشنی کے لیے جو قاعدہ ہے اس کی وہ مطیع ہے۔ گرمی اور سردی کے لیے جو ضابطہ ہے اس کی وہ غلام ہے۔ مٹی، پتھر، دھاتیں، بجلی، اسٹیم، درخت، جانور کسی میں یہ مجال نہیں کہ اپنی حد سے بڑھ جائے یا اپنی خاصیتوں کو بدل دے، یا اس کام کو چھوڑ دے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ پھر اپنی حد کے اندر، اپنے ضابطہ کی پابندی کرنے کے ساتھ، اس کارخانے کے سارے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں، اور دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، سب اسی وجہ سے ہو رہا ہے کہ یہ ساری چیزیں اور ساری قوتیں مل کر کام کر رہی ہیں۔

ایک ذرا سے بیج کی ہی مثال لے لیجیے جس کو آپ زمین میں بوتے ہیں۔ وہ کبھی پرورش پا کر درخت بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ زمین اور آسمان کی ساری قوتیں مل کر اس کی پرورش میں حصہ نہ لیں۔ زمین اپنے خزانوں سے اس کو غذا دیتی ہے۔ سورج اس کی ضرورت کے مطابق اس کو گرمی پہنچاتا ہے۔ پانی سے جو کچھ وہ مانگتا ہے وہ پانی دیتا ہے۔ ہوا سے جو کچھ وہ طلب کرتا ہے، وہ ہوا دیتی ہے۔ راتیں اُسے ٹھنڈک اور اوس بہم پہنچاتی ہیں۔ دن اسے گرمی پہنچا کر پختگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس طرح مہینوں اور برسوں تک مسلسل ایک باقاعدگی کے ساتھ یہ سب مل جل کر اسے پالتے پوستے ہیں، تب جا کر کہیں درخت بنتا ہے اور اس میں پھل آتے ہیں۔ آپ کی یہ ساری فصلیں جن کے بل بوتے پر آپ جی رہے ہیں، انہی بے شمار مختلف قوتوں کے بالاتفاق کام کرنے ہی کی وجہ سے تیار ہوتی ہیں۔ بلکہ آپ خود زندہ اسی وجہ سے ہیں کہ زمین اور آسمان کی تمام طاقتیں متفقہ طور پر آپ کی پرورش میں لگی ہوئی ہیں۔ اگر تنہا ایک ہوا ہی اس متفقہ کاروبار سے الگ ہو جائے تو آپ ختم ہو جائیں۔ اگر پانی، ہوا اور گرمی کے ساتھ موافقت کرنے سے انکار کر دے تو آپ پر بارش کا ایک قطرہ نہ برس سکے۔ اگر مٹی، پانی کے ساتھ اتفاق کرنا چھوڑ دے تو آپ کے باغ سوکھ جائیں، آپ کی کھیتیاں کبھی نہ پکیں اور آپ کے مکان کبھی نہ بن سکیں۔ اگر دیا سلائی کی رگڑ سے آگ پیدا ہونے پر راضی نہ ہو تو آپ کے چولھے ٹھنڈے ہو جائیں اور آپ کے سارے کارخانے یک لخت بیٹھ جائیں۔ اگر لوہا آپ کے ساتھ تعلق رکھنے سے انکار کر دے تو آپ ریلیں اور موٹریں تو درکنار ایک سوئی اور چھری تک نہ بنا سکیں۔ غرض یہ ساری دنیا جس میں آپ جی رہے ہیں، یہ صرف اسی وجہ سے قائم ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے سارے محکمے پوری پابندی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر کام کر رہے ہیں اور کسی محکمے کے کسی اہل کار کی یہ مجال نہیں ہے کہ اپنی ڈیوٹی سے ہٹ جائے یا ضابطہ کے مطابق دوسرے محکموں کے اہل کاروں سے اشتراک عمل نہ کرے۔

جو کچھ میں نے آپ سے بیان کیا ہے، کیا اس میں کوئی بات جھوٹ یا خلاف واقعہ ہے؟ شائد آپ میں سے کوئی بھی اسے جھوٹ نہ کہے گا۔ اچھا اگر یہ سچ ہے تو مجھے بتایئے کہ یہ زبردست انتظام، یہ حیرت انگیز باقاعدگی، یہ کمال درجہ کی ہمواری، یہ زمین و آسمان کی بے حد و حساب چیزوں، اور طاقتوں میں کامل موافقت آخر کس وجہ سے ہے؟ کروڑوں

برس سے یہ کائنات یونہی قائم چلی آرہی ہے۔لاکھوں سال سے اس زمین پر درخت اگ رہے ہیں، جانور پیدا ہو رہے ہیں،اور نہ معلوم کب سے انسان اس زمین پر جی رہا ہے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ چاند زمین پر گر جاتا یا زمین سورج سے ٹکرا جاتی۔ کبھی رات اور دن کے حساب میں فرق نہ آیا۔ کبھی ہوا کے محکمے کی پانی کے محکمے سے لڑائی نہ ہوئی۔ کبھی پانی مٹی سے نہ روٹھا۔ کبھی گرمی نے آگ سے رشتہ نہ توڑا۔ آخر اس سلطنت کے تمام صوبے، تمام محکمے، تمام ہرکارے اور کارندے کیوں اس طرح قانون اور ضابطے کی پابندی کیے چلے جارہے ہیں؟ کیوں ان میں لڑائی نہیں ہوتی؟ کیوں فساد برپا نہیں ہوتا؟ کس چیز کی وجہ سے یہ سب ایک انتظام میں بندھے ہوئے ہیں؟اس کا جواب اپنے دل سے پوچھیے۔ کیا وہ یہ گواہی نہیں دیتا کہ ایک ہی خدا اس ساری کائنات کا بادشاہ ہے،ایک ہی ہے جس کی زبردست طاقت نے سب کو اپنے ضابطے میں باندھ رکھا ہے؟ اگر دس بیس نہیں دو خدا بھی اس کائنات کے مالک ہوتے تو یہ انتظام اس باقاعدگی کے ساتھ کبھی نہ چل سکتا۔ایک ذرا سے مدرسے کا انتظام تو دو ہیڈ ماسٹروں کی ہیڈ ماسٹری برداشت نہیں کر سکتا پھر بھلا اتنی بڑی زمین و آسمان کی سلطنت دو خداؤں کی خدائی میں کیسے چل سکتی تھی؟

پس واقعہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ دنیا کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنی ہے بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کو ایک ہی نے بنایا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ حاکم ایک ہی ہے۔انتظام کی باقاعدگی صاف کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک کے سوا کسی کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات نہیں ہیں۔ضابطہ کی پابندی منہ سے بول رہی ہے کہ اس سلطنت میں ایک حاکم کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا۔ قانون کی سخت گیری شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی بادشاہ کی حکومت زمین سے آسمان تک قائم ہے۔چاند، سورج اور سیارے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔زمین اپنی تمام چیزوں کے ساتھ اُسی کے تابع فرمان ہے۔ ہوا اسی کی غلام ہے۔پانی اسی کا بندہ ہے۔دریا اور پہاڑ اسی کے محکوم ہیں۔درخت اور جانور اسی کے مطیع ہیں۔انسان کا جینا اور مرنا اسی کے اختیار میں ہے۔اس کی مضبوط گرفت نے سب کو پوری قوت کے ساتھ جکڑ رکھا ہے۔ کوئی اتنا زور نہیں رکھتا کہ اس کی حکومت میں اپنا حکم چلا سکے۔

در حقیقت اس مکمل تنظیم میں ایک سے زیادہ حاکموں کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ تنظیم کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ حکم میں ایک شمہ برابر بھی کوئی دوسرا حصہ دار نہ ہو۔ تنہا ایک ہی حاکم ہو اور اس کے سوا سب محکوم ہوں۔ کیونکہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں فرمانروائی کے ادنیٰ سے اختیارات ہونے کے معنی بھی بد نظمی اور فساد کے ہیں۔ حکم چلانے کے لیے صرف طاقت ہی درکار نہیں ہے، علم بھی درکار ہے۔ اتنی وسیع نظر درکار ہے کہ تمام کائنات کو بیک وقت دیکھ سکے اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ کر احکام جاری کر سکے۔ اگر خداوند عالم کے سوا کچھ چھوٹے چھوٹے خدا ایسے ہوتے جو نگاہِ جہاں بیں تو نہ رکھتے، لیکن انہیں دنیا کے کسی حصے یا کسی معاملہ میں اپنا حکم چلانے کا اختیار حاصل ہوتا تو یہ زمین و آسمان کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی ایسے شخص کو اس میں دخل اندازی کا اختیار دے دیا جائے جو اس سے پوری طرح واقف نہ ہو تو وہ اسے بگاڑ کر رکھ دے گا۔ لہٰذا عقل یہ فیصلہ کرتی ہے، اور زمین و آسمان کے نظام سلطنت کا انتہائی باقاعدگی کے ساتھ چلنا اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس سلطنت کے اختیاراتِ شاہی میں ایک خدا کے سوا کسی کا ذرہ برابر حصہ نہیں ہے۔

یہ صرف ایک واقعہ ہی نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ خدا کی خدائی میں خود خدا کے سوا کسی کا حکم چلنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ جن کو اس نے اپنے دست قدرت سے بنایا ہے، جو اس سے بے نیاز ہو کر خود اپنے بل بوتے پر ایک لمحہ کے لیے بھی موجود نہیں رہ سکتے، ان میں سے کسی کی یہ حیثیت کب ہو سکتی ہے کہ خدائی میں اس کا حصہ دار بن جائے؟ کیا کسی نوکر کو آپ نے ملکیت میں آقا کا شریک ہوتے دیکھا ہے؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ کوئی مالک اپنے غلام کو اپنا ساجھی بنا لے؟ کیا خود آپ میں سے کوئی شخص اپنے ملازموں میں سے کسی کو اپنی جائیداد میں یا اپنے اختیارات میں حصہ دار بناتا ہے؟ اس بات پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ خدا کی اس سلطنت میں کسی بندے کو خود مختارانہ فرماں روائی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایسا ہونا نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے، بلکہ عقل اور فطرت کے خلاف بھی ہے۔ بلکہ حق کے خلاف بھی ہے۔

تحریر سید مودودی

خدااور کوئی کیوں نہیں ہو سکتا؟

کچھ ملحدین یہ آرگومنٹ کرتے ہیں کہ ہم کسی اور کو خدا کیوں نہیں کہہ سکتے ؟ معروف عظیم کدو(GREAT PUMPKIN)اور سپیگٹی شیطان(SPAGHETTI MONSTER) کو خدا کیوں نہیں قرار دیا جاسکتا؟

تبصرہ:

خدا کا موجود ہونا ایک واضح سچائی ہے جسے اجماع کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے۔ واضح سچائیاں، مسلمہ حقیقتیں اور بنیادی عقیدے ثقافت کے پابند نہیں ہوتے ' فطری ہوتے ہیں اور کسی معلومات سے حاصل نہیں کیے گئے۔ جبکہ کوئی شیطان یا خود ساختہ خدا ان سے محروم ہوتا ہے۔

1۔خدا ایک بین ثقافتی عقیدہ[A Cross Cultural Belief]

عظیم کدو اور سپیگٹی شیطان پر یقین کا وسیع فطری رجحان نہیں پایا جاتا، مزید یہ ثقافتی طور پر پابند ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک سپیگٹی شیطان پر ایمان رکھتا ہوں تو مجھے ایک ایسی ثقافت کو لانا ہو گا جہاں سپیگٹی اور شیطانوں کو تعلیم دی جاتی ہو۔ تاہم خدا کا تصور پوری دنیا میں ایک فوق الفطرت اور ملکوتی خالق کا بین ثقافتی تصور ہے

2۔ایک فطری عقیدہ[An Innate Belief]

مسلمہ عقائد اور خود سے واضح سچائیوں کو معلومات کی منتقلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مجھے یہ سمجھنے کے لیے کہ سپیگٹی شیطان کیا ہے، معلومات کی ضرورت ہے جو مجھ تک منتقل کی جائیں۔ ہمارے بہت سے قارئین نے سپیگٹی کا لفظ ہی پہلی دفعہ سنا ہو گا بجائے اسکے کہ اسکو خدا مان لیں۔ لیکن جہاں بات خدا کے وجود کی ہو جو کہ کائنات کا خالق ہے، آپ کو کسی معلومات کی منتقلی کی ضرورت نہیں خواہ وہ ثقافت ہو یا تعلیم۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین سماجیات اور بشریات کا یہ ماننا ہے کہ اگر ملحد بچے کسی ویران ریتلے جزیرے میں پھنس جائیں تو ان کو یہ یقین ہو جائے گا کسی نے اس ریتلے جزیرے کو تخلیق کیا ہے۔

یہ بہت نازک نقطہ ہے کیونکہ ہم بارہا سنتے ہیں ''کہ خدا اور سپیگٹی شیطان میں کوئی فرق نہیں ہے''۔ یہ سچ نہیں ہے۔ اگر آپ خود واضح سچائیوں، مسلمہ اور بنیادی عقائد کو سمجھتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ کسی بھی معلومات کی منتقلی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خدا کے وجود کا بنیادی تصور معلومات کی منتقلی کا محتاج نہیں ہے۔ جبکہ کسی خود ساختہ خدا اور سپیگٹی کے وجود کا خیال معلومات کی منتقلی کا محتاج ہے۔ اس لیے سپیگٹی شیطان ایک خود واضح سچائی نہیں ہے۔

3۔ایک بنیادی عقیدہ[[A Foundational Belief

تیسرا نقطہ یہ کہ بنیادی اور مسلمہ عقائد ایک مربوط دنیا کے نقطہ نظر کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتے ہیں اور لاینحل سوالات کا جواب دیتے ہیں۔مثال کے طور پر خدا کا وجود،اس آگاہی کے ظہور کی تفصیل ہے کہ ہمیں اس مادی دنیا کے اندر شعور حاصل ہے۔یہ ان سوالات کے جواب دیتا ہے جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔یہ اخلاقی سچائیوں کے مقصد کے وجود کی وضاحت کرتا ہے اور ایک بنیاد فراہم کرتا ہے کہ انسان اور کائنات کا مقصد کیا ہے؟خدا کے وجود، ایک مربوط دنیا کی توجیہہ کے لئے ایک بنیاد فراہم کرتا ہے،اہم بنیادی سوالات کا جواب ہے۔ سپیگٹی شیطان یا عظیم کدو پر اعتقاد کسی علم اور اخلاق کی تعلیم کا سبب بننے سے محروم ہیں.

اعتراض: زمین ہموار ہے یہ بھی ایک خود سے واضح سچائی تھی، یہ ایک بنیادی عقیدہ تھا۔ جیسے جیسے سائنس نے ترقی کر چکی ہے، ہمیں پتہ چلا کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔اب ہم یہ جانتے ہیں کہ دنیا گول ہے۔!

تبصرہ: یہ استدلال خدا کے وجود پر لاگو نہیں ہوتا۔ خدا کی تعریف ایک غیر مشاہداتی ہستی ہے جو اس کائنات سے باہر ہے۔مثال کے طور پر، اگر میں ایک کرسی بناتا ہوں تو یقینی طور پر میں کرسی سے منفرد اور جدا رہوں گا۔ میں کرسی سے الگ ہوں۔اسی طرح خالق بھی اس کائنات سے منفرد اور بیرونی ہے۔اسی لیے خالق کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا اس نقطہ نظر سے یہ اعتراض لاگو نہیں ہوتا: یہ صرف ان چیزوں پر لاگو ہوتا ہے جن کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہو۔

سائنس علم کے ایک اصول پر مبنی ہے جس کو تجربیت کہتے ہیں۔آپ کو تجربیت کا علم بلواسطہ یا بلا واسطہ مشاہدے پر مبنی تجربات سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تجرباتی طور پر خدا کو مسترد کرنا ناممکن ہے کیونکہ مشاہدات سے نتائج تک اسے ثبوت کی ضرورت ہے۔ کسی ایسی چیز کا انکار کرنا جس کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا یا علم کے ایک اصول کو استعمال کرتے ہوئے جو

صرف مشاہدات پر مبنی ہو' نتیجہ نکال لینا مضحکہ خیز ہے۔ سائنسی دنیا خدا کے وجود سے کبھی انکار نہیں کر سکتی کیونکہ سائنس صرف ایسی چیزوں سے معاملہ کرتی ہے جن کا آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے فلسفی ایلیٹ سوبر نے اپنے مضمون تجربیت میں اس بات پر زور دیا کہ سائنس ان سوالات کی پابند ہے جن کا جواب مشاہدات ہی دے سکتے ہیں۔ ''ہر صورت میں سائنسدان ان مشاہدات پر محدود ہیں جو ان کے ہاتھ میں ہیں۔ حدود یہ ہیں کہ سائنس اپنی توجہ صرف ان مسائل پر رکھنے پر مجبور ہے جو مشاہدات سے حل ہوتے ہیں۔ ''جب خدا کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ایک مشاہداتی دنیا کا استعمال کرتے ہوئے اسکا انکار کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں جو عمومی رد عمل یہ ہے کہ 'اگر اس کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا، تو پھر اس پر اعتقاد بھی نہیں کیا جا سکتا'۔ یہ ایک غلط دعوی ہے کیونکہ مشاہدے تمام مظاہر کا احاطہ نہیں کرتے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا کہ ہم مشاہدہ نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی اُن پر یقین رکھتے ہیں۔ فلسفی جان کو ٹنگھم نے اپنی کتاب عقلیت میں اس مسئلہ کو اجاگر کیا ہے: ''ایک اضافی اور شاید اس سے بھی زیادہ پریشان کن مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم سائنس کی اعلی سطح تک پہنچتے ہیں تو ہم ڈھانچے اور اداروں کے کسی بھی براہ راست معنوں میں مشاہدہ کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ ایٹمز، مالیکیولز، الیکٹرانز، فوٹانز اور ان جیسے بہت سے اور انتہائی پیچیدہ نظریاتی تشکیل ہیں۔ یہاں ہمیں لگ رہا ہے کہ ہم بہت دور براہ راست 'تجربیت و مشاہدے' کی دنیا سے ہٹا دیے گئے ہوں''۔

چنانچہ وقت کیساتھ کسی مشاہداتی سچائی کے بدل جانے سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ابدی اور غیر مشاہداتی سچائی بھی بدل جائے گی۔

اعتراض: خدا کا عقیدہ کیسے واضح سچائی ہے جبکہ دنیا میں لاکھوں ملحدین موجود ہیں؟

1۔خود سے واضح سچائیوں کا ہر صورت عالمگیری ہونا ضروری نہیں ہوتا:

ان کو انفرادی طور پر بھی رکھا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر اپنی والدہ کو لیجیے؛آپ کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ وہ عورت جس نے آپ کو جنم دیا وہ آپ کی ماں ہے۔اس کے لیے آپ کو گھر میں ڈی۔این۔اے۔ ٹیسٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اور آپ اس حقیقت کو قبول کرتے ہیں کہ وہ آپ کی ماں ہے کیونکہ یہ ایک خود واضح سچائی ہے۔ جبکہ کسی اور کے لیے یہی عورت جس کو آپ ماں بلاتے ہیں وہ چچی، سوتیلی ماں یا گود لینے والی عورت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بنیادی عقائد اور خود واضح سچائی کا عالمگیری ہونا ضروری نہیں۔یہ انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں۔

2۔خدا پر ایمان عالمگیری ہے

دنیا میں ملحدوں کی ایک کثیر تعداد کے باوجود، خدا پر ایمان عالمگیری ہے۔ایک عالمگیری عقیدے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سیارے پر موجود ہر شخص اس عقیدے پر ایمان لائے۔ خدا کے وجود پر بین ثقافتی اجماع یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ خدا عالمگیری ہے۔دنیا میں ملحدوں کے مقابلے میں توحید پرست زیادہ ہیں۔اور تاریخ کی ابتدا سے یہی معاملہ رہا ہے۔ ملحدین کو جواب میں یہ وضاحت کرنا ہو گی کہ خدا خود واضح سچائی نہیں ہے۔ان کو یہ وضاحت دینا ہو گی کہ خدا ابتدائی اعتقاد نہیں ہے بلکہ ثقافتی طور پر پابند ہے اور صرف معلومات کی منتقلی سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

استفادہ و ترجمہ تحریر حمزہ اینڈرئیس:

خدا ایک سے زائد کیوں نہیں ہو سکتے

'توحید' کے عقلی دلائل—سورۃ الفاتحہ کی روشنی میں

۱۔ دلیلِ کبریائی:

اگر خدا ایک سے زائد ہیں تو لازماً یہ سوال پیدا ہو گا کہ وہ طاقت و قوت، اقتدار تصرف اور تدبیر وانتظام کے لحاظ سے چھوٹے بڑے ہیں یا سب کا درجہ برابر ہے؟ اگر وہ چھوٹے بڑے ہیں تو خالق کائنات کے لئے چھوٹا ہونا عیب ہے، کمال نہیں اور عقل سلیم کا کسی دلیل کا تقاضا کئے بغیر بدیہی فیصلہ یہ ہے کہ خدا کو ہر عیب سے پاک ہونا چاہئے اور ہر کمال کا اسے مالک ہونا چاہئے۔ اگر ایک سے زائد یہ مفروضہ خدا درجے میں برابر ہیں تو برابری بھی عیب ہے، کیوں کہ اس صورت میں ایک خدا دوسرے کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ دوسرے کو مغلوب نہ کر سکتا عاجزی اور بے بسی ہے، کمال نہیں۔ بالفرض ان مفروضہ خداؤں میں باہم تصادم نہ بھی ہو تو بھی یہی سمجھا جائے گا کہ انہوں نے ایک دوسرے کو

مجبوراً برداشت کر کے ایک دوسرے پر غالب نہ آسکنے کی اپنی کم زوری کو چھپالیا ہے۔ عیب چھپالیا جائے یا چھپا رہے تو بھی بہر حال عیب ہی رہے گا، کمال میں نہیں بدل جائے گا۔ پس خدا ایک ہے جس کی شان یہ ہے الحمدللہ رب العالمین کہ اللہ ہی تمام کمالات اور تعریفوں کا مالک ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۲۔ دلیل حفظِ اسرار:

حفظِ اسرار سے مراد رازوں اور بھیدوں کی حفاظت ہے کہ دوسرے ان پر مطلع نہ ہوں۔ اگر خدا ایک سے زائد ہیں تو وہ اپنے اسرار اور بھیدوں کو ایک دوسرے سے مخفی رکھ سکتے ہوں گے یا نہیں۔ اگر مخفی رکھ سکتے ہیں تو جن مفروضہ خداؤں سے یہ اسرار مخفی رہے وہ جاہل ہوئے۔ جہل اور لاعلمی خدا کے لئے عیب ہے لہٰذا یہ خدائی سے نکل گئے اور اگر مخفی نہیں رکھ سکتے تو مخفی نہ رکھ سکنے والے مفروضہ خدا عاجز و بے بس ہوئے۔ عاجزی اور بے بسی بھی خدا کے لئے عیب ہے۔ پس خدا ایک ہی جو تمام کمالات کا مالک ہے اور جس کی شان یہ ہے ولایحیطون بشئ من علمہ الا بما شاء (البقرہ ۲۵۵) ''اور وہ (لوگ) اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ وہ جو (خود بتانا) چاہے''۔

۳۔ دلیل تدبیر وانتظام:

اگر خدا ایک سے زائد ہیں تو کائنات کا نظم ونسق چلانے اور سنبھالنے میں ایک دوسرے کے محتاج ہوں گے یا نہیں۔ اگر محتاج ہیں تو ان میں سے کوئی بھی خدا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ محتاج ہونا خالق کے لئے عیب ہے۔ اگر وہ ایک دوسرے کے محتاج نہیں بل کہ سب اپنی اپنی جگہ پر مختار ہیں تو ایک کے سوا باقی خداؤں کا وجود سرے سے فالتو اور غیر ضروری ہو گا، جس کی مخلوق کو ضرورت نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ خدا بے نیاز اور باقی سب اس کے محتاج ہیں عقل سلیم کے اس فطری فیصلے کے عین مطابق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یایھا الناس انتم الفقرآء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید (فاطر ۱۵) ''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی بے پرواہ (اور) تعریف کے لائق ہے۔'' نیز مختارِ کل عقلاً ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اگر مفروضہ متعدد خدا اپنی اپنی جگہ پر مختارِ کل ہیں تو اگر وہ ایک دوسرے کے برابر ہیں، تو برابری عیب ہے، مختارِ کل اگر

عیب کاازالہ نہ کر سکے تو وہ عاجز ہوا۔ عاجزی اور اختیارِ کلی ایک دوسرے کے منافی ہیں اگر یہ مفروضہ مختارانِ کل (خدا) بڑے چھوٹے ہیں تو چھوٹا ہونا بھی عیب ہے، جو مختارِ کل ہوگا وہ ابتدا ہی سے عیب کو اپنے سے دور رکھے گا ورنہ وہ عاجز وبے بس سمجھا جائے گا، عاجزی وبے بسی خدا کے لئے عیب ہے، کمال نہیں حال آں کہ الحمد للہ رب العالمین، اللہ تمام کمالات کا مالک ہے، جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۴۔ دلیل وصفِ امتیازی:

اگر خدا ایک سے زائد ہیں، مثلاً الف، ب اور ج تین خدا ہیں تو ان سب میں کم از کم ایک امتیازی وصف ایسا ضرور ہوگا جس سے وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہو سکیں اور مخلوق کے لئے ان کی شناخت ممکن ہو۔ اب اگر یہ امتیازی وصف کمال والا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان تینوں میں کم از کم ایک وصفِ کمال کی کمی ہے حال آں کہ خدا کو تو تمام کمالات کا مالک ہونا چاہئے اور اگر یہ امتیازی وصف نقص والا ہے، مثلاً ایک نابینا، دوسرا بہرہ، اور تیسرا گونگا ہے تو اس صورت میں بھی تینوں میں سے کوئی بھی خدا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ خدا کو ہر نقص سے پاک ہونا چاہئے، پس خدا ایک ہی ہے جو تمام کمالات کا مالک ہے الحمد للہ رب العالمین، تمام کمالات اللہ ہی کے لئے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۵۔ بُرہانِ تمانع:

اگر خدا ایک سے زائد ہیں تو وہ ایک دوسرے کے کام میں مداخلت کر سکتے ہوں گے یا نہیں۔ اگر ایک خدا دوسرے (مفروضہ) خدا کے کام میں مداخلت کرے اور دوسرا اسے روک نہ سکے تو دوسرا خدا عاجز ہوا۔ اگر پہلا (مفروضہ) خدا دوسرے کے کام میں دخل دینے کی سکت ہی نہ رکھتا ہو تو پہلا خدا عاجز ہوا، حال آں کہ خدا کو ہر عیب سے پاک ہونا چاہئے۔ قبل ازیں دلیل کبریائی میں یہ مذکور ہو چکا ہے کہ اگر برابر مدارج اور مراتب کے مفروضہ خداؤں میں تصادم نہ بھی ہو تو بھی برابر درجے والے یہ خدا دراصل خدا ہیں ہی نہیں۔ لیکن یہ تصادم اور ٹکراؤ ناگزیر ہے کیوں کہ خدا کو تمام صفات وکمالات کا مالک ہونے کی حیثیت سے تکبرّ (برائی) (جتانے) کا حق بھی ہوگا چناں چہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے

حسنیٰ میں ''متکبرّ'' بھی شامل ہے۔ایک سے زائد ایک ہی مرتبے کے متعدد متکبر موجود ہوں توان میں تصادم کا نہ ہونا عقلاً محال ہے، چناں چہ اس تصادم کے نتیجے میں کائنات سرے سے وجود پذیر ہی نہ ہو گی، مثلاً ایک خدا زید کو پیدا کرنا چاہے اور دوسرا پیدا نہ کرنا چاہے تو برابر کے ان خداؤں کے ارادے تو جمع ہو سکتے ہیں لیکن ان کی مرادیں جمع نہیں ہو سکتیں۔اگر دونوں زید کو زندہ کرنا یا دونوں مارنا چاہیں اور دونوں اس کے لئے ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہوں تو ان میں سے کوئی بھی خدا نہ ہو گا اور اگر محتاج نہ ہوں توان میں سے ایک کی ضرورت ہی نہیں جو غیر ضروری ہو گا اسے مخلوق کی اور مخلوق کو اس کی ضرورت نہ ہو گی حال آں کہ خدا تو وہ ہو سکتا ہے کہ سب مخلوق اس کی محتاج ہو اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو پس خدا ایک ہی جس کی شان یہ ہے الحمدللہ رب العالمین، کہ تمام کمالات اللہ ہی کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

۶۔آفاقی دلیل:

چونکہ مشاہداتی دلائل کا سمجھنا لوگوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لئے کلمات ''رب العالمین'' میں ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔رب کا معنی ہے ہر چیز کو بتدریج نشو و نما دے کر اسے درجۂ کمال تک پہنچانے والا۔کائنات اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اس کے تصور ہی سے سر چکرانے لگتا ہے۔روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔اس حساب سے ایک منٹ، پھر ایک گھنٹے، پھر ایک دن اور بعد ازاں ایک سال کی مدت میں روشنی کی رفتار کا اندازہ لگانا کس قدر تعجب خیز ہے!اس کائنات کی وسعت کی پیمائش نوری سالوں میں بھی آسان نہیں۔سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیارے ایک نظام شمسی کو تشکیل دیتے ہیں۔کئی نظام ہائے شمسی ملیں تو ایک کہکشاں (Galaxy بنتی ہے۔کئی کہکشاؤں سے جھرمٹ وجود پذیر ہوتا ہے یہ کائنات بے شمار جھرمٹوں کا مجموعہ ہے۔ہمارا نظام شمسی جس جھرمٹ سے وابستہ ہے وہ بہت چھوٹا ہے اور اس میں کل چودہ کہکشائیں ہیں۔کائنات کی اس وسعت کو سورہ فاتحہ میں دو لفظوں ''رب العالمین'' میں سمیٹ دیا گیا ہے کہ تم اس کائنات کو ایک جہاں نہ سمجھو بل کہ یہ تو کئی جہانوں کا مجموعہ ہے۔جمع میں افراد کا محدود و متعین ہونا ضروری نہیں لہٰذا کائنات کے خارجی مظاہر کا پورا احاطہ عقل کے بس میں نہیں،

اور نہیں تو صرف زمین ہی کو لیجئے اس میں موجود موالید ثلٰثہ (حیوانات، نباتات اور جمادات) اور زمین کے اندر چھپی اشیا کا احاطہ کر لینا اور انہیں ہر حیثیت سے پوری طرح سمجھ پانا ہمارے بس میں نہیں۔ جب مخلوقات کا یہ حال ہے تو خالق کی عظمت کا کیا کہنا! سارے جہانوں کو بہ تدریج نشو و نما دینا اور ان کی تمام ضروریات کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے۔ انسانی مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ اس ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں وہی رب العالمین ہے۔

اللہ کی پیدا کی ہوئی اس کائنات اور اس میں موجود جان دار اور بے جان اشیا پر اللہ تعالیٰ کا جو نظام ربوبیت جاری ہے اس کا احاطہ کرنا تو دور کی بات ہے، انسان صرف ایک لقمے پر ہی غور کرے جو وہ اپنے منہ میں ڈالتا ہے تو اس کے پیچھے لاتعداد اسباب و مُسَبّبات کا سلسلہ کارفرما نظر آئے گا۔ اس وسیع اور محیر العقول نظام ربوبیت کو دو لفظوں ''رب العالمین'' میں سمیٹ کر واضح کر دیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ ہی رب العالمین ہے تو اس کی ذات و صفات میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں۔ سورہ فاتحہ کے بعد باقی سارا قرآن اس ہی سورت کی توضیح و تشریح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت پر دلالت کرنے والے آفاقی مظاہرِ فطرت کی طرف قرآن کریم میں بارہا توجہ دلائی گئی ہے، مثلاً سورہ بقرہ میں ہے کہ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں کے لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں (سامان تجارت وغیرہ) کو لئے ہوئے سمندروں میں چلنے میں اور جو اللہ نے آسمان سے (بارش کا) پانی اتارا ہے اس کے ذریعے مردہ (بنجر) زمین کو زندہ (تروتازہ اور شاداب) کر دینے میں اور آسمان اور زمین کے درمیان مسخر بادل میں عقل مندوں کے لئے (اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کی) نشانیاں موجود ہیں۔ (البقرہ ۱۶۴) ان مظاہر فطرت پر غور کیجئے کہ اگر خدا ایک سے زائد ہیں اور یہ فرض کر لیا جائے کہ کائنات کی تخلیق کے موقع پر ان میں کوئی تصادم نہیں ہوا تھا تو یقیناً ہر ایک کی مخلوق الگ الگ ہو گی اور خدا چوں کہ متکبر بھی ہیں لہٰذا زود یا بدیر ان میں تصادم ناگزیر ہے، چناں چہ اس کو (مثلاً) سورۂ مومنون میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے لئے کوئی اولاد اختیار نہیں کی اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ورنہ ہر معبود (خدا) اپنی اپنی مخلوق کو الگ الگ لئے پھرتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔ یہ (مشرکین اللہ کے متعلق) جو کچھ بتاتے ہیں وہ اس سے پاک ہے (المومنون ۹۱) اور مثلاً سورۂ انبیاء میں ہے کہ اگر آسمان

اور زمین میں اللہ کے سوااور معبود بھی ہوتے تو یہ دونوں (آسمان وزمین) درہم برہم ہو جاتے پس اللہ عرش کارب ہر اس چیز (عیب اور نقص) سے پاک ہے جو یہ (مشرکین اس کے متعلق) بیان کررہے ہیں۔ (اس کی خود مختاری کا تو یہ حال ہے کہ) وہ اپنے کاموں کے لئے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور وہ (سب کے سب اس کے آگے) جواب دہ ہیں۔ (الانبیاء ۲۳)

اب دیکھئے کائنات ایک خارجی حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ یہ خارجی کائنات ایک ہی ہے اور اس کے تکوینی قوانین باہم مربوط ہیں۔ کائنات اضداد کے باوجود رواں دواں ہے اور اس کے انتظام میں کوئی خلل نہیں، مثلاً اجرام فلکی ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں لیکن اس کشش میں ایسا توازن ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے بھی ہیں یعنی ان میں قوتِ جذب بھی ہے اور قوت طرد بھی ہے۔ ان دونوں متضاد قوتوں میں ایسا توازن ہے کہ یہ نہ تو آپس میں ٹکراتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے دور جانکلتے ہیں۔ اس وسیع کائنات میں حسن ہے۔ قوانین فطرت لگے بندھے ہیں جس کی وجہ سے کائنات میں نظم وترتیب ہے۔ اگر برابر کے اختیارات والے کئی منتظم ہوں تو لازماً بد نظمی اور بد ترتیبی پیدا ہو گی اس لئے اگر خدا ایک سے زائد ہوتے اور بالفرض تخلیق کائنات کے موقع پر ان میں اختلاف نہ بھی پیدا ہوا ہوتا تو بھی بعد کے مراحل میں کائنات کا حسن اور باہم مربوط ہونا تو ایک طرف رہا یہ تباہ اور خستہ حال ہوتی۔ قوانین فطرت میں نہ باہم موافقت ہوتی اور نہ ہی یہ قوانین ایک ہی بالائی قوت کے سامنے مسخر نظر آتے۔ سورۂ ملک میں ہے کہ تو رحمن (اللہ تعالیٰ) کی تخلیق میں کوئی بے ضابطگی نہیں پائے گا تو دوبارہ نظر ڈال کر دیکھ لے کیا تجھے کوئی شگاف نظر آرہا ہے؟ پھر دہرا کر دو دو بار نظر ڈالے، تیری آنکھ تیری طرف ذلیل (عاجز) ہو کر تھکی ہوئی لوٹ آئے گی (الملک ۳۔ ۴) اور مثلاً سورۂ یٰس میں ہے کہ سورج کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے اور یہ سب (اجرام سماوی) فلک میں تیر رہے ہیں۔ (یسین ۴۰) پس یہ مشاہداتی اور آفاقی دلائل بھی ثابت کررہے ہیں کہ اللہ ایک ہی ہے۔

انسان خدا کو کیوں نہیں سمجھ پاتا؟

انسان نے سب سے زیادہ خدا کی پہیلی کو بوجھنے کی کوشش کی کہ خدا کیا ہے؟ لیکن آج تک بوجھ نہ سکا۔ اس کے دو مطلب ہی نکل سکتے ہیں، ایک یہ کہ یہ بحث ہی لاحاصل ہے کیونکہ خدا ہوگا ہی نہیں، دوسرا یہ کہ اگر خدا ہے تو اتنے پردوں میں ہے کہ اس کو جاننا مشکل ہے۔

پہلی بات کی تردید میں وجود کے بارے میں کیوں در کیوں کے اتنے سوال ہیں کہ ہر اسکالر بے بس ہو جاتا ہے۔ اگر دوسری بات درست ہے تو پھر، انسانوں کی عظیم اکثریت کیوں خدا پر یقین رکھتی ہے؟ اتنی بڑی تعداد میں انسانوں کے ذہن میں خدا کا تصوّر ہے ہی کیوں؟ کیا اس کی کوئی سائنسی تشریح ہے؟

خدا کے بارے میں میں نے بھی بہت سوچا اور یہ خیال جاگزیں ہوا کہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ ایک عظیم خالق جو ہر طرح کی تخلیق اور ہر طرح کی سائنس پر قادر ہو، وہ انسان کو اپنے بارے میں بھٹکتا چھوڑ دے۔ انسان کسی نہ کسی طور اس کو طبعی بنیادوں پر بھی پہچان سکتا ہوگا کیا اس گتھی کو سلجھایا جا سکتا ہے؟ لیکن خدا کو جاننے میں تو انسان اب تک بے بس ہی رہا ہے، اس لیے کیوں نہ اس سوال کو نظر انداز کر کے ہم ایک دوسرے نسبتاً آسان سوال کا جواب نہ تلاش کریں، وہ یہ کہ:

کیا ہم علمی یا سائنسی طور پر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم خدا کو کیوں نہیں جان سکتے۔؟

یہ متبادل سوال ہے۔ اگر اس سوال کا ہی مناسب عقلی، علمی اور منطقی جواب مل جاتا ہے تو ہمارے تجسس کو کچھ تسکین مل جائے گی۔ گویا اب ہمارا سوال کہ خدا کیا ہے یا اس کو کس نے بنایا کے بجائے یہ ہوا کہ: ہم خدا کو کیوں نہیں سمجھ سکتے؟ اس سوال کا مناسب علمی اور منطقی جواب ہمیں خدا، کائنات، زندگی اور انسان کا صحیح فہم understanding دے سکتا ہے۔ اور خدا کے بارے میں تشکیک کا عنصر بھی ختم ہو سکتا ہے۔

آیئے اس کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ میرے اس تجسّس کا ماحصل درج ذیل ہے۔

ابھی ہم نے دیکھا کہ کچھ سوالات جب کیوں پر آکر اٹکے تو ہمارا علم بھی وہیں تھم گیا۔ یہ ابھرتے سوالات ایک معقول جواز رکھنے کے باوجود سائنسی طور پر لاینحل ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ سوال ہی کیوں کرتے ہیں کہ کائنات کیوں بنی، انسان کیوں بنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات انسان کے شعور اور ذہن میں کس قانون کے تحت آئے جن کے جواب ندارد ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے جوابات ہوں لیکن ہمیں ان کا علم نہ ہو! گویا ہمیں اپنی کاوش کی ابتدا بالکل بنیاد سے کرنی ہو گی یعنی پہلے زندگی اور پھر خیال کی اساس کی چھان بین کرنی ہو گی۔

مادّے میں زندگی کیوں آجاتی ہے، اس کا جواب سائنس کے پاس نہیں، لیکن مذہب اس کا سبب روح کو بتاتا ہے۔ اس کو مختصراً یوں سمجھ لیں کہ روح جسم کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ بیرونی ماحول سے منسلک لوازمات سے روح کی عطا کردہ زندگی کو برقرار رکھے جیسے انسان آکسیجن اور غذا حاصل کرتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اس بحث میں ''ہم'' کہاں ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ جسم یا روح یا پھر دونوں کا ایک آمیزہ! اس پر پہلے ایک مضمون (خود آگہی: میں کون ہوں) میں بات ہو چکی ہے۔

اب ہم اپنے اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔

ہمارا یہ تاثر یا ادراک کہ ہم سوچ رہے ہیں ہمارے شعور کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ شعور ہی ہمیں یقین دلاتا ہے کہ ہم سوچ رہے ہیں۔ گویا ہمارے افکار اور خیالات کا ادراک ہمارے شعور کی وجہ سے ہے۔ یہاں ہمارے لیے یہ جاننا منطقی ہے کہ: ہمارا شعوری ادراک کس طبعی واسطے سے ہم سے رابطے میں رہتا ہے؟

اس کا سادہ سا جواب یہی ہے کہ یہ ہمارا دماغ ہی ہے جو بظاہر تمام خیالات اور شعور کا منبع ہے۔ کسی بھی چیز کی کارکردگی کا انحصار اس کی ساخت کی ماہیت پر ہوتا ہے جیسے لکڑی کی بنی سائیکل اور لوہے کی بنی سائیکل کی کارکردگی کا فرق۔ اب انسانی شعور کی وسعت دماغ کی ساخت کی ماہیت پر منحصر ہو گی گویا دماغ کا ساختی جوہر شعور کی کارکردگی کی حدودِ کار کی

تشریح کرے گا۔ انسانی دماغ کی ساخت خلیاتی ہے یعنی یہ خلیوں سے مل کر بنا ہے۔ ہر خلیہ کی ایک سرشت intrinsic ہوتی ہے جو جامد یا متعیّن ہوتی ہے۔اسی طرح کسی مرکب یاآمیزے کی جبلّت اس کے بنیادی خلیات کی جبلّتوں کے برخلاف کسی نئی جبلّت پر جامد ہوگی۔اس کو یوں سمجھیں کہ آکسیجن آگ بھڑکاتی ہے لیکن ہائیڈروجن سے مل کر جب پانی بنتی ہے تو ان دونوں کی سرشت بدل جاتی ہے۔اسی طرح پانی میں پیدا ہونے والے خلیات سے جنم لینے والی زندگی کا شعور ایک خاص دائرے میں عمل پذیر ہوگا، برعکس اس شعور کے جو کسی طرح حرارتی یا تنویری light بنیاد رکھتا ہو۔ یہ اہم نکتہ ہے جو کسی حیات کے تخیّلات اور اعمال کے پیرائے ڈیفائن کرتا ہوگا۔اب ہم انسانی شعور اور خیال کی طرف آتے ہیں، انسانی خیال کی بنیاد اس مادّے کے تئیں ہے کہ جس سے دماغ بنا، دماغ جیلی کی طرح ایک گودے کا عضو ہے جو ستّر فیصد پانی ہے،اس کی ساخت خَلیاتی ہے۔اس کے اندر ایک سو بلین نیورون یا اعصاب ہیں جو کھربوں کنکشن کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہاں تک واضح یہی ہوا کہ انسان اپنے دماغ کے بموجب ایک مادّی شعور کا حامل ہے۔

ہمارا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ درخت اور پھول بھی خلیاتی بنیاد رکھتے ہیں مگر کوئی انہونا شعور رکھتے ہیں جس کا ہمیں علم نہیں کیونکہ ہم ان کے دماغ کو نہیں ڈھونڈ پائے۔ چھوئی موئی کا درخت جو ہمارے لمس کا شعور رکھتا ہے اور چھونے پر فوری ردّ عمل میں سکڑ جاتا ہے،ان کے شعور کی زندہ مثال ہے۔ سورج مکھی کا پھول اپنا رخ سورج کی طرف رکھتا ہے، تو یہ بھی شعوری حرکت ہے۔ ہمیں ان کے اندر کسی مرکزی اعصابی عضو یا نظام کا پتہ نہیں لیکن ان کے شعوری طرزِ عمل کے پیچھے کسی ٹیکنیک کا ہونا تو منطقی ہے۔اسی طرح کوئی حیات خلیے اور توانائی کے مرکب سے بھی تو ظہور پذیر ہو سکتی ہے تو اس کے اعصاب اور شعور مخفی بھی ہو سکتے ہیں۔اگر ایٹم میں کوئی محدود شعور ہے بھی تو ہمیں اس کا پتہ نہیں۔ یہاں ہمارا علم فی الوقت رکا ہوا ہے۔اتنا جان کر ہم بھی یہاں رک جاتے ہیں کیونکہ ہمارے سامنے اب ہماری سوچ، خیال اور شعور کی طبعی بنیاد آشکارا ہو گئی ہے کہ انسانی شعور دماغ کا پروڈکٹ ہے اور دماغ خلیات کا مجموعہ ہے،اور اسی سے منسلک ہوئی ہمارے شعور کی حدود کار۔انسانی شعور میں دانش ہے جو حیوانات اور نباتات میں نہ ہونے کے برابر ہے۔اس لحاظ سے

انسانی شعور بقیہ معلوم شعوروں سے برتر ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اگر حیات روح سے متعلق ہے تو شعور کی کارکردگی بھی روح کی ماہیت پر منحصر ہوئی۔ گویا روح بھی مختلف پیرائے کی حامل ہوئی۔

اب آتے ہیں جدید علوم کی طرف کیونکہ اس کی مدد سے ہم اپنے مرکزی سوال کا جواب ڈھونڈیں گے۔

کیا انسان کسی طرح کی ذہانت اور شعور کو بنا پایا ہے؟

جواب یہی ہے کہ اپنے جیسا تو نہیں مگر ہاں انسان نے نہ صرف مصنوعی ذہانت تخلیق کر لی ہے بلکہ اپنے جیسا مشینی انسان بھی بنا لیا ہے۔ انسانی روبوٹ مصنوعی ذہانت رکھتے ہیں اور انسان کے مقرر کردہ پیرائے میں عمل کرتے ہیں۔ انسانی ہیئت کے روبوٹ جنہیں homoid-robot کہا جاتا ہے، فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے قریب پہنچ چکے ہیں.

کچھ حوالہ جات:

1. کچھ مستقبل کے ماہرین یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ اگلے سولہ سال میں روبوٹ انسانی ذہانت کا معیار پا چکے ہوں گے اور اسمارٹ انسان کو پیچھے چھوڑ دیں گے، کچھ کا خیال ہے 2100 تک (ایسا ہو جائے گا)، کچھ بھی ہو یہ نزدیک ہے۔ (خلاصہ)

Some futurists think the singularity — the point at which artificial intelligence can match, and then overtake, human smarts — might happen in just 16 years, while others say by 2100. Either way, it's near.

2. آئی بی ایم نے ڈاک کے ٹکٹ کے برابر ایک سپر چپ بنائی ہے جو انسانی دماغ کی طرح سوچ سکتی ہے۔ اس میں 5.4 بلین ٹرانسسٹر کنکشن ہیں جو انسانی دماغ کے ایک ملین نیورون اور 256 ملین نیورل کنکشن کے برابر کارکردگی کے

حامل ہیں۔ یہ نہ صرف انسانی دماغ کی کارکردگی کی نقل کرتا ہے بلکہ ان کو آپس میں ٹائلز کی طرح جوڑا بھی جا سکتا ہے۔ (خلاصہ)

This Computer Chip Can Think Like a Human Brain

IBM's latest brainlike computer chip may not be "smarter than a fifth-grader," but it can simulate millions of the brain's neurons and perform complex tasks using very little energy. Researchers for the computer hardware giant have developed a postage-stamp-size chip, equipped with 5.4 billion transistors, that is capable of simulating 1 million neurons and 256 million neural connections, or synapses. In addition to mimicking the brain's processing by themselves, individual chips can be connected together like tiles, similar to how circuits are linked in the human brain))

3۔ مشینیں جو جو محسوس کر سکتی ہیں، استدلال اور فیصلہ کر سکتی ہیں، بڑے پیمانے کے مسائل کے حل میں تیزی لائیں گی۔

Machines that can sense, reason, and act will accelerate solutions to large-scale problems.....

ان معلومات کے تذکرے سے جو بات اخذ کرنی تھی وہ یہ کہ غیر معمولی شعور کا مالک انسان اس دور میں علمیت کے ارفع مقام پر پہنچ کر خود بھی ایک طرح کی مصنوعی زندگی کا خالق بنتا جارہا ہے۔

لیکن جو سوال سامنے آرہا ہے، اس کا جواب وہ ہمارے مخمصوں کو ختم کر سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ :

کیا جدید اور ذہین ترین سپر روبوٹ جو مصنوعی ذہانت کا حامل ہوگا اور محدود شعور سے فیصلہ کرنے کے قابل بھی ہوگا، کیا اپنے خالق کو جان پائے گا کہ انسان کیا ہے؟

اس کا سادہ سا جواب یہی ہوگا کہ وہ انسان کے بارے میں اتنا ہی جان پائے گا کہ جتنی معلومات انسان اس کے پروگرام میں مہیّا کرے گا۔ اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ :

کیا انسان روبوٹ کو ایسا ''شعور'' سوفٹ ویئر پروگرام کے ذریعے ٹرانسفر کر سکتا ہے کہ وہ انسان کو ہو بہو جان سکے؟

یہاں پر کامن سینس سے ہی غور کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب جاننے کے لیے ہم سپر روبوٹ کی برین چپ کی طبعی ''جبلّت'' کی طرف آتے ہیں جس کی ساخت میں دھات اہم عنصر ہے جبکہ اس کا خالق انسان سیل یا خَلیات سے بنا ہے جس کی وجہ سے دونوں کی وجودی جبلّت میں تضاد diverse-intrinsic ہے۔ اب اس تضاد کے باعث انسان اپنے متعلق لاکھ ڈیٹا سوفٹ ویئر یا پروگرام میں ڈال دے، وہ ڈیٹا حسابی تشریح تو ہوگا لیکن کسی طرح بھی خلیاتی جبلّت کا کوئی عکس یا پیرایہ نہیں ہو سکتا، سُپر روبوٹ یا سپر کمپیوٹر اپنے ''دھاتی شعور'' کی محدودیت میں ہی اس کا تجزیہ کرے گا۔ سپر ذہین روبوٹ کبھی نہیں جان سکتا کہ انسان کا دیکھنا اور سننا کیا ہے؟ یا اس کے پیرائے کیا ہیں؟ کیونکہ اس جانکاری کا انحصار روبوٹ کے ''شعور'' کی ''فطری ساخت'' پر ہونا تھا کہ روبوٹ کی مصنوعی فکری سرشت انسان کی سرشت سے کتنی ہم آہنگ ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ :

انسان اسی وقت روبوٹ کو اپنی ذات کا حقیقی شعور یا ادراک دے سکے گا جب روبوٹ کی ساخت میں کسی طرح خلیاتی منطقی وصف cell-bound-lojic بھی منتقل کر دے۔ کیونکہ کمپیوٹر پروگرامنگ صحیح۔غلط true-false منطق پر ہوتی ہے۔ ہمارا علم اور استدلال اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ صرف مذکورہ طریقے سے ہی انسان اپنی ذات کے کسی حصّے کا عکس یا شعور روبوٹ کے سوفٹ ویئر پروگرام میں منتقل کر کے اپنی ذات کا ادراک کسی نہ کسی پیرائے میں منتقل کر پائے گا۔ یعنی روبوٹ کی ایسی برین چِپ جو دھات اور حیاتیاتی ریشوں کا مرکب ہو، وہی شاید اس کو انسانی وجود کی کوئی طبعی ڈائمنشن سمجھا سکے، اس کے بغیر انسان سپر روبوٹ کے لیے ایک عدد یا الجبرا کی ایکویشن یا پروگرام کی ایک لائن ہی رہے گا۔

کیا انسان کسی دھات اور زندہ خلیے کی اکائی کو مجتمع کر سکتا ہے؟ کیا انسان ان دونوں کو ملا کر ایک نئی جبلّت تخلیق کر سکے گا؟ جواب یہی ہو گا کہ شاید ہاں! کیونکہ اس ضمن میں تحقیقات اور تجربات جاری ہیں۔

اب اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ انسان میں خدا کا تجسّس کیوں ہے؟

پہلی بات تو یہ طے ہوئی کہ خالق کی مرضی کے بغیر مخلوق اس کو نہیں سمجھ سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو سمجھوانے کے لیے خالق میں یہ قوّت اور صلاحیّت ہونی لازمی ہے کہ تخلیق میں اپنی ذات کا شعور یا کوئی عکس منتقل کر سکے۔ یہی ذات کا عکس اپنی کسی جہت میں خالق اور مخلوق میں رابطے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ایک روبوٹ کو کبھی خود تجسّس نہیں ہو گا کہ اس کو کس نے بنایا لیکن انسان اس سوال میں پریشان اور غلطاں ہے۔ اپنی ذات سے متعلق تجسّس اور سوال انسانی جبلّت میں ڈال دینا ہی کامل خالق کا کام ہے۔ یہی حق تعالیٰ کی عظیم خلاّقی ہے کہ خدا کا خیال خواہ مثبت پیرائے میں ہو یا منفی، ہر انسان کے ذہن اور لاشعور میں کلبلاتا ضرور رہتا ہے۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ ہم خدا کے بارے میں کیوں سوچتے ہیں؟

دیکھیں جناب! انسانی علوم روح کی سائنس نہیں سمجھ پائے تو اس کا انکار کیا لیکن شعور کو جھٹلانا تو مشکل تھا، اس کو مائنڈ mind کہہ کر قبول کیا لیکن اس کی تعریف اور وضاحت کرنی پھر بھی مشکل ہی رہی۔ فلسفی آج بھی مائنڈ باڈی مسئلے mind-body-problem میں اُلجھا ہی ہوا ہے۔ عناصر elements میں روح soul کی آمیزش انہیں حیاتیاتی اکائی living-unit یعنی سیل بناتی ہے، اس طرح انسان کی ساخت دو رُخوں پر ہے۔ ایک خالص طبعی یعنی جسم لیکن دوسرا رخ اس سے ماورا ہے جیسے ہماری روح، خیالات، شعور اور لاشعور وغیرہ۔ اساس کی یہی جوہری ساخت انسانی دماغ کی تخیّل کی جبلّت یا سرشت کو دور خُاکر دیتی ہے۔ اس طرح خیالات کی بیک وقت دو پیرامیٹرز میں عمل پزیری ہوتی ہے، ایک خالص طبعی جبکہ دوسرا ما بعد الطبعی۔ اب سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ انسانی دماغ میں طبعی physical اور غیر طبعی metaphysical ہر دو جبلّت کے حوالے سے آرگومنٹ ابھرتے ہیں جس کی وجہ ہم جان چکے ہیں، کیوں کہ دماغ کا طبعی رُخ اپنی خلیاتی جبلّت کے پرتو اپنے خالق کی ہستی کے پیرائے نہیں جان سکتا، لہذا ہمارے طبعی اعصاب اور حواس اس کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن دوسری طرف دماغ کا روحی رُخ اپنی کسی انجانی وپر اسرار جبلّت کے تئیں ہمیں خالق کے حوالے سے مطّلع کرتا رہتا ہے اور خانۂ لاشعور میں دستک دیتا رہتا ہے۔ گویا ہم خدا کے بارے میں سوچتے ہیں کیونکہ روح کے حوالے سے یہ کوئی فطری سوچ ہوتی ہے۔

اسی سلسلے میں اہم ترین سوال یہ ابھرتا ہے کہ: اگر روح ہے بھی تو اس کی جبلّت میں خدا کہاں سے آگیا؟

یہ ایک مناسب اور مضبوط valid سوال ہے۔ اس کا جواب عقل میں نہیں وجدان میں ہے، لیکن یہ وجدان طبعی بنیاد بھی رکھتا ہے یعنی ایک کتاب! یہاں قرآن کی اس آیت کا تذکرہ بر محل ہوگا جس میں تمام ارواح سے اللہ تعالیٰ نے اپنے خالق ہونے کا اعتراف کرایا تھا۔

''کیا میں تمہارا رب نہیں؟'' ''ضرور، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں''

خالق نے کسی انجانے طریقے سے اپنی ذات کا شعور منتقل کیا تو ارواح نے خالق کو پہچانا اور اللہ کا بطور خالق اقرار کیا۔ یہی اقرار انسانی روح کی جبلّت بن کر خیالات کے منبع میں پیوست ہوا اور ایک لازوال غنائی وِجدان کی طرح ہر ذی نفس کے لاشعور میں سرسراتا اور مترنّم رہتا ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ اس نے آدم میں اپنی روح پھونکی۔ اب یہاں عموماً لوگ گمان کرتے ہیں کہ انسان ہی کی طرح اللہ کی بھی کوئی روح ہے، لیکن ہم یہاں ایک دوسرے زیادہ منطقی نکتے سے غور کرتے ہیں کہ اللہ انسانی شعور سے بالا لامحدود پیرایوں کی ایک ہستی life-with-infinite-dimensions ہے جس کا کوئی پیرایہ یا گوشہ روح بھی ہے۔ اس طرح ہمارے خالق نے اپنی ذات کا شعور اس پیرائے کے ذریعے انسان میں منتقل کیا۔ اسی بنیاد پر ہم یہاں غور کر رہے ہیں۔

ہمیں اس سوال کا مناسب اور منطقی جواب بھی مل گیا کہ ہم خدا کے بارے میں کیوں سوچتے ہیں!

ایمان، عقیدہ، مادیّت:

اب ایک اہم فیکٹر آتا ہے وہ ہے یقین کا۔ یہاں ایمان اور عقیدے کا اہم کردار ہے۔ ہمارا یقین بھی اپنی ایک بنیاد رکھتا ہے اور اس کا تعلق بھی ہمارے شعور کے دو رخوں سے ہے۔ جو انسان صرف فزکس یعنی مادّیت میں ایمان و یقین رکھتا ہے، اس کے شعور کا طبعی رُخ بہ نسبت روحی رُخ کے زیادہ فعّال ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی خیال کو طبعی شواہد کے تئیں رد اور قبول کرنے کی سرشت رکھتا ہے۔ اس کے مقابل ایک متوازن عقیدہ مادّی اور روحی دونوں رخوں سے ہم آہنگ ہوگا۔

☆انسان خدا کو کیوں نہیں سمجھ پاتا؟

اور کیوں جان بھی لیتا ہے؟

اب تک کی بحث سے ہمیں یہ جواب ملا کہ ہم خدا کو اس لیے نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارا خلیاتی شعور-cell-bound consciouness بظاہر لامحدود پرواز رکھنے کے باوجود عدم کے پیرامیٹر سے ''نیم ہم آہنگ'' -partly compatible ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ فی الوقت انسان کی طبعی ساخت کے بجائے اس کی مابعد الطبعی ساخت یا روح اپنی آفرینش کی بنیاد یعنی عدم سے ہم آہنگ ہے، اس لیے جو انسان اس رخ کو قبول کرتا ہے اس کا شعور اُس طرف کھنچتا ہے اور وہ خدا کو مان اور جان لیتا ہے اور جو صرف طبعی پیمانوں اور شواہد میں کائنات اور انسان کا جواز تلاش کرتا ہے، وہ خدا کو نہیں جان پاتا اور مخمصوں اور فلسفوں میں اُلجھ کر منکر بنا رہتا ہے۔

اب دیکھیے کہ ایک منکر خدا سائنسداں یا اسکالر کسی بھی انسان کو محض ایک طبعی جسم سمجھتا ہے مگر اس میں حیات کی توجیہ نہیں دے پاتا۔ جبکہ جو خدا کو مانتا ہے وہ روح کو بھی مانتا ہے اور حیات کی بنیاد بھی روح کو مانتا ہے، اس کا یہ بھی عقیدہ ہو گا کہ اس کی روح کا خالق سے کوئی خصوصی تعلق ہے۔ اس طرح اول الذکّر روحی سگنلز کو نظر انداز اور مسترد کر کے خدا کا منکر تو بن جاتا ہے لیکن کائنات کے بے شمار سوالات کے جواب کے بارے میں مستقل مخمصوں میں گرفتار رہتا ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف مذہب پر ایمان رکھنے والا انھی روحی اشارات کو قبول کرتا اور اس راہ پر بڑھ کر ایک متوازن فطری دور خُی سوچ کا حامل ہو جاتا ہے جس میں اس کو ہر سوال کا منطقی جواب ملتا ہے۔

گویا مذہب انسان کو اس کے دونوں رخوں سے متعارف کرا کے ایک مطمئن شعور عطا کرتا ہے جبکہ دہریت صرف مادّی نظریات کی پروردہ ہو کر انسان کو بھٹکائے رکھتی ہے اور انسان مابعد الطبعیات سے متعلق سوالات کے جواب کے بارے میں مخمصوں میں ہی اُلجھا رہتا ہے، آج کل کے جدید لادینی فلسفے اور سائنسی نظریات یہ اقرار کرتے ہیں کہ حیات، انسان کی ابتدا، اس کا شعور اور خیالات thoughts/راز mysteries ہیں۔

☆ فلسفے، نظریات اور ازم:

مختصراً روح کو کُلّی مسترد کرنے والے اپنے وجود کی روحی سمت کا دروازہ بہت سختی سے بند کر کے ایک شعوری قفل mind-lock لگا دیتے ہیں جس کے نتیجے میں مادّیت پرست ہو کر ملحد بن جاتے ہیں، جبکہ کچھ اصحاب ہیں جو اس غنائی وِجدان کی سرسراہٹ سے کبھی کبھی بے خود بھی ہو جاتے ہیں، اس لیے خدا کا انکار بھی نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ فطری طور پر ہر چیز کا جواز اور منطق ڈھونڈتے ہوئے طبعیات اور مادیّت کے خوگر تو ہو جاتے ہیں لیکن اندر روح کی طرف سے آنے والے فطری اشاروں کو بھی نظرانداز نہیں کر پاتے۔ ایسے انسانی گروہ اس مخمصے کی صورتحال میں ایک درمیانہ راستہ نکال کر اپنے آپ کو اس طرح مطمئن کر لیتے ہیں کہ مذہب کو دقیانوسی بھی قرار دیتے ہیں اور خدا کے منکر بھی نہیں ہوتے! کائنات اور انسان کی ابتدا کے حوالے سے تذبذب کا شکار یہ دوست اپنے مخمصوں کو جدیدیت کی نقاب پہنا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مختلف تعریفوں اور نام کے ''ازم'' اور فلسفوں کے بموجب خدا کو ذاتی مسئلہ قرار دے کر اسلام کی آفاقیت کی مخالفت کرتے ہوئے یہ اصحاب مذہب کے گلے سے بھٹکی ہوئی بھیڑیں ہیں جو اپنے مخمصوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے مذہب کے بجائے مذہبی عقائد، علماء اور رسوم کو اپنی تنقید کی زد میں رکھتے ہیں۔ ان پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ:

صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں!

-

حاصل مطالعہ یہی ہے کہ خدا ایک زندہ ہستی ہے جو صاحب ارادہ اور لامحدود صفات کی حامل ہے۔ یہ بھی ہم ابھی سمجھ چکے ہیں کہ ہمارے شعور کے محدود پیمانوں کے مطابق عدم میں موجود زندگی اگر نور یا نور علیٰ نور ہے یا اس بھی برتر اور جدا ہے تو اس کے پیمانے انسان اپنی جبلّی ساخت اور خلیاتی عقل سے نہیں جان سکتا۔

لیکن۔۔۔ سمجھنے والی بات یہ بھی ہے: کہ انسان خدا کو اتنا ضرور سمجھ سکتا ہے کہ جتنا انسان خود چاہے، لیکن سمجھ کا یہ پیمانہ انسان کی طلب اور خالق کی عطا پر منحصر ہے، دلیل اس کی اللہ کا فرمان ہے کہ: جو اُس کی طرف چل کر جاتا ہے تو اللہ اس

کی طرف دوڑ کر آتا ہے ! تو اللہ کی ذات اور قرآن میں غور کیجیے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر خالق ہی چاہے تو انسان طبعی پیمانوں میں بھی اپنے رب کو پہچان لے گا۔ (واللہ اعلم)

کیونکہ اس کی قدرت لامحدود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان بھی یاد کریں کہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا!

یہ سطور اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کی ہی سعی ہیں۔ کیا آپ جان پائے کہ ہم اللہ کو کیوں نہیں سمجھ پاتے ؟ انسانوں میں مختلف گروہ کیوں ہیں ؟ کیا آپ کے تجسّس کو کچھ قرار آیا؟ وما توفیقی الّا باللہ۔

فیصلہ آپ کا۔

خدا کے نشانات

فرض کریں ایک بہت بڑے صحرا کے بیچوں بیچ دو انسان موجود ہیں۔ایک مومن ہے دوسرا ملحد۔ان دونوں کو صحرا میں کسی تیسرے انسان کے قدموں کے نشان ملتے ہیں۔مومن کہتا ہے کہ ہم دونوں کے سوا بھی کوئی تیسرا انسان اس صحرا میں موجود ہے جس کا ثبوت یہ قدموں کے نشان ہیں۔ مگر ملحد اس بات کا انکار کر دیتا ہے یہ کہہ کر کہ یہ کسی تیسرے انسان کے قدموں کے نشان نہیں ہیں۔ملحد کا جب یہ دعویٰ ہے کہ کوئی تیسرا انسان موجود نہیں ہے تو اس دعوے کے لئے اس کو کچھ باتوں کی وضاحت کرنی پڑے گی۔

۱۔یا تو وہ جانتے بوجھتے دیکھتے اپنی آنکھیں بند کر کے کہہ دے کہ مجھے نشان نظر نہیں آرہے لہٰذا کوئی تیسرا انسان ہو ہی نہیں سکتا۔اس کو ڈھٹائی کہتے ہیں۔

۲۔یا پھر وہ ان قدموں کے نشانوں کی کوئی ایسی سائنسی توجیہ پیش کر دے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ قدموں کے ہو بہو انسانی طرز کے نشان سائنس طور پر (خود بخود) بھی بن سکتے ہیں۔

۳۔یا پھر وہ پورے صحرا کی خاک چھانے۔ایک ایک انچ ایک ایک چپے کی تلاشی لے اور واپس آکر مومن کے سامنے ثبوت رکھ دے کہ دیکھ لو میں نے پورا صحرا چھان مارا۔ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا انسان مجھے نہیں ملا۔

مومن کو اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے کچھ زیادہ خاص کرنے کی ضرورت نہیں۔ قدموں کے نشان جب تک موجود ہیں اس کا یقین پختہ ہے اس کا دعویٰ منطقی ہے۔ مزید کسی ثبوت کی اسے حاجت ہی نہیں۔ ملحد کا مسئلہ خراب ہے۔ قدموں کے نشانوں کو وہ جھٹلا نہیں سکتا اور قدموں کے نشانوں کی کوئی دوسری وضاحت اس کے پاس موجود نہیں۔ ڈھیٹ بن جائے تو اور بات۔ ورنہ قدموں کے نشان کی جب تک کوئی دوسری وضاحت کرنے جوگا نہ ہو جائے اسے اس وقت تک یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اس صحرا میں ہم دونوں کے سوا کسی تیسرے انسان کی موجودگی کے ثبوت پائے جاتے ہیں۔

یہی معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ کائنات کی ہر چیز کی تخلیق میں خدا کے نشان موجود ہیں جن کو جھٹلانا فی الوقت سائنس کے لئے ناممکن ہے۔ جھٹلانے والا ڈھیٹ ہو تو لاعلاج ہے ورنہ سائنس منطق اور دلیل کے مطابق جب تک ان نشانوں کی کوئی دوسری وضاحت سامنے نہ آجائے اس وقت تک خدا کو تسلیم کرنا مذہبی تقاضا ہی نہیں بلکہ انسان کی مجبوری بھی ہے۔

خدا کو ثابت کرنے کے لئے خدا کو مادی حالت میں پیش کرنا ضروری بھی نہیں ہے اور ممکن بھی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ ہم مخلوق ہیں اور وہ خدا۔

اس کی مثال کششِ ثقل سے لے لیجئے۔ کیا سائنس کششِ ثقل کو مانتی ہے؟ جواب ہے جی ہاں۔ بالکل مانتی ہے۔ تو کیا سائنسی کششِ ثقل کو مادی حالت میں پیش بھی کر سکتی ہے؟ تو جواب ہے جی نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔ سائنس صرف منطقی طور پر آپ کی عقل کو یہ بات باور کرواسکتی ہے کہ سیب اور ہر چیز چونکہ نیچے گرتی ہے لہٰذا یہ کششِ ثقل کی موجودگی کا منطقی ثبوت ہے۔

یعنی سائنس کو کششِ ثقل کے وجود کا یقین محض اس کی خصوصیات کی بناء پر ہے۔

پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا کششِ ثقل کو ڈھونڈا جا سکتا ہے؟ سائنس کہتی ہے کہ کششِ ثقل زمین کے بیچوں بیچ ہے ۔تو کیا خیال ہے آپ کا کہ اگر میں زمین کھودتا ہوا زمین کے بیچ میں پہنچ جاؤں تو کششِ ثقل مل جائے گی؟ ایک ایک ذرہ زمین کا الگ الگ کر دیجئے۔ کششِ ثقل نہیں ملے گی۔ وہاں بھی نہیں ملے گی جہاں سائنسدانوں کا دعویٰ ہے کہ یہیں ہے ۔یہی ہے مرکز کششِ ثقل کا۔ تو پھر کیا کششِ ثقل کا انکار کر دیا جائے گا؟ جی نہیں۔ ماننا پھر بھی پڑے گا۔ جب تک زمین کی کشش ختم نہیں ہو جاتی آپ کو کششِ ثقل کو اس کی صفات کی بنیاد پر ماننا پڑے گا۔ چاہے وہ آپ کو ملے یا نہ ملے۔

اب فرض کریں میں کہوں کہ کششِ ثقل کو ثابت کرو تو یقیناً سائنسدان میرے سامنے چیزوں کے گرنے کی عقلی توجیہ ہی ثبوت کے طور پر پیش کریں گے۔ پھر بھی اگر میں کمال ڈھٹائی سے انکار کر ڈالوں کہ میں کششِ ثقل کو نہیں مانوں گا اس وقت تک جب تک وہ میرے سامنے نہ آجائے تو مجھ سے چیزوں کے گرنے کی متبادل توجیہ مانگی جائے گی۔ جو مجھے دینی ہی پڑے گی ورنہ اقرار لازم ہے۔

یہی معاملہ خدا کا بھی ہے۔

میں خدا کو کیوں مانتا ہوں اس کا تعلق میرے ذہن میں اٹھنے والے سوالات سے ہے۔

یہ سوالات اسی نوعیت کے ہیں جس نوعیت کے سوالات نے نیوٹن کو گریویٹی کا تصور دیا۔ کیا اس نے گریویٹی کو دیکھ لیا تھا؟ یا پا لیا تھا؟

جی نہیں۔ اس نے گریویٹی کو نہیں سیب کو دیکھا تھا۔ سیب کے نیچے گرنے سے اس نے یہ اندازہ لگایا کہ کوئی نادیدہ قوت ہے جو اشیاء کو زمین کی طرف کھینچتی ہے۔

اس کو منطقی استدلال کہتے ہیں۔ یعنی بغیر دیکھے محض صفات کی بناء پر کسی کے وجود کا یقین کر لینا۔

سوال ہر انسان کے ذہن میں اٹھتے ہیں۔ سوچنا انسان کا خاصہ ہے۔ اسی سوچ کی بنیاد پر وہ تصورات قائم کرتا ہے۔ کسی کی سوچ اور سوالات اسے خدا کے وجود کا یقین دلا دیتے ہیں۔ کسی کی سوچ اور سوالات اسے ملحد بنا دیتے ہیں۔

میرے سوالات جو پہلے تھے وہی آج بھی ہیں۔

میں اشیاء کے رویئے کو بغیر خدا کے وجود کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ جو لوگ ملحد ہو جاتے ہیں وہ یقیناً اشیاء کے رویئے کو خدا کے وجود کے بغیر سمجھ لیتے ہوں گے۔ اسی لیئے وہ ملحد ہو جاتے ہوں گے۔

ابتدائی طور پر میں کچھ مسائل آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ جن کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ انہیں خدا کے وجود کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اگر میں خدا کے وجود کا انکار کر دوں تو پھر یہ دنیا میرے نزدیک اتفاقی حادثات سے بھری پڑی ہے۔ یعنی اس دنیا کا پیدا ہونا, اس میں انسان کا پیدا ہونا, جانوروں کا وجود, کیڑے مکوڑے, پیڑ پودے سب کچھ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ یعنی نہ کوئی خدا نہ کسی خدا کا وجود۔ یہ سارا نظام بغیر کسی خدا کے چلائے چل رہا ہے۔ خدا کے انکار کی صورت میں جو سوال کھڑے ہو جاتے ہیں ان کی تعداد نا قابل بیان حد تک زیادہ ہے۔

اتنے خوبصورت جاندار ہمارے اطراف میں بھرے پڑے ہیں۔ انہیں یہ خوبصورتیاں عنایت کرنے والا کون ہے؟

پھولوں کے اندر خوبصورتی اور خوشبو کا حسین امتزاج کیا بغیر کسی خدا کے موجود ہے؟

پھلوں کے اندر لذت اور خوشبو بے سبب ہے یا اتفاق؟

انسان پانی اور آکسیجن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ دونوں چیزیں نہ ختم ہونے والے نظاموں کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہیں۔

پانی کا پورا واٹر سائیکل ایسے ترتیب دیا گیا ہے کہ اس کے پیچھے کسی ذہین دماغ کا گمان ہوتا ہے۔ یہ پانی ہم بار بار استعمال کرتے ہیں مگر ختم نہیں ہوتا۔ بس اس کا سرکل گھومتا رہتا ہے۔

ہم سانس لیتے ہیں جس میں ہم آکسیجن کشید کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔

تو کیا آکسیجن ختم ہو جائے گی اور ساری آکسیجن کاربن ڈائی آکسائیڈ میں بدل جائے گی؟

جی نہیں۔ اس کا بھی سرکل موجود ہے۔ جو کاربن ڈائی آکسائیڈ ہم خارج کرتے ہیں اسے پودے کشید کر لیتے ہیں اور بدلے میں آکسیجن خارج کر دیتے ہیں۔

یعنی جو ہمیں چاہیئے وہ پودے پیدا کر رہے ہیں اور جو پودوں کو چاہیئے وہ ہم۔ اس پر سائنس کے کیا کہنے کہ ان کے خیال میں ہم خود کبھی پودے تھے۔ سبحان اللہ۔

ایک مضبوط ربط میں سب بندھے ہیں۔

اس دنیا کی ہر چیز آپس میں ایک گہرا ربط اور تعلق رکھتی ہے۔

خوراک کی موجودگی بھی اتفاق؟ جانوروں کی موجودگی بھی اتفاق؟ جانوروں کا خوراک کے بڑھنے کے سائیکل سے تعلق بھی اتفاق؟ سورج کی موجودگی اتفاق؟ چاند کی موجودگی اتفاق؟

خوراک کا منہ میں ڈالنا؟ چبانے کے لیئے دانتوں کی موجودگی؟ نرم کرنے کے لیئے لعابِ دہن؟ ہضم کرنے کے لیئے نظامِ ہاضمہ؟ ہضم شدہ خوراک کا جسم سے خارج ہو جانا۔ اس خارج شدہ فضلے کا پھر خوراک کو پیدا کرنے والی فصلوں سے تعلق۔ سب اتفاقی حادثات ہیں؟

پھر خوراک کے مختلف ذائقے۔ گندم کا ذائقہ اور ہے جو کا اور۔ سیب کا ذائقہ اور ہے آم کا اور۔ کیا یہ سب محض اتفاق ہے ؟

آم کی ضرورت گرمیوں میں ہے تو وہ گرمیوں میں ہی آتا ہے۔ اونٹ صحرا کا جانور ہے اور حیرت انگیز طور پہ صحرا میں پیش آسکنے والی ہر مصیبت سے بچنے کے لئے اس کے جسم میں قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں۔ پانی اور خوراک ذخیرہ کرنے کا نظام۔ ریت پر بھاگنا جہاں کسی دوسرے جاندار کا چلنا محال ہو اور ریت کا طوفان برداشت کرنے کے لئے مخصوص کھال۔ کیا یہ سب اتفاق ہے ؟

گرگٹ کا اپنے دشمن سے بچنے کے لئے رنگ بدلنا اور اس قسم کے تمام جانوروں کے دفاعی نظام کیا ان کے اندر حادثاتی طور پر آ گئے ہیں ؟ پھولوں کے مختلف رنگ ان کی خوشبوئیں سب اتفاق ہے ؟

انسان کے گردوں کا نظام, پھیپھڑوں کا نظام, بالیدگی کا نظام, بچے کی پیدائش کے بعد ماں کے سینے میں دودھ کا اتر آنا, یہ سب ایک اتفاقی حادثے کے سبب ہے ؟ مرد اور عورت کے باہمی تعلق میں انتہا درجے کی لذت جو آبادی بڑھانے کی ترغیب دلاتی ہے, محض ایک اتفاق ہے ؟

پھر ایک معاملہ یہ بھی ہے کہ جس سائنس سے ہمیں امیدیں ہیں کہ کبھی نہ کبھی ہمارے سوالوں کا جواب دے گی۔ وہ ہمیں صرف طریقۂ کار کی وضاحت کر کے مطمئین کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ توجیہات سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں۔

انسانی عقل محض اس بات پر مطمئین نہیں ہوتی کہ یہ کیا ہے کیسے ہے۔ بلکہ وہ اس بات کو بھی کھوجتی ہے کہ یہ کیوں ہے ؟ اور جب انسان ''کیوں'' کے جواب کو کھوجنے نکلتا ہے تو اس کی تلاش اس کے خالق پہ ختم ہوتی ہے۔ ہدایت اسی کو کہتے ہیں۔

ملحد اور مسلمان کی سوچ میں بھی اس ''کیسے'' اور ''کیوں'' کا ہی فرق ہے۔

مثلاً ہم کھانا کیسے کھاتے ہیں ؟ بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے ؟ پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ کیسے پینا ہے ؟ اس علم میں تمام مخلوقات برابر ہیں۔ کیا جانور, کیا ملحد اور کیا مسلمان۔ مگر ''کیوں'' کی کھوج صرف مسلمانوں کا ہی وصف ہے۔

ہم کھانا کیوں کھاتے ہیں ؟ بچہ کیوں پیدا ہوتا ہے ؟ پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتی میں دودھ کیوں تلاش کرتا ہے ؟

پھلوں میں انہی کی افزائش نسل کے لیئے بیج کیوں موجود ہوتے ہیں ؟

ان سوالات کا تعلق خالصاً مذہب سے ہے۔ کیوں کہ اس تلاش کا دوسرا سرا خدا کی ذات ہے۔

سائنس صرف طریقۂ کار کی وضاحت کرتی ہے۔ وجوہات کا تعین کرنا سائنس کا دائرہ کار نہیں۔ یہ مذہب کا دائرہ کار ہے

۔

عموماً الحاد میں اعتراض کیا جاتا ہے کہ مذہبی لوگ جب کسی معاملے کو سمجھ نہیں پاتے تو اس کو خدا پر ڈال کر مطمئین ہو جاتے ہیں جبکہ غیر مذہبی لوگوں کی جستجو ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ حقائق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

مگر میرے الحاد سے ٹکراؤ کے بے شمار تجربوں کا نچوڑ یہ ہے کہ یہ بات اس دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ میں نے جب بھی کسی ملحد سے ''کیوں'' کا سوال اٹھایا ہے اسے بھاگتے ہی پایا ہے۔ بہت کم ملحد ایسے ٹکرے جنہوں نے جواب دینے کی ناکام کوششیں کیں۔ مگر حقیقی معنوں میں کسی بھی کام کے ہونے کی وجوہات کو تلاش کرنے کی کوشش نہ ملحد کرتے ہیں نہ سائنس دان۔ کیوں کہ عقل بتاتی ہے کہ یہ تلاش خدا پر ایمان پہ جا کر ختم ہوتی ہے۔

میں نے کئی مرتبہ ملحدوں سے یہ سوال پوچھا کہ پھلوں کے ذائقے مختلف کیوں ہوتے ہیں ؟ پھل اتنے لذیذ اور ذائقے دار کیوں ہوتے ہیں ؟ کیا قدرتی انتخاب میں یہ ممکن نہ تھا کہ ہر پھل کا ذائقہ گندم جیسا ہی ہوتا ؟ یا ذائقہ سرے سے ہوتا ہی نہ ؟ ضرورت کیا تھی ذائقے کی ؟ جانوروں کے جسموں پہ بنے خوبصورت نقش و نگار۔ پھولوں کے رنگ ان کی خوشبو۔ کیا یہ سب زندہ رہنے کے لئے ضروری تھا ؟

فطری انتخاب لیجئے یا بقائے اصلاح, صرف ضروریات کی وضاحت کی گئی ہے۔ آپ کو بس یہی کہانیاں سننے کو ملیں گی کہ جس چیز کی ضرورت پڑتی چلی گئی وہ خود بخود اگتی چلی گئی اور جو چیز غیر ضروری تھی وہ ختم ہوتی چلی گئی۔

اگر سوال پوچھا جائے کہ ڈائناسارز کیوں ختم ہو گئے؟

تو جواب ملتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے مطابقت نہ رکھ پائے اس لئے ناپید ہو گئے۔

اب اگر پوچھا جائے کہ اونٹ کے اندر صحرا میں پیش آنے والی مشکلات کے لئے خصوصی صلاحیتیں کس نے ڈالیں؟

تو جواب آتا ہے کہ چونکہ وہ صحرا میں پیدا ہوا لہٰذا اس ماحول میں زندہ رہنے کے لئے از خود اس کے اندر یہ صلاحیتیں پیدا ہوتی چلی گئیں۔

یعنی ایک طرف ایک جانور جو ماحول سے مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے ناپید ہو گیا اور دوسری طرف ایک جانور جس نے ماحول سے مطابقت نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو برقرار رکھا۔ بلکہ اس کے اندر خود بخود ایسے اعضاء پیدا ہو گئے کہ وہ صحرا میں زندہ رہ سکے۔

کیا کہئے اس کو کہ ایک جاندار فطری انتخاب کی بھینٹ چڑھ گیا دوسرا بقائے اصلاح کا منظورِ نظر ٹھہرا؟

مجھے تو آج تک یہ بھی نہ سمجھ آیا کہ فطری انتخاب میں فطرت سے کون مراد ہے؟ انتخاب کے لفظ سے لگتا ہے کہ یہ کوئی رینڈم سلیکشن نہیں بلکہ سوچا سمجھا انتخاب تھا۔ کس نے سوچا کہ اونٹ کو باقی رہنا چاہئے اور ڈائناسارز کو ناپید ہو جانا چاہئے؟

صرف ان دو جانوروں کی مثالوں سے کئی سوال جنم لیتے ہیں۔ مگر جواب دینے والا کوئی نہیں۔

سائنس جو کہ عقل سے تعلق رکھتی ہے وہ میرے ایک ہی نوعیت کے پوچھے گئے سوالوں کے دو مختلف اور متضاد جواب کیسے دے سکتی ہے۔

ڈائنوسارز کیوں ناپید ہو گئے؟

کیوں کہ وہ ماحول سے مطابقت نہ رکھ پائے۔

اونٹ کیوں نہ ناپید ہوئے؟

کیوں کہ اونٹوں نے ماحول کی مطابقت سے اپنے اعضاء کو ڈھال لیا۔

او بھائی پھر ڈائنوسارز نے کیوں نہ اپنے آپ کو ماحول میں ڈھال لیا؟

اونٹ صحرا کا جانور ہے جس کو کئی کئی روز بغیر غذا اور پانی کے سفر کرنا پڑتا ہے۔ قدرت نے اس میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی کہ وہ اپنے کوہان میں غذا اور پانی کو اسٹور کر لیتا ہے۔

یہ قدرت کون ہے؟

کسی کو نہیں پتہ۔

یہ کیوں سے متعلق کوئی ایک سوال تھوڑی ہے۔ نہ ہی ہر جانور اپنی پیٹھ پر کوہان لیئے گھوم رہا ہے۔

جتنی مخلوقات ہیں اس سے کئی گنا زیادہ سوال۔ ہر جانور ایک مختلف صلاحیت لیئے گھوم رہا ہے۔

گرگٹ رنگ بدلتا ہے۔ یہ اس کے دفاعی نظام کا حصہ ہے۔ جس چیز پر وہ موجود ہوتا ہے اس کا رنگ اسی جیسا ہو جاتا ہے۔ اس کے دشمن اسے دیکھ نہیں پاتے۔

گرگٹ کے اندر رنگ بدلنے کا یہ نظام کسی انتہائی ذہین دماغ کی فنکاری ہے۔

مگر کس کی؟

کیا آپ کو لگتا ہے کہ گرگٹ اتنا ذہین جانور ہے کہ اس نے خود بخود اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر لی؟

یا یہ بھی قدرت کا کارنامہ ہے؟

اس کا مطلب قدرت اپنے پاس ایک عدد ذہین دماغ بھی رکھتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہر جانور رنگ بدلتا ہے؟

نہیں۔

جتنے جانور اتنے ہی زیادہ دفاعی نظام۔

ایک سے بڑھ کر ایک نظام۔

دریا میں کی ایک مچھلی جس کا نام ''ایل'' رکھا گیا ہے وہ کسی بیرونی لمس پر اپنے جسم میں کرنٹ پیدا کرتی ہے۔

وہی کرنٹ جسے ایجاد کرنے میں انسان کو نہ جانے کتنے عرصے دماغ کھپانا پڑا۔

وہ مچھلی اس کرنٹ کو پیدا کرنے کے لئے کوئی دماغ استعمال نہیں کرتی۔ ایک خودکار نظام ہے۔ آپ بس مچھلی کو چھو لیں وہ کرنٹ پیدا کرنا شروع کر دے گی۔ کرنٹ بھی تھوڑا بہت نہیں بلکہ ہلاکت خیز کرنٹ۔

سانپ کے منہ میں زہر ہوتا ہے جو دشمن کے خلاف بہترین ہتھیار ہے۔

یہ زہر اس کے منہ میں کیسے آیا یہ سائنس کا موضوع ہے۔

مگر کیوں آیا؟

تا کہ وہ اپنا دفاع کر سکے۔

مگر وہ کون ہستی ہے جو ہر ایک مخلوق کو ایک مختلف نوعیت کے دفاعی نظام کے ساتھ پیدا کر رہی ہے؟

سانپ کے پاس تو اتنی عقل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے دفاع کے لئے اپنے اندر کوئی نظام از خود پیدا کر لے۔

یقیناً کسی بیرونی قوت کا دخل ہے۔

مگر وہ قوت ہے کون؟

قدرت؟ ارتقاء؟ یا خدا؟

قدرت بقول ملحدین کے خود بخود کا ہی دوسرا نام ہے۔

اگر یہ سارے دفاعی نظام خود بخود پیدا ہو رہے ہوتے تو ان میں اتنی ورائٹی کیوں ہے؟

سانپ میں بھی زہر ہوتا۔ گرگٹ میں بھی زہر ہوتا اور ایل میں بھی۔

یا

سانپ بھی رنگ بدلتا۔ گرگٹ بھی اور ایل بھی۔

یا

سانپ بھی کرنٹ مارتا گرگٹ بھی اور ایل بھی۔

مسئلہ رویت باری تعالی اور قرآن

قرآن نے مشرکین مکہ کی بھی اس فرمائش کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے فرشتے کیوں نہیں نازل کیے جو ہمارے سامنے آکر آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کی شہادت دیتے کہ یہ شخص دعوائے نبوت میں صادق ہے یا ہم بلا وسطہ اللہ کو

دیکھتے اور بلا وسطہ خود اللہ تعالیٰ سے آپکی بابت پوچھ لیتے اور اللہ تعالیٰ ہم کو خود بتلا دیتا کہ یہ شخص میرا نبی ہے۔ اللہ نے ان کے اس جاہلانہ اور مغرورانہ سوال کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ بڑے ہی سرکش اور متکبر ہیں کہ یہ اپنے آپ کو اس مرتبہ کا سمجھتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ کو دیکھیں اور خود اللہ تعالیٰ سے آپکی بابت دریافت کر لیں یا کوئی فرشتہ اللہ کا پیغام لے کر ان کے پاس آئے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا (سورہ الفرقان آیت 21)

جن لوگوں کو یہ توقع ہی نہیں ہے کہ وہ (کسی وقت) ہم سے آملیں گے، وہ یوں کہتے ہیں کہ: ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے؟ یا پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہم خود اپنے پروردگار کو دیکھ لیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھے ہوئے ہیں۔ (٦) اور انہوں نے بڑی سرکشی اختیار کی ہوئی ہے۔

وفی سورۃ الاسراء

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا (سورۃ الاسراء، آیت 92)

یا جیسے تم دعوے کرتے ہو، آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے ہم پر گرا دو، یا پھر اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے آمنے سامنے لے آؤ۔

گویا کفار و مشرکین نے ایمان لانے کے لیے فرشتوں اور خدا تعالیٰ کو اپنے سامنے لا کھڑا کرنے کی شرط عائد کی۔ اللہ نے فرمایا کہ ان کو فرشتوں سے ملاقات کا شوق ہے تو ہم ان کا یہ شوق بھی پورا کر دیں گے جب ان کی موت کا وقت قریب آئے گا۔ جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس وقت یہ لوگ کہیں گے (ویقولون حجراً محجوراً) کاش ہمارے اور اس خوفناک منظر کے درمیان کوئی آڑ ہوتی اور ہمیں یہ خوفناک منظر دیکھنا نہ ہوتا۔ (ابن کثیر ص ٤١٣ ج ٣) ان لوگوں

نے اپنے دل میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رکھا ہے جو وحی اور فرشتوں کے آنے کی تمنا رکھتے ہیں، باوجود ایسی سیاہ کاریوں کے دنیا میں ان آنکھوں سے خداوند قدوس کو دیکھنے اور شرف ہم کلامی سے مشرف ہونے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

بالفرض فرشتے اگر اپنی اصلی صورت میں آتے ہیں، تو ان کو دیکھنے کی یہ تاب ہی کہاں سے لا سکیں گے۔ اور اگر آدمی کی شکل میں آئیں گے، جیسا بعض اوقات آدمی کی شکل میں آئے بھی، تو یہ کیسے سمجھ سکیں گے کہ یہ فرشتے ہیں۔ پھر ان کو فرشتہ ثابت کرنے کے لئے دوسرے فرشتوں کی ضرورت ہوگی۔ جب یہ فرشتوں کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے اور آدمی کی شکل میں ہونے کی صورت میں ان کو فرشتہ باور کرنے کی سمجھ نہیں رکھتے، تو پھر یہ خدا کو کیسے دیکھ سکتے ہیں، اس لئے کہ کوئی آنکھ نہ تو خدا کو دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے پیش کئے ہوئے معجزات کو اور اس قرآن کو کافی نہیں سمجھا، جس کی نظیر لانے سے تمام انسان اور جن عاجز رہے، تو پھر فرشتوں کو دیکھ لینا ان کے لئے کیسے کافی ہو سکتا تھا؟

☆اللہ کی ذات ایسی ہے کہ:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (سورۃ الانعام آیت 103)

نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں، اور وہ تمام نگاہوں کو پالیتا ہے۔ اس کی ذات اتنی ہی لطیف ہے، اور وہ اتنا ہی باخبر ہے۔

یعنی آنکھیں نہ ہی اسکی ذات کی حقیقت سے واقف ہو سکتی ہیں اور نہ ہی اسکی ذات کا ادراک کر سکتی ہیں۔ تمام مخلوق کی نگاہیں مل کر، تمام خوردبین اور دوربین مل کر بھی اگر کوشش کریں تب بھی وہ نظر نہیں آسکتا۔ ''اے برتر از گمان و قیاس و خیال و وہم''۔ تمام آنکھوں کی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ اتنا عظیم ہے، اتنا مخفی ہے، اتنا غیر مرئی ہے، اتنا غیر محسوس ہے، اتنا نزدیک یا دور ہے، یا اتنا بلند ہے یا اتنا عمیق ہے کہ اس کو آنکھیں پا نہیں سکتیں۔ آنکھیں صرف ٹھوس یا

سیال یا ایک خاص کیفیت کی اشیاء کو پا سکتی ہیں اور وہ بھی ایک خاص فاصلہ پر۔ نہ بہت زیادہ قریب نہ بہت زیادہ دور اور وہ ان سب حد بندیوں سے ورا ہے۔ اسکی ذات وصفات لا محدود ہیں۔ مخلوقات کی بصارت ' بصیرت ' حواس اور قوت ادراک سب محدود ہیں۔ بھلا محدود میں لا محدود کیوں کر سما سکتا ہے۔ چنانچہ تمام عقلا' علماء اور صوفیا کا متفقہ عقیدہ رہا ہے کہ اس فانی زندگی میں حق تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ وادراک ناممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی نظر' انسان کے حواس' اور انسان کا ذہنی ادراک یہ سب قوتیں اسے صرف اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ اس کائنات کے ساتھ تعلق کی نسبت سے اپنے معاملات طے کر سکے اور اس کرہ ارض پر منصب خلافت کی ذمہ داریاں ادا کر سکے اور اس مخلوق کائنات کے صفحات میں وجود باری پر دلالت کرنے والے آثار سے اس کو پہچانے۔ رہی ذات باری کی حقیقت تو وہ اس طاقت ہی سے محروم ہیں جس کے ذریعے وہ اس کا ادراک کر سکیں۔ اس لئے کہ ایک حادث اور فانی وجود کے اندر وہ قدرت ہی نہیں ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ذات کا ادراک کر سکیں۔

معتزلہ اور خوارج نے اس آیت سے یہ اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار اس دنیا میں اور آخرت میں ناممکن ہے۔ الفاظ پر یہ شبہ پیش کیا گیا ہے کہ جب انسانی آنکھیں حق تعالیٰ کی دید کر ہی نہیں سکتیں تو پھر جنت میں اس کی رویت مومنین کو کیسے ہو گی؟ نیز معراج میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کیسے ہوئی؟ مفسرین محققین نے شبہ کو نقل کر کے مفصل وشافی جوابات دیئے ہیں۔ ایک مختصر اور سیدھا جواب یہ ہے کہ یہاں ذکر اس مادی دنیا کے قوی کا ہے۔ جنت میں تو قوی ہی دوسرے ہوں گے عالم دنیا میں نفی دیدار سے جنت کے دیدار کو تعلق ہی کیا؟ دنیا میں دیکھنے کے جو اصول ہیں، آخرت میں رویت الٰہی کے ضابطے اس سے الگ ہیں، الہٰذا ان دونوں میں ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے شرف دیدار سے مشرف کرنا چاہتا ہے تو اس میں ایسی قوت پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ دیدار کر سکتا ہے۔ مثلاً آخرت میں مومنین کو حسب مراتب رویت ہو گی جیسا کہ نصوص کتاب وسنت سے ثابت ہے یا بعض روایات کے موافق معراج کی رات نبی کریمؐ کو۔ لیلۃ الاسراء میں رویت ہوئی علی اختلاف الاقوال لیکن ہمارا ذہن وفکر اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آپ نے اللہ کے نور کا کس حد تک مشاہدہ فرمایا۔

عالم دنیا میں حق تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ اور زیارت نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جب یہ درخواست کی کہ رَبِّ اَرِنِی ''اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیجئے''۔ تو جواب میں ارشاد ہوا کہ لن تَرَانِی '' آپ ہر گز مجھے نہیں دیکھ سکتے''۔ پھر وہ ایک تجلی کی بھی تاب نہیں لا سکے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب یہ جواب ملتا ہے تو پھر اور کسی جن و بشر کی کیا مجال ہے، البتہ آخرت میں مؤمنین کو حق تعالیٰ کی زیارت ہونا صحیح و قوی احادیث متواترہ سے ثابت ہے، اور خود قرآن کریم میں موجود ہے:

وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ''۔(آیت: ۲۲:۲۳)

''قیامت کے روز بہت سے چہرے تر و تازہ ہشاش بشاش ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے''۔

مفسرین سلف میں سے بعض نے ادراک کو احاطہ کے معانی میں لیا ہے یعنی نگاہیں کبھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ احاطہ صرف اس چیز کا کیا جا سکتا ہے جو محدود ہو اور کسی خاص سمت میں پائی جاتی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات نہ تو محدود ہے اور نہ کسی خاص جہت میں موجود۔ اس لئے اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

دنیا میں انسان اور اس کی نظر میں اتنی قوت نہیں جو اس طرح کی رویت کو بھی برداشت کر سکے، اس لئے دنیا میں رویت مطلقاً نہیں ہو سکتی، اور آخرت میں قوت پیدا ہو جائے گی، تو رویت و زیارت ہو سکے گی، مگر نظر میں ذات حق کا ادراک /احاطہ اس وقت بھی نہ ہو سکے گا۔ قیامت کے دن اللہ نظر آئے گا مگر صرف اس کا ایک خفیف رخ۔ اس وقت بھی نگاہیں اس کے جمال و جلال کا احاطہ نا کر سکیں گی، صرف ایک جلوہ نظر آئے گا۔ دنیا میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ایک ہی تجلی میں بیہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ آخرت میں لوگ بے ہوش نہ ہوں گے چونکہ انہیں اتنی طاقت عطا کی جائے گی۔

صحیح مسلم میں حضرت صہیب (رض) کی روایت ہے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب اہل ایمان جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ جو نعمتیں تمہیں جنت میں مل چکی ہیں ان سے زائد اور کچھ چاہیے تو بتائو کہ ہم وہ بھی دیدیں۔ یہ لوگ عرض کریں گے یا اللہ آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات دی، جنت میں داخل فرمایا اس سے زیادہ ہم اور کیا چاہ سکتے ہیں۔ اس وقت حجاب درمیان سے اٹھا دیا جائے گا اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہو گی۔ اور یہ نعمت جنت کی تمام دوسری نعمتوں سے بڑھ کر ہو گی"۔

حضرت ابن عمر (رض) کی ایک روایت ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو جنت میں خاص درجہ عطا فرمائے گا ان کو ہر صبح و شام دیدار الٰہی نصیب ہو گا۔

مختصر یہ کہ اس دنیا میں اللہ کا نظارا ناممکن ہے۔ آخرت میں بھی اتنا ہی کچھ نظر آئے گا جتنی اجازت ہو گی۔ بصارت اور قوت ادراک دونوں اجازت کی حد سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکیں گی۔

کہا جاسکتا ہے کہ دیکھنا تو بغیر جہت اور سمت کے ناممکن ہے، پھر آنکھ میں اور اس چیز میں جس کو دیکھا جارہا ہو، ایک محدود فاصلہ بھی ہونا چاہیے، نہ بہت قرب ہو نہ انتہائی دُوری۔ پھر جس چیز کو دیکھا جائے اس کی کوئی خاص کیفیت بھی ہو، ان شرائط کے بغیر دیکھنا ناممکن ہے اور خدا کی کوئی جہت نہیں، وہ مکانی نہیں، وہ ہر کیفیت اور مکانی قرب و بعد سے پاک ہے، اس کو کیسے دیکھا جاسکتا ہے؟ یہ حاضر پر غائب کا قیاس ہے، ایسا نہ کرنا چاہیے۔ یہ شرطیں اس وقت دیکھنے کی ہیں اور مخلوق کو دیکھنے کی ہیں۔ خدا کو دیکھنا اور وہ بھی آخرت میں دیکھنا اپنی نوعیت جدا رکھتا ہے۔

آج ملحد بھی ایٹم، بجلی، پروٹون اور نیوٹرون کی بات کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اپنی زندگی کے اندر ایٹم، کوئی برق، کوئی نیوٹرون اور کوئی پروٹون نہیں دیکھا ہوا، اس لئے کہ زندگی کی ماہیت کو دیکھنے کی دوربین ابھی تک وجود میں نہیں آسکی۔ سائنس دانوں کے نزدیک یہ امور بہرحال مسلم ہیں اور وہ انکے وجود کو فرض کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے ان چیزوں کے کچھ آثار متعین کر لئے ہیں۔ جب وہ آثار پائے جاتے ہیں تو ان لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ

موجود ہیں اور کائنات بھی موجود ہے حالانکہ یہ صرف احتمال ہے کہ جس طرح انہوں نے فرض کیا ہے کائنات اسی طرح ہو۔ تاہم جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ موجود ہے اس لئے کہ اس کے واضح آثار اور دلائل موجود ہیں تو پھر یہ لوگ وجود باری کے بارے میں بحث شروع کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہوتا تو نظر بھی آتا، ہمیں اللہ دکھادو۔ ؟زیر بحث آیت سے اگلی آیت میں ہی اللہ نے فرمایا:

قَدْ جَآءَكُم بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ عَمِىَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَآ أَنَا۠ عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ (۱۰۴)

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) اب بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق بینی کے ذرائع (یعنی توحید ورسالت کے حق ہونے کے دلائل عقلیہ ونقلیہ) پہنچ چکے ہیں سو جو شخص (ان کے ذریعہ سے حق کو) دیکھ لے گا وہ اپنا فائدہ کرے گا، اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا اور میں تمہارا (یعنی تمہارے اعمال کا) نگران نہیں ہوں (یعنی جیسا نگرانی کرنے والے کے ذمہ ہوتا ہے کہ ناشائستہ حرکت نہ کرنے دے، یہ میرے ذمہ نہیں، میرا کام صرف تبلیغ ہے)۔

خداخود کوآخر ظاہر کیوں نہیں کرتا؟

ہماری سائٹ اور دیگر مقامات پر خدا کے وجود کے تمام سائنسی اور فلسفیانہ دلائل کے باوجود، ممکن ہے کچھ قارئین کے ذہنوں میں ابھی بھی یہ سوال چپکا ہوا ہو کہ اگر خدا کا وجود حقیقی ہے تو وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟ آخر وہ کیوں اپنی موجودگی کی کوئی واضح نشانی نہیں دکھاتا مثلاً آسمان پر بڑے بڑے آتشیں حروف سے لکھ ڈالے کہ میں خدا ہوں اور دیکھو میں یہاں ہوں۔

رائے اے ورغس (Roy A. Varghese) اپنی کتاب ''عجوبہ عالم: جدید سائنس سے خدا کے ذہن تک ایک سفر کی روداد'' میں اسکا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب آپ ایک دفعہ جان لیتے ہیں کہ خدا کے تصور کے کیا معنی ہیں تو آپ یہ بھی فوراً سمجھ جاتے ہیں کسی لا محدود چیز کو جسمانی طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ کسی چیز کو جسمانی طور پر دیکھے جانے کے لیے لازم ہے کہ اس کی کوئی واضح شکل، حجم اور رنگ ہو۔ نیز روشنی اس سے ٹکرا کر واپس آتی ہو تا کہ ہمارے محسوسات کے رستے دماغ تک پہنچے۔ لیکن یہ خاصیتیں جس شئے میں بھی پائی جائیں گی، وہ شئے خود لا محدود نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہم حقیقت میں یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ پہاڑی کے اوپر خدا کا چہرہ نمودار ہو۔ اور بالفرض آسمان پر یکایک یہ تحریر ظاہر ہو بھی جائے کہ ''میں ہوں خدا، دستخط'' تو

اس سے کسی بھی طرح کچھ بھی ثابت نہیں ہوگا کیوں کہ کوئی ایسا ذریعہ دستیاب نہیں ہوگا کہ جس سے اس پیغام کو تحریر کرنے والی ہستی کی تصدیق کی جاسکے''۔

The Wonder of the World: A Journey from Modern Science to)
the Mind of God)"

سوال یہ ہے کہ کیا انسان میں خدا کو دیکھنے کی صلاحیت بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اسے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا، موسی علیہ السلام کا واقعہ اس کی دلیل ہے۔ انسان میں ابھی تو اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ وہ سورج کو چند فٹ کے فاصلے سے دیکھ سکے چہ جائکہ سورج کے خالق کو براہ راست دیکھے۔ اسی لیے قرآن کریم میں مذکور ہے: ﴿لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ﴾ ''وہ ایسا ہے کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، جبکہ وہ نگاہوں کا ادراک کر لیتا ہے'' (سورۃ الأنعام: ۱۰۳)۔ آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ''ساتوں آسمان اللہ کی کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں، جیسے ڈھال میں پڑے سات درہم۔') تفسیر الطبری، ۳،۷۷ (یانسی((Yancey اس نکتے کو ایک تمثیلی کہانی کی مدد سے واضح کرتے ہیں جو کہ انیسویں صدی کے ڈنمارک کے فلسفی سارن کر کی گارڈنے لکھی تھی۔ ''تصور کیجیے ایک بادشاہ تھا جو ایک بھولی بھالی دوشیزہ سے محبت کرتا تھا۔ یہ بادشاہ کوئی عام بادشاہ نہیں تھا۔ ہر سردار اس کی طاقت کے آگے کانپتا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے آگے ایک لفظ منہ سے نکالے کہ اس کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ تمام دشمنوں کو کچل کر رکھ دے۔ لیکن یہ طاقتور بادشاہ اس سیدھی سادی سی دوشیزہ کی چاہت کے آگے عاجز تھا۔ وہ اسے کیسے بتائے کہ اسے اس سے محبت ہے، وہ بادشاہ ہونے کے باوجود بے بس تھا۔ اگر وہ اسے اپنے محل اٹھا لائے، اسے جواہرات سے سجا تاج پہنائے اور اسے شاہی لباس میں ملبوس کرے تو وہ یقیناً منع نہیں کرے گی، کیوں کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کی بات رد کرے۔ لیکن کیا وہ دوشیزہ واقعی اسے چاہے گی؟ اگر وہ اپنی شاہی بگھی میں جنگل میں اس کی جھونپڑی میں جاتا، تو وہ لڑکی اس کی بھی تاب نہ لا پاتی۔

خدا کا خود کو ہم پر ظاہر نہ کرنے کا فیصلہ دراصل اس کی عطا کردہ فیصلے کی آزادی (کہ کون اس کو قبول کرتا ہے اور کون اس کا انکار کرتا ہے) کا اظہار ہے۔ خدا اپنی موجودگی بالکل واضح کر دیتا ہے لیکن وہ خود پس منظر میں رہتا ہے تاکہ جو اس کا انکار کرنا چاہے وہ باآسانی کر سکے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ امتحان کے طور پر بنایا ہے۔ اگر اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نظر آتا تو پھر کسی امتحان کی گنجائش موجود نہ رہتی۔ کون ایسا ہوتا جو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد اس کی نافرمانی کا سوچتا۔

اسکے بجائے اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے اپنی پہنچان کرائی اور اپنے وجود کی نشانیوں کو کائنات وانفس میں پھیلا دیا ہے، جو باآسانی اس تک لے جاتی ہیں۔ ڈین اوورمین (Dean Overman) اپنی کتاب ''اے کیس فار دی اگیزسٹنس آف گاڈ'' (A Case for the Existence of God) میں لکھتے ہیں کہ حسن دراصل سچائی کی جانب راہنمائی کرنے کا خدا کا ایک انداز ہے۔ ''فزکس کے نوبل انعام یافتہ پال ڈیہاک اور رچرڈ فائن مین (Paul Dirac and Richard Feynman) اس بات کے قائل تھے کہ ریاضیاتی سچائی کو اس کے حسن سے پہچانا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ حسن سچائی کی نشاندہی کرتا ہے۔ میں اور آپ جس کائنات کا مشاہدہ کر رہے ہیں اس کی مثال ایک ایسے شاندار فن پارے کی ہے جسے بہت محبت سے تراشا گیا ہو۔ یہ حسن کس کا کارنامہ ہے؟ جیسا کہ پلاٹو (Plato) نے جانا کہ حسن ایک اور حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے، جو کہ کہیں زیادہ حقیقی اور کہیں زیادہ حسین ہے''۔ اگر آپ کا گمان ہو کہ کائنات تو بس ایک اندھا دھن اتفاق کا میکانیکی نتیجہ ہے تو آپ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر اس میں اس قدر حسن کیوں بھرا پڑا ہے؟ اور یہ حسن اس قدر واضح انداز میں حقیقت کی جانب کیوں اشارہ کر رہا ہے؟

ملحدین دعوی کرتے ہیں کہ ہم اپنی بقاء کی جنگ میں مصروف خودکار مشینوں سے زیادہ کچھ نہیں کہ جنہیں تقدس کا رنگ دے دیا گیا ہے اور ہماری زندگی کا مقصد اپنی جین کو آگے منتقل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اچھا تو موسیقی اور فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہونے کی ہماری صلاحیت کا ہماری بقاء کی جدوجہد میں کیا فائدہ ہے؟ غروبِ آفتاب سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھنے والے آباؤاجداد، زمانہ قبل از تاریخ کے ہمارے ان آباؤاجداد کے مقابلے میں جو اس سے

محروم تھے، کیا کسی شیر کا لقمہ بننے کا کم امکان رکھتے تھے؟آخر اپنی جان بچانے کی تگ و دو کرتی مشینوں نے اپنے اندر پیچیدہ حساب کتاب اور طبیعات کو سمجھنے کی صلاحیت کیوں پیدا کی (کائنات کے پوشیدہ حسن اور ترتیب جو اس حساب کتاب اور طبیعات سے ظاہر ہوتی ہے اس کی تو خیر بات ہی کیا)۔ کیا یہ صلاحیت ہمارے اوّلین آباؤ اجداد کے لیے درندوں سے بچنے یا غذا جمع کرنے کے کام آتی تھی؟انسان کے بارے میں ایک میکانیکی، بے مقصد اور خدا کے انکار پر مبنی نقطہ نظر سے ان سوالوں کو کوئی بھی معقول جواب دینا ممکن نہیں۔ لہٰذا، خدا کے منکروں کو چاہیے کہ ان حل نہ ہونے سوالوں سے بچنے کے لیے جیسا کہ سی ایس لوئس نے کہا تھا انہیں ''برضا و رغبت نابینا'' بن جانا چاہیے۔

ترجمہ تحریر سکاٹ ینگرن

عقل، سائنس اور خدا کی تلاش

سائنس حسیاتی (طبیعیاتی) مشاہدوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تفہیم کا نام ہے۔ عقل ایک فریب ہے۔ ایک قضیہ بناتی ہے۔ درمیان میں چھوڑ کر دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ پھر تیسرے۔ اس کے بعد چوتھے۔ اور یہ سلسلہ شروع سے یونہی چلتا چلا جارہا ہے۔ عقل ہمیشہ سے مقبولیت کے تابع رہی ہے۔ عقل سے تشکیل کردہ کوئی بھی نظریہ جب تک مقبولیت پکڑتا ہے تب تک عقل آگے جاچکی ہوتی ہے۔ فلاسفہ نئی تشریحات کے نئے میدانوں اور نئے زاویوں تک رسائی پاچکے ہوتے ہیں۔ پھر وقت ارتقائی منازل سے گزرتا ہے۔ تعقلات کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ بحث در بحث اور تردید در تردید کے بے پایاں ادوار کھولے اور بند کیے جاتے ہیں۔ کئی راہوں پر چل کر دیکھا جاتا ہے۔ لیکن منزل آنے سے پہلے ہی کسی دوسری، مزید دلچسپ، مزید پُرکشش راہ کی طرف رخ کر لیا جاتا ہے۔ منزل تک کسی کی رسائی کبھی نہیں ہو پاتی۔

یہ تو ہوا ایک مسئلہ۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کوئی چیز حتمی ہے؟ یا حتمیت ممکن ہے؟

جواب تھوڑا پیچیدہ ہے۔ دراصل عقل کا فریب اس طرح کا ہے کہ یہ اپنے آپ کی تردید کر کے خود اس تردید کی بھی تردید کر دیتی ہے۔ گویا اگر میں کہوں کہ عقل غیر معتبر ہے تو جملہ بذاتِ خود ایک جملۂ محال ہے۔ کیونکہ اس جملے کی ترکیب میں خود تعقلاتی سرگرمی موجود ہے جو عقل کی تردید کر کے خود ہی جملے کو مشکوک کر دیتی ہے۔ یہ عقل کا وہ کثیف ترین پہلو ہے جہاں آکر تمام قضیے غیر معتبر ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس عقلی سرگرمیوں کو ناپنے اور ان کی تصدیق و تردید کا کوئی بیرونی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ ہمارے پاس معلومات کا ماخذ بھی دماغ ہے، اور نتائج کا منبع بھی۔ اب کوئی ایسا عقلی نظام جس کو بیرونی روشنی ہی نہ مل سکے اس کی صداقت یا صحت پر اعتبار کرنا کہاں تک درست ہوگا؟ یا اگر اعتبار کیا جائے تو اس سے حتمی نتیجوں کی کتنی امید کی جاسکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہم اس حادث کائنات کے غیر معتبر مظاہر سے وجود میں آنے والے قضیوں کی تفہیم کر کے حتمی نتائج کا استنباط کبھی نہیں کر سکیں گے۔

اس بات کا مطلب کیا ہے؟

دیکھیے سادہ سی بات ہے۔ عقل اپنے قضیے حسیاتی مشاہدوں یعنی قوتِ باصرہ، سامعہ، لامسہ اور دوسرے حسی ذرائع سے پیدا کرتی ہے۔ ان سارے مشاہدوں کی کوئی حتمی تصدیق ہمیں اپنے دماغ کے علاوہ کہیں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حسیاتی مشاہدوں کی تخلیق کا مرکز بھی دماغ ہے، اور اس سے بننے والے قضیوں سے نتائج پیدا کرنے کی سرگرمی بھی دماغ ہی کا کام ہے۔ گویا ہمارے پاس تصدیق کا کوئی بیرونی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں۔

اب اس سے آگے آتے ہیں۔ سائنس کے میدان کی حقیقتوں کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ طبیعیاتی قوانین خود اس حسنِ ظن پر کھڑے ہیں کہ کوئی بھی طبیعیاتی مظہر جس طرح اب تک رونما ہوا ہے وہ اسی طرح رونما ہوتا رہے گا۔ زمین سورج کے گرد کل بھی اسی طرح گھومتی رہے گی۔ سورج کل بھی مشرق ہی سے طلوع ہوگا۔ چیزیں کل بھی زمین کی طرف آکر گرتی رہیں گی۔ منفی کی کشش مثبت کی طرف ہمیشہ جاری رہے گی۔ منفی منفی کو اور مثبت مثبت کو ہمیشہ اسی

طرح دور دھکیلتا رہے گا۔ الیکٹران دو ہزار سال بعد بھی مرکزے کے گرد حجوم میں رہیں گے۔ توانائی کی ناکارگی ہمیشہ جاری رہے گی۔ کوانٹم ویکیوم فلکچویشن اسی طرح رہے گی جس طرح اب تک رہی ہے۔ طبیعیاتی کائنات کے یہ سارے مظاہر اسی طرح ہوتے رہیں گے جس طرح ہوتے آئے ہیں۔ اسے فطرت کی مطابقت (Uniformity of Nature) کہا جاتا ہے۔ اور تمام انسان اس مطابقت پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ مطابقت اب تک دھوکہ دیتی نہیں پائی گئی۔ لیکن عین عقلی یا منطقی زاویے سے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ یا منطقی تضاد ہے۔ کیسا تضاد؟ یہ یقین کہ فطرت ہمیشہ اسی طرح برتاؤ کرے گی جس طرح اب سے ایک پائکو سیکنڈ پہلے کر رہی تھی۔ سائنس ہمیشہ اس مطابقت کے آگے سے اپنی بات رکھنا شروع کرتی ہے۔ اس سے پیچھے کے معاملات میں سائنس بھی ٹھیک عقائد ہی کی طرح اندھا یقین رکھ کر چلتی ہے۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں ہم سب بے بس، مجبور اور لاچار ہیں۔ اور یہی وہ مطابقت ہے جو ہمیں اس کائنات میں تنہائی اور کرب کی حالت میں چھوڑ دیتی ہے۔ اسی وجہ سے سٹیون ہاکنگ نے بیان دیا تھا کہ ہم کائنات کی کوئی حتمی تشریح کبھی نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ ہمیں اپنی اس کائنات میں فطرت کی اس مطابقت کے مقابلے پر متناقض مطابقت کہیں نہیں دکھائی دیتی۔ اور جب تک اس مطابقت کے مقابل کوئی مطابقت کا نظام دکھائی نہیں دیتا تب تک ہم اپنے اس نظامِ علم کی تفہیم کو مکمل کر ہی نہیں سکیں گے۔ طبیعیاتی مظاہر رونما ہوتے رہیں گے۔ ہم ہمیشہ قوانین پر قوانین اور نظریات پر نظریات ڈھونڈ کر دریافت کرتے چلے جائیں گے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ ہم کائنات کے آخری کونے سے غلاف کو اُٹھا کر باہر کا نظارہ کبھی نہیں کر سکتے۔

یہاں آکر دو باتیں طے ہو گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عقل سے حتمی قضیوں کی امید بے کار ہے۔ دوسرا یہ کہ سائنس فطرت کی اس مطابقت کے تضاد سے کبھی باہر نہیں نکل سکتی۔ تو اب تیسرا مرحلہ خدا کی تلاش کا ہے۔ عام تعریف کے مطابق خدا کا وجود کائنات، قوانینِ کائنات، وقت اور طبیعی جہات وغیرھم سے ماورا ہے۔ گویا ہمیں خدا تعالی کے وجود کی تلاش کے لیے ان قیود سے آزادی نہ صرف یہ کہ ضروری ہے، بلکہ ناگزیر ہے۔ ہماری حالیہ منطق میں اب اور کوئی بڑی تبدیلی نہیں آنے والی۔ منطق کے جو بنیادی اصول صدیوں سے چلتے چلے آرہے ہیں وہ تقریباً مکمل ہیں۔ سائنس انہی کی

بنیاد پر اپنی نظریات کی تعمیر کر کے نتائج کا استنباط کرتی ہے۔ لیکن تضادات سے پُر کائنات کے یہ داخلی مظاہر، ان سے حاصل ہونے والے ''داخلی علم'' کی روشنی، اور حسیاتی تجربات پر عقلی سرگرمیوں سے کشید کردہ نتائج کی یہ بہتات خدا کی تلاش کے لیے انتہائی طور پر ناکافی اور نامکمل ہے۔

ڈاکٹر مزمل شیخ بسمل

انکارِ خدا کے فلسفے کی بنیادی دلیل کی معقولیت

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ بازار میں ایک دکان ایسی ہے جس کا کوئی دکان دار نہیں ہے، نہ کوئی اس میں مال لانے والا ہے، نہ بیچنے والا اور نہ کوئی اس کی رکھوالی کرتا ہے، دکان خود بخود چل رہی ہے، خود بخود اس میں مال آجاتا ہے اور خود بخود خریداروں کے ہاتھوں فروخت ہو جاتا ہے، تو کیا آپ اس شخص کی بات مان لیں گے؟ کیا آپ تسلیم کر لیں گے کہ کسی دکان میں مال لانے والے کے بغیر خود بخود بھی مال آسکتا ہے، مال بیچنے والے کے بغیر خود بخود فروخت بھی ہو سکتا ہے؟ حفاظت کرنے والے کے بغیر خود بخود چوری اور لوٹ سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے؟ اپنے دل سے پوچھیے ایسی بات آپ کبھی مان سکتے ہیں؟ جس کے ہوش و حواس ٹھکانے ہوں کیا اس کی عقل میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی دکان دنیا میں ایسی بھی ہو گی؟

فرض کیجیے۔ ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ اس شہر میں ایک کارخانہ ہے جس کا نہ کوئی مالک ہے، نہ انجینئر، نہ مستری۔ سارا کارخانہ خود بخود قائم ہو گیا ہے۔ ساری مشینیں خود بخود بن گئی ہیں، خود ہی سارے پرزے اپنی اپنی جگہ لگ گئے ہیں، خود ہی سب مشینیں چل رہی ہیں، اور خود ہی ان میں سے عجیب عجیب چیزیں بن بن کر نکلتی رہتی ہیں۔ سچ بتایئے جو

شخص آپ سے یہ بات کہے گا۔ آپ حیرت سے اس کا منہ نہ تکنے لگیں گے ! آپ کو یہ شبہ نہ ہو گا کہ اس کا دماغ تو کہیں خراب نہیں ہو گیا ہے ؟ کیا ایک پاگل کے سوا ایسی بے ہودہ بات کوئی کہہ سکتا ہے ؟

دور کی مثال کو چھوڑیئے، یہ بجلی کا بلب جو آپ کے سامنے جل رہا ہے کیا کسی کے کہنے سے آپ یہ مان سکتے ہیں کہ روشنی اس بلب میں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہے ؟ یہ کرسی جو آپ کے سامنے رکھی ہے، کیا کسی بڑے سے بڑے فاضل فلسفی کے کہنے سے بھی آپ یہ باور کر سکتے ہیں کہ یہ خود بخود بن گئی ہے ؟ یہ کپڑے جو آپ پہنے ہوئے ہیں، کیا کسی علامۂ دہر کے کہنے سے بھی آپ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں کہ ان کو کسی نے بنایا نہیں ہے، یہ خود بن گئے ہیں ؟ یہ گھر جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں اگر تمام دنیا کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر مل کر بھی آپ کو یقین دلائیں کہ ان گھروں کو کسی نے نہیں بنایا ہے بلکہ یہ خود بن گئے ہیں، تو کیا ان کے یقین دلانے سے آپ کو ایسی لغو بات پر یقین آ جائے گا ؟

یہ چند مثالیں آپ کے سامنے کی ہیں۔ رات دن جن چیزوں کو آپ دیکھتے ہیں انہیں میں سے چند ایک میں نے بیان کی ہیں۔ اب غور کیجیے، ایک معمولی دکان کے متعلق جب آپ کی عقل یہ نہیں مان سکتی کہ وہ کسی قائم کرنے والے کے بغیر چل رہی ہے، جب ایک ذرا سے کارخانے کے متعلق آپ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر بن جائے گا اور کسی چلانے والے کے بغیر چلتا رہے گا تو یہ زمین و آسمان کا زبردست کارخانہ جو آپ کے سامنے چل رہا ہے، جس میں چاند اور سورج اور بڑے بڑے ستارے گھڑی کے پرزوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں، جس میں سمندروں سے بھاپیں اٹھتی ہیں، بھاپوں سے بادل بنتے ہیں، بادلوں کو ہوائیں اڑا کر زمین کے کونے کونے میں پھیلاتی ہیں، پھر ان کو مناسب وقت پر ٹھنڈک پہنچا کر دوبارہ بھاپ سے پانی بنایا جاتا ہے، پھر وہ پانی بارش کے قطروں کی صورت میں گرایا جاتا ہے، پھر اس بارش کی بدولت مردہ زمین کے پیٹ سے طرح طرح کے لہلہاتے ہوئے درخت نکالے جاتے ہیں۔ قسم قسم کے غلے، رنگ برنگ کے پھل اور وضع وضع کے پھول پیدا کیے جاتے ہیں، اس کارخانے کے متعلق آپ یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کسی بنانے والے کے بغیر خود بن گیا اور کسی چلانے والے کے بغیر خود چل رہا ہے ؟

ایک ذرا سی کرسی، ایک گز بھر کپڑے، ایک چھوٹی سی دیوار کے متعلق کوئی کہہ دے کہ یہ چیزیں خود بنی ہیں تو آپ فوراً فیصلہ کر دیں گے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ پھر بھلا اس شخص کے دماغ کی خرابی میں کیا شک ہو سکتا ہے جو کہتا ہے کہ زمین خود بن گئی، جانور خود پیدا ہو گئے، انسان جیسی حیرت انگیز چیز آپ سے آپ بن کر کھڑی ہو گئی۔ آدمی کا جسم جن اجزاء سے مل کر بنا ہے ان سب کو سائنس دانوں نے الگ الگ کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ لوہا ہے، کچھ کوئلہ، کچھ گندھک، کچھ فاسفورس، کچھ کیلشیم، کچھ نمک، چند گیسیں اور بس ایسی ہی چند اور چیزیں جن کی مجموعی قیمت چند روپوں سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ چیزیں جتنے جتنے وزن کے ساتھ آدمی کے جسم میں شامل ہیں، اتنے ہی وزن کے ساتھ انہیں لے لیجیے اور جس طرح جی چاہے ملا کر دیکھ لیجیے۔ آدمی کسی ترکیب سے نہ بن سکے گا۔ پھر کس طرح آپ کی عقل مان سکتی ہے کہ ان چند بے جان چیزوں سے دیکھتا، سنتا، بولتا، چلتا پھرتا انسان، جو ہوائی جہاز اور ریڈیو بناتا ہے، کسی کاریگر کی حکمت کے بغیر خود بخود بن جاتا ہے؟

کبھی آپ نے غور کیا کہ ماں کے پیٹ کی چھوٹی سی فیکٹری میں کس طرح آدمی تیار ہوتا ہے؟ باپ کی کارستانی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ ماں کی حکمت کا اس میں کوئی کام نہیں۔ ایک ذرا سی تھیلی میں دو کیڑے جو خوردبین کے بغیر دیکھے تک نہیں جا سکتے، نہ معلوم کب آپس میں مل جاتے ہیں۔ ماں کے خون ہی سے ان کو غذا پہنچنی شروع ہو جاتی ہے۔ وہیں سے لوہا، گندھک، فاسفورس وغیرہ تمام چیزیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ایک خاص وزن اور خاص نسبت کے ساتھ وہاں جمع ہو کر لوتھڑا بنتی ہیں۔ پھر اس لوتھڑے میں جہاں آنکھیں بننی چاہئیں وہاں آنکھیں بنتی ہیں، جہاں کان بننے چاہئیں وہاں کان بنتے ہیں، جہاں دماغ بننا چاہیے وہاں دماغ بنتا ہے، جہاں دل بننا چاہیے وہاں دل بنتا ہے۔۔۔ ہڈی اپنی جگہ پر، گوشت اپنی جگہ پر، غرض ایک ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھتا ہے۔ پھر اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ دیکھنے کی طاقت، سننے کی طاقت، چکھنے اور سونگھنے کی طاقت، بولنے کی طاقت، سوچنے اور سمجھنے کی طاقت اور نہ جانے کتنی بے حد و حساب طاقتیں اس میں بھر جاتی ہیں۔ اس طرح جب انسان مکمل ہو جاتا ہے تو پیٹ کی وہی چھوٹی سی فیکٹری جہاں نو مہینے تک وہ بن رہا تھا خود زور کر کے اسے باہر دھکیل دیتی ہے۔ اس فیکٹری سے ایک ہی طریقے پر لاکھوں انسان روز بن

کر نکل رہے ہیں۔ مگر ہر ایک کا نمونہ جدا ہے۔ شکل جدا، رنگ جدا، آواز جدا، قوتیں اور قابلیتیں جدا، طبیعتیں اور خیالات جدا، اخلاق اور صفات جدا۔ ایک ہی ماں کے پیٹ سے نکلے ہوئے دو سگے بھائی تک ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ یہ ایک ایسا کرشمہ ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کرشمے کو دیکھ کر بھی جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ کام کسی زبردست حکمت والے، زبردست قدرت والے، زبردست علم اور بے نظیر کمالات والے خدا کے بغیر ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے، یقیناً اس کا دماغ درست نہیں اس کو عقل مند سمجھنا عقل کی توہین کرنا ہے۔ کم از کم میں تو ایسے شخص کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی معقول مسئلے پر اس سے گفتگو کروں۔

تحریر سید مودودیؒ

انکارِ خدا، سائنسدانوں کی گواہی اور عقل

خدا کو تسلیم کیے بنا کائنات کی تخلیق کے لیے تین طرح کے نقطہ نظر پیش کیے جاتے ہیں.

☆پہلا نظریہ: یہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ کے لیے رہے گی.

کائنات کے ہمیشہ سے موجود ہونے کا نظریہ قدیم یونان سے چلا آرہا ہے لیکن اس دعوے کی سب بڑی مخالف آج کی جدید سائنس ہے جو اس کائنات کے مشاہدہ کی بنیاد پر یقین سے یہ بات کہہ رہی ہے کہ یہ کائنات ایک مخصوص وقت میں شروع ہوئی اور پھر یہ ختم بھی ہو جائے گی.

اگر اس دعوے کو ہم منطقی طور پر بھی دیکھیں تو کائنات کے ہمیشہ سے موجود ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس کا ماضی لامحدود ہو ریاضی کی زبان میں اسے infinity کہتے ہیں.

لیکن یہ لامحدود (infinite) کا نظریہ حقیقی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتا. اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ infinity میں سے سو کو مائنس کیا جائے تو ریاضی میں اس کا جواب infinite ہی آئے گا جبکہ منطقی طور پر یہ اس لامحدود میں سے سو اشیاء کم ہونا چاہیے. لیکن ریاضی میں ایسا ہوتا نہیں. اسی لیے infinite past کا نظریہ کسی بھی

طور پر منطقی نہیں ہے. اور سائنس کے مطابق اگر کائنات کا ماضی لا محدود ہوتا تو یہ اپنی تمام انرجی آج ختم کر چکی ہوتی اور اس میں موجود قوتیں اس کی تباہی کا باعث بن جاتی جو کہ مستقبل میں ہونے کا امکان ہے. یعنی اگر ماضی لا محدود ہوتا تو آج ہم موجود نہ ہوتے

اس کے علاوہ آج سائنس اس بات پر متفق ہو چکی ہے کہ اس سب کا ایک نقطہ آغاز تھا اور ایک نقطہ انجام بھی ہو گا.) مسلمان تو پہلے سے اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ کائنات ہمیشہ سے نہیں تھی اسے اللہ نے بنایا ہے(

☆دوسرا نظریہ: کائنات بنا کسی علت یا وجہ کے خود بخود وجود میں آئی اور یہ کچھ نہیں میں سے کچھ پیدا ہو گیا All this came from nothing . یعنی یہ سب کچھ بنا کسی وجہ کے خود بخود وجود میں آیا. نہ اس سے پہلے کوئی ہستی، کوئی ذات تھی نہ اس کے بعد کوئی ہستی کوئی ذات اس سارے عمل کی وجہ بنی.

سائنس دانوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس بات کو مانتے ہیں کہ ایسا ممکن ہے یعنی پہلے کچھ نہیں تھا اور یہ سب خود بخود وجود میں آ گیا. لیکن اس سب کے ممکن ہونے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ پہلے ایک نظام موجود تھا جیسے quantum vacuum کہتے ہیں جس میں Quantum fluctuations پیدا ہوتی تھی. یہ عمل در عمل کا ایک ایسا نظام تھا جس میں چیزیں تیزی سے بنتی اور بدلتی تھی. یعنی مادہ اور ضد مادہ(matter and antimatter) بنتے اور ایک دوسرے کو ختم کرتے تھے. اس کی وجہ سے big bang ہوا اور پھر یہ کائنات وجود میں آ گئی.

لیکن یہاں یہ بات نوٹ کرنے والی ہے کہ سائنس دان جب کہتے ہیں کہ پہلے کچھ نہیں تھا پھر اچانک سب کچھ آ گیا کہیں سے تو اس دوران وہ quantum vacuum نامی ایک شہ کی موجودگی کا کہتے ہیں کہ اس سب سے پہلے وہ موجود

تھا. یعنی جو دعوی وہ خود کر رہے ہیں پھر خود ہی اس کی نفی بھی کر رہے ہیں. کیونکہ یہ quantum vacuum کچھ ہے یہ وجود رکھنے والی شہ ہے اسے ہم nothing نہیں کہہ سکتے.

منطقی طور پر جب سوچا جاتا ہے تو فلسفہ اس بات کو نہیں مانتا کہ کوئی شہ بنا کسی وجہ کے خود بخود وجود میں آجائے اور ''کچھ نہیں میں سے کچھ پیدا ہو جائے''.

اس کا اندازہ آپ ایسے کر سکتے ہیں کہ اگر ہم کسی سے کہیں کہ یہ ٹیبل خود بخود بن گیا بنا کسی لکڑی کے اور یہ ایسی لکڑی ہے جو دنیا میں پائی ہی نہیں جاتی یعنی یہ لکڑی کائنات میں موجود ہی نہیں لیکن یہ ٹیبل اس لکڑی سے خود بخود بن کر میرے سامنے آگیا ہے. تو یقیناً سننے والا اس بات کو کسی صورت تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ یہ منطق کے خلاف ہے.

یہ کائنات اور اس میں موجود تمام مادی اشیاء علت و معلول کے اصول میں جکڑی ہوئی ہیں جبکہ اسلام کے تصور خدا کے مطابق خدا ان اصولوں سے نہ صرف پاک ہے بلکہ وہ ان کا پیدا کرنے والا ہے. یعنی وہ خود کائنات کے اصولوں کا خالق ہے اس لیے یہ اصول خود خدا کی ذات پر لاگو نہیں کیے جا سکتے.

☆تیسرا نظریہ: ..self creation یعنی اپنے آپ کو پیدا کرنا.

سائنس میں یہ نظریہ بھی ہے کہ کائنات نے خود ہی اپنے آپ کو تخلیق کر لیا ہے. یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے یہ بچہ اپنی ہی ماں ہے. یا فلاں شخص نے اپنے آپ کو جنم دیا ہے.

مشہور سائنسدان Stephen Hawking اپنی کتاب the Grand Design میں کہتا ہے کہ self creating ممکن ہے لیکن ایسا ممکن ہونے کے لیے لازم ہے کہ ہمارے پاس کشش ثقل یعنی Gravity موجود ہو کیونکہ کائنات کی ٹوٹل انرجی اسی صورت میں صفر ہو گی جب gravity کو منفی انرجی مانا جاتا ہے. یہ ہم جانتے ہیں کہ

کشش ثقل دو جسموں کے درمیان پائی جانے والی قوت کا نام ہے جس سے وہ ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں. لیکن آئن سٹائن نے گریویٹی کی ایک نئ تعریف فراہم کی جب اس نے کہا کہ گریویٹی مادہ کی وجہ سے space Time fabric میں جھکاؤ کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔

اب اہم بات یہ ہے کہ کشش ثقل کے لیے مادہ کا ہونا لازم ہے یعنی یہ قوت مادہ کے بنا ممکن نہیں. لیکن سائنس یہ کہتی ہے کہ مادہ خود اپنے آپ کو جنم دے سکتا ہے اگر یہ قوت پہلے سے موجود ہو تو.

Some thing exists and doesn't exist at the same time..

اس مفروضہ کا مطلب یہ بنتا ہے. اور اگر ہم مان لیں کہ کائنات نے خود کو تخلیق کیا اور کشش ثقل کسی طرح اس سب سے پہلے موجود تھی جس کی مدد سے یہ کائنات وجود میں آئی تو کیا یہ کشش ثقل کچھ نہیں ہے. This gravity is something, it's not nothing.

یعنی اس نظریہ میں بھی سائنس خود اپنے آپ کو ہی غلط ثابت کر رہی ہے.. اور منطقی طور پر دیکھا جائے تو کوئی شہ ایک ہی وقت میں وجود اور عدم وجود کی حالت میں موجود نہیں ہو سکتی"

سائنس کی بنیاد پر جب خدا کے وجود کو رد کیا جاتا ہے تو یہی تین نظریات پیش کیے جاتے ہیں. لیکن یہ تینوں نظریات بھی اپنے آپ میں مکمل نہیں ہیں اور ہمارے لیے اس کائنات کے وجود میں آنے کو مکمل طور پر قابل فہم بنانے سے قاصر ہیں. اس کے ساتھ یہ تینوں نظریات کائنات اور خود انسان کے وجود کو با معنی بنانے سے قاصر ہیں. یعنی اگر ہم فرض کر لیں کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک نظریہ درست ہے تو ہمیں اس کائنات کے وجود میں آنے اور اس میں انسان جیسی باشعور مخلوق کے پیدا ہونے کا کوئی مقصد نہیں ملتا. خدا کے تصور کے بنا یہ کائنات، اور انسان سب بے مقصد ہیں. اگر

کائنات کا وجود با معنی نہیں تو انسان سوچتا ہے کہ پھر اس دنیا میں اچھائی، برائی، نیکی اور بدی کا کوئی بھی تصور کیونکر با معنی ہو سکتا ہے.

ہمارے تمام افعال و اعمال اور اس کائنات کو اگر کوئی نظریہ با معنی بناتا ہے تو وہ ایک خدا کا تصور ہے جو واحد و یکتا ہے جس کا تصور انسانی تاریخ میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے.

تحریر سہراب نصیر

وجودِ خدا، انبیاءؑ کی گواہی اور عقل

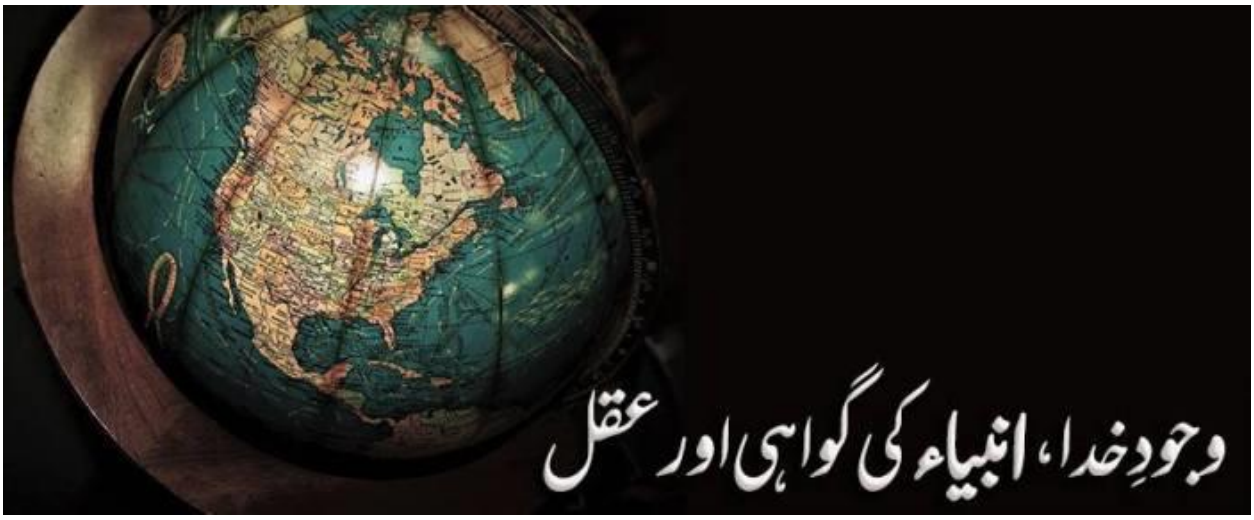

بڑے بڑے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں کارخانے بجلی کی قوت سے چل رہے ہیں۔ ریلیں اور ٹرام گاڑیاں رواں دواں ہیں۔ شام کے وقت دفعتاً ہزاروں قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔ گرمی کے زمانہ میں گھر گھر پنکھے چلتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے نہ تو ہمارے اندر حیرت و استعجاب کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ان چیزوں کے روشن یا متحرک ہونے کی علت میں کسی قسم کا اختلاف ہمارے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان قمقموں کا تعلق جس بجلی گھر سے ہے اس کا حال بھی ہم کو معلوم ہے۔ اس بجلی گھر میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے وجود کا ہم کو علم ہے۔ ان کام کرنے والوں پر جو انجینئر نگرانی کر رہا ہے، اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انجینئر بجلی بنانے کے کام سے واقف ہے، اس کے پاس بہت سی کلیں ہیں اور ان کلوں کو حرکت دے کر وہ اس قوت کو پیدا کر رہا ہے جس کے جلوے ہم کو قمقموں کی روشنی، پنکھوں کی گردش، ریلوں اور ٹرام گاڑیوں کی سیر، چکیوں اور کارخانوں کی حرکت میں نظر آتے ہیں۔ پس بجلی کے آثار کو دیکھ کر اس کے اسباب کے متعلق ہمارے درمیان اختلاف رائے واقع نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان اسباب کا پورا سلسلہ ہمارے محسوسات میں داخل ہے اور ہم اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

فرض کیجیے کہ یہی قمقمے روشن ہوتے، اسی طرح پنکھے گردش کرتے، یونہی ریلیں اور ٹرام گاڑیاں چلتیں، چکیاں اور مشینیں حرکت کرتیں، مگر وہ تار جن سے بجلی ان میں پہنچتی ہے ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتے، بجلی گھر بھی ہمارے محسوسات کے دائرے سے خارج ہوتا، بجلی گھر میں کام کرنے والوں کا بھی ہم کو کچھ علم نہ ہوتا اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کارخانہ کا کوئی انجینئر ہے جو اپنے علم اور اپنی قدرت سے اس کو چلا رہا ہے۔ کیا اس وقت بھی بجلی کے ان آثار کو دیکھ کر ہمارے دل ایسے ہی مطمئن ہوتے ؟ کیا اس وقت بھی ہم اسی طرح ان مظاہر کی علتوں میں اختلاف نہ کرتے ؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کا جواب نفی میں دیں گے۔ کیوں ؟ اس لیے کہ جب آثار کے اسباب پوشیدہ ہوں اور مظاہر کی علتیں غیر معلوم ہوں تو دلوں میں حیرت کے ساتھ بے اطمینانی کا پیدا ہونا، دماغوں کا اس راز سربستہ کی جستجو میں لگ جانا، اور اس راز کے متعلق قیاسات و آراء کا مختلف ہونا ایک فطری بات ہے۔

اب اس مفروضے پر سلسلہ کلام کو آگے بڑھایئے۔ مان لیجیے کہ یہ جو کچھ فرض کیا گیا ہے درحقیقت عالم واقعہ میں موجود ہے۔ ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہیں۔ لاکھوں پنکھے چل رہے ہیں، گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، کارخانے حرکت کر رہے ہیں اور ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان میں کون سی قوت کام کر رہی ہے اور وہ کہاں سے آتی ہے۔ لوگ ان مظاہر و آثار کو دیکھ کر حیران و ششدر رہیں۔ ہر شخص ان کے اسباب کی جستجو میں عقل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ سب چیزیں آپ سے آپ روشن یا متحرک ہیں، ان کے اپنے وجود سے خارج کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں روشنی یا حرکت بخشنے والی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ چیزیں جن مادوں سے بنی ہوئی ہیں، انہی کی ترکیب نے ان کے اندر روشنی اور حرکت کی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس عالم مادہ سے ماوراء چند دیوتا ہیں جن میں سے کوئی قمقمے روشن کرتا ہے، کوئی ٹرام اور ریلیں چلاتا ہے، کوئی پنکھوں کو گردش دیتا ہے اور کوئی کارخانوں اور چکیوں کا محرک ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو سوچتے سوچتے تھک گئے ہیں اور آخر میں عاجز ہو کر کہنے لگے ہیں کہ ہماری عقل اس طلسم کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور جو کچھ ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب۔

یہ سب گروہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں مگر اپنے خیال کی تائید اور دوسرے خیالات کی تکذیب کے لیے ان میں سے کسی کے پاس بھی قیاس اور ظن و تخمین کے سوا کوئی ذریعہ علم نہیں ہے۔

اس دوران میں کہ یہ اختلافات برپا ہیں، ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو! میرے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے، اس ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان سب قمقموں، پنکھوں، گاڑیوں، کارخانوں اور چکیوں کا تعلق چند مخفی تاروں سے ہے جن کو تم محسوس نہیں کرتے۔ ان تاروں میں ایک بہت بڑے بجلی گھر سے وہ قوت آتی ہے جس کا ظہور روشنی اور حرکت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس بجلی گھر میں بڑی بڑی عظیم الشان کلیں ہیں جنہیں بے شمار اشخاص چلا رہے ہیں۔ یہ سب اشخاص ایک بڑے انجینئر کے تابع ہیں اور وہی انجینئر ہے جس کے علم اور قدرت نے اس پورے نظام کو قائم کیا ہے۔ اسی کی ہدایت اور نگرانی میں یہ سب کام ہو رہے ہیں۔

یہ شخص پوری قوت سے اپنے اس دعوے کو پیش کرتا ہے۔ لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں، سب گروہ مل کر اس کی مخالفت کرتے ہیں، اس کو دیوانہ قرار دیتے ہیں۔ اس کو مارتے ہیں، تکلیفیں دیتے ہیں، گھر سے نکال دیتے ہیں۔ مگر وہ ان سب روحانی اور جسمانی مصیبتوں کے باوجود اپنے دعوے پر قائم رہتا ہے۔ کسی خوف یا لالچ سے اپنے قول میں ذرہ برابر ترمیم نہیں کرتا۔ کسی مصیبت سے اس کے دعوے میں کمزوری نہیں آتی۔ اس کی ہر ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قول کی صداقت پر کامل یقین ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ بھی بجنسہٖ یہی قول، اسی دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پھر تیسرا، پھر چوتھا، پانچواں آتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جو اس کے پیشروؤں نے کہی تھی۔ اس کے بعد آنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز ہو جاتی ہے، اور یہ سب اسی ایک قول کو اسی ایک دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ زمان و مکان اور حالات کے اختلاف کے باوجود ان کے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ سب کہتے ہیں کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ سب کو دیوانہ قرار دیا جاتا

ہے۔ ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہر طریقہ سے انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے قول سے باز آ جائیں مگر سب کے سب اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کو اپنے مقام سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتی۔ اس عزم و استقامت کے ساتھ ان لوگوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی جھوٹا، چور، خائن، بدکار، ظالم اور حرام خور نہیں ہے۔ ان کے دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ ان سب کے اخلاق پاکیزہ ہیں۔ سیرتیں انتہا درجہ کی نیک ہیں اور حسن خلق میں یہ اپنے دوسرے ابنائے نوع سے ممتاز ہیں۔ پھر ان کے اندر جنون کا بھی کوئی اثر نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے برعکس وہ تہذیبِ اخلاق، تزکیہ نفس اور دنیوی معاملات کی اصلاح کے لیے ایسی ایسی تعلیمات پیش کرتے اور ایسے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کے مثل بنانا تو درکنار بڑے بڑے علماء و عقلاء کو ان کی باریکیاں سمجھنے میں پوری پوری عمریں صرف کر دینی پڑتی ہیں۔

ایک طرف وہ مختلف الخیال مکذبین ہیں اور دوسری طرف یہ متحد الخیال مدعی۔ دونوں کا معاملہ عقل سلیم کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ جج کی حیثیت سے عقل کا فرض ہے کہ پہلے اپنی پوزیشن کو خوب سمجھ لے پھر فریقین کی پوزیشن کو سمجھے، اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کس کی بات قابل ترجیح ہے۔

جج کی اپنی پوزیشن یہ ہے کہ خود اس کے پاس امر واقعی کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ خود حقیقت کا علم نہیں رکھتا۔ اس کے سامنے صرف فریقین کے بیانات، ان کے دلائل، اُن کے ذاتی حالات اور خارجی آثار و قرائن ہیں۔ انہی پر تحقیق کی نظر ڈال کر اسے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کا برحق ہونا اغلب ہے۔ مگر اغلبیّت سے بڑھ کر وہ بھی کوئی حکم نہیں لگا سکتا کیونکہ مِسل پر جو کچھ مواد ہے اس کی بنا پر یہ کہنا اس کے لیے مشکل ہے کہ امر واقعی کیا ہے۔ وہ فریقین میں سے ایک کو ترجیح دے سکتا ہے لیکن قطعیت اور یقین کے ساتھ کسی کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتا۔

مکذبین کی پوزیشن یہ ہے:۔

۱۔ حقیقت کے متعلق ان کے نظریئے مختلف ہیں اور کسی ایک نکتہ میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی گروہ کے افراد میں بسااوقات اختلاف پایا گیا ہے۔

۲۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ ان میں سے کوئی گروہ اس سے زیادہ کسی چیز کا مدعی نہیں ہے کہ ہمارے قیاسات دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ وزنی ہیں۔ مگر اپنے قیاسات کا قیاسات ہونا سب کو تسلیم ہے۔

۳۔ اپنے قیاسات پر ان کا اعتقاد، ایمان ویقین اور غیر متزلزل وثوق کی حد تک نہیں پہنچا ہے۔ ان میں کا ایک شخص کل تک جس نظریہ کو پورے زور کے ساتھ پیش کر رہا تھا، آج خود اسی نے اپنے پچھلے نظریہ کی تردید کر دی اور ایک دوسرا نظریہ پیش کر دیا۔ عمر، عقل، علم اور تجربے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اکثر ان کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔

۴۔ مدعیوں کی تکذیب کے لیے ان کے پاس بجز اس کے اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی صداقت کا کوئی یقینی ثبوت نہیں پیش کیا۔ انہوں نے وہ مخفی تار ہم کو نہیں دکھائے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ قمقموں اور پنکھوں وغیرہ کا تعلق انہی سے ہے، نہ انہوں نے بجلی کا وجود تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا، نہ بجلی گھر کی ہمیں سیر کرائی، نہ اس کی کلوں اور مشینوں کا معائنہ کرایا، نہ اس کے کارندوں میں سے کسی سے ہماری ملاقات کرائی، نہ کبھی انجینئر سے ہم کو ملایا، پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ سب کچھ حقائق ہیں؟

مدعیوں کی پوزیشن یہ ہے:

۱۔ وہ سب آپس میں متفق القول ہیں۔ دعوے کے جتنے بنیادی نکات ہیں ان سب میں ان کے درمیان کامل اتفاق ہے۔

۲۔ ان سب کا متفقہ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

۳۔ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم اپنے قیاس یا گمان کی بناء پر ایسا کہتے ہیں بلکہ سب نے بالاتفاق کہا ہے کہ انجینئر سے ہمارے خاص تعلقات ہیں، اس کے کارندے ہمارے پاس آتے ہیں، اس نے اپنے کارخانے کی سیر بھی ہم کو کرائی ہے اور ہم جو کچھ کہتے ہیں علم و یقین کی بناء پر کہتے ہیں۔ ظن و تخمین کی بناپر نہیں کہتے۔

۴۔ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے اپنے بیان میں ذرہ برابر بھی تغیر و تبدل کیا ہو۔ایک ہی بات ہے جو ان میں کا ہر شخص دعوے کے آغاز سے زندگی کے آخری سانس تک کہتا رہا ہے۔

۵۔ان کی سیرتیں انتہادرجہ کی پاکیزہ ہیں، جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کچھ لوگ زندگی کے تمام معاملات میں سچے اور کھرے ہوں، وہ خاص اسی معاملہ میں بالاتفاق کیوں جھوٹ بولیں۔

۶۔اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ دعوے پیش کرنے سے ان کے پیش نظر کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ برعکس اس کے یہ ثابت ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے اس دعوے کی خاطر سخت مصائب برداشت کیے ہیں۔ جسمانی تکلیفیں سہیں، قید کیے گئے، مارے اور پیٹے گئے، جلاوطن کیے گئے، بعض قتل کر دیئے گئے، حتیٰ کہ بعض کو آرے سے چیر ڈالا گیا، اور چند کے سوا کسی کو بھی خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی میسر نہ ہوئی۔ لہذا کسی ذاتی غرض کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ ان کا ایسے حالات میں اپنے دعوے پر قائم رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اپنی صداقت پر انتہادرجہ کا یقین تھا۔ ایسا یقین کہ اپنی جان بچانے کے لیے بھی ان میں سے کوئی اپنے دعوے سے باز نہ آیا۔

۷۔ان کے متعلق مجنوں یا فاتر العقل ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں وہ سب کے سب غایت درجہ کے دانشمند اور سلیم العقل پائے گئے ہیں۔ان کے مخالفین نے بھی اکثر ان کی دانشمندی کا لوہا مانا ہے۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کو اسی خاص معاملہ میں جنون لاحق ہو گیا ہو؟ اور وہ معاملہ بھی کیسا؟ جو ان کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا ہو، جس کے لیے انہوں نے دنیا بھر کا مقابلہ کیا ہو، جس کی خاطر وہ سالہا سال دنیا سے

لڑتے رہے ہوں، جو ان کی ساری عاقلانہ تعلیمات کا (جن کے عاقلانہ ہونے کا بہت سے مکذبین کو بھی اعتراف ہے) اصل الاصول ہو۔

۸۔انہوں نے خود بھی یہ نہیں کہا کہ ہم انجینئر یا اس کے کارندوں سے تمہاری ملاقات کرا سکتے ہیں، یا اس کا مخفی کارخانہ تمہیں دکھا سکتے ہیں، یا تجربہ اور مشاہدہ سے اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ خود ان تمام امور کو غیب سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ہم پر اعتماد کرو اور جو کچھ ہم بتاتے ہیں اسے مان لو۔

فریقین کی پوزیشن اور ان کے بیانات پر غور کرنے کے بعد اب عقل کی عدالت اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ چند مظاہر و آثار کو دیکھ کر ان کے باطنی اسباب و علل کی جستجو دونوں فریقوں نے کی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ بادی النظر میں سب کے نظریات اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ اولاً: ان میں سے کسی میں استحالہ عقلی نہیں ہے۔ یعنی قوانینِ عقلی کے لحاظ سے کسی نظریہ کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن ہے۔ ثانیاً: ان میں سے کسی کی صحت، تجربے یا مشاہدے سے ثابت نہیں کی جا سکتی نہ فریقِ اول میں سے کوئی گروہ اپنے نظریات کا ایسا سائنٹفک ثبوت دے سکتا ہے جو ہر شخص کو یقین کرنے پر مجبور کرے اور نہ فریق ثانی اس پر قادر یا اس کا مدعی ہے۔ لیکن مزید غور و تحقیق کے بعد چند امور ایسے نظر آتے ہیں جن کی بناء پر تمام نظریات میں سے فریق ثانی کا نظریہ قابل ترجیح قرار پاتا ہے۔

اولاً، کسی دوسرے نظریے کی تائید اتنے کثیر التعداد عاقل، پاک سیرت، صادق القول آدمیوں نے متفق ہو کر اتنی قوت اور اتنے یقین و ایمان کے ساتھ نہیں کی ہے۔

ثانیاً، ایسے پاکیزہ کریکٹر اور اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں اس دعوے پر متفق ہو جانا کہ ان سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعہ علم ہے، اور ان سب نے اس ذریعہ سے خارجی مظاہر کے باطنی اسباب کو معلوم

کیا ہے، ہم کو اس دعوے کی تصدیق پر مائل کر دیتا ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اپنی معلومات کے متعلق ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جو معلومات انہوں نے بیان کی ہیں ان میں کوئی استحالہ عقلی بھی نہیں ہے اور نہ یہ بات قوانین عقلی کی بناء پر محال قرار دی جا سکتی ہے کہ بعض انسانوں میں کچھ ایسی غیر معمولی قوتیں ہوں جو عام طور پر دوسرے انسانوں میں نہ پائی جاتی ہوں۔

ثالثاً، خارجی مظاہر کی حالت پر غور کرنے سے اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فریق ثانی کا نظریہ صحیح ہو۔ اس لیے کہ قمقمے، پنکھے، گاڑیاں، کارخانے وغیرہ نہ تو آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کا روشن اور متحرک ہونا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نہ اُن کی روشنی و حرکت ان کے مادہ جسمی کی ترکیب کا نتیجہ ہے کیونکہ جب وہ متحرک اور روشن نہیں ہوتے، اس وقت بھی یہی ترکیب جسمی موجود رہتی ہے۔ نہ ان کا الگ الگ قوتوں کے زیر اثر ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بسا اوقات جب قمقموں میں روشنی نہیں ہوتی تو پنکھے بھی بند ہوتے ہیں، ٹرام کاریں بھی موقوف ہو جاتی ہیں اور کارخانے بھی نہیں چلتے۔ لہذا خارجی مظاہر کی توجیہہ میں فریق اول کی طرف سے جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ سب بعید از عقل و قیاس ہیں۔ زیادہ صحیح یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام مظاہر میں کوئی ایک قوت کار فرما ہو اور اس کا سر رشتہ کسی ایسے حکیم توانا کے ہاتھ میں ہو جو ایک مقررہ نظام کے تحت اس قوت کو مختلف مظاہر میں صرف کر رہا ہو۔

باقی رہا متشکّکین کا یہ قول کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اور جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، تو حاکم عقل اس کو بھی درست نہیں سمجھتا کیونکہ کسی بات کا واقعہ ہونا اس کا محتاج نہیں ہے کہ وہ سننے والوں کو سمجھ میں بھی آ جائے۔ اس کے وقوع کو تسلیم کرنے کے لیے معتبر اور متواتر شہادت کافی ہے۔ اگر ہم سے چند معتبر آدمی آ کر کہیں کہ ہم نے زمینِ مغرب میں آدمیوں کو لوہے کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہوا پر اڑتے دیکھا ہے، اور ہم اپنے کانوں سے لندن میں بیٹھ کر امریکہ کا گانا سن آئے ہیں، تو ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ جھوٹے اور مسخرے تو نہیں ہیں؟ ایسا بیان کرنے میں ان کی ذاتی غرض تو نہیں ہے؟ ان کے دماغ میں کوئی فتور تو نہیں ہے؟ اگر

ثابت ہو گیا کہ وہ نہ جھوٹے ہیں، نہ مسخرے، نہ دیوانے، نہ ان کا کوئی مفاد اس روایت سے وابستہ ہے، اور اگر ہم نے دیکھا کہ اس کو بلا اختلاف بہت سے سچے اور عقلمند لوگ پوری سنجیدگی کے ساتھ بیان کر رہے ہیں تو ہم یقیناً اس کو تسلیم کر لیں گے، خواہ لوہے کی گاڑیوں کا ہوا پر اڑنا اور کسی محسوس واسطہ کے بغیر ایک جگہ کا گانا کئی ہزار میل کے فاصلہ پر سنائی دینا کسی طرح ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو۔

یہ اس معاملہ میں عقل کا فیصلہ ہے، مگر تصدیق و یقین کی کیفیت جس کا نام ''ایمان'' ہے، اس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لیے وجدان کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے دل کے ٹُھک جانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اندر سے ایک آواز آئے جو تکذیب، شک اور تذبذب کی تمام کیفیتوں کا خاتمہ کر دے اور صاف کہہ دے کہ لوگوں کی قیاس آرائیاں باطل ہیں، سچ وہی ہے جو سچے لوگوں نے قیاس سے نہیں بلکہ علم و بصیرت سے بیان کیا ہے۔

تحریر سید مودودی

انبیاءؑ کی گواہی پر اعتبار اور اسکی معقولیت پر ایک بحث

یہ تحریر مذھب پر کئے جانے والے ایک اعتراض کے استدلال کی غلطی کو واضح کرنے کے لیے ہے،اس سے ہمارا مقصود کسی کی توہین نہیں بلکہ صرف بات کو سمجھانے کے لیے ایک ذاتی مسئلے کو زیر بحث لایا جارہا ہے کہ ''اعتبار کرنے کے نکتہ نظر سے'' سائنس کا معاملہ بھی تقریبا اسی نوعیت کا ہے جس نوعیت کا مذھب کا۔اس جہت کے لحاظ سے دونوں میں فرق ثابت کرکے سائنس کو مذھب پر جو ایک بہت بڑی اتج دینے کی کوشش کی جاتی ہے نیز اس بناپر مذہب پر سوال کھڑا کیا جاتا ہے وہ فرق ہی اصولا درست نہیں۔ لہذا اس بناپر جو سوال کھڑا کیا جاتا ہے وہ بھی غلط ہے۔ایڈمن

☆☆☆

ملاحدہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تم اہل مذہب نبی کے سچا ہونے کی بناپر اس پر اعتماد کرکے جو سب کچھ مانتے ہو تو یہ غیر عقلی رویہ ہے۔اس کے جواب میں اگر انہیں کہا جائے کہ یہ جسے آپ لوگ اپنا والد کہتے پھرتے ہیں (اور اس بناپر اپنے ناموں کے ساتھ پٹھان، پنجابی، جٹ، آرائیں وغیر ہم لگائے پھرتے ہیں) یہ بھی تو صرف ایک عورت ہی کی گواہی کی بنا پر ہے کہ ''فلاں تمھارا باپ ہے''، وہ بھی ایسی عورت جسے کئی معاملات میں ہم خود جھوٹ بولتا دیکھتے ہیں، تو اسکے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس مسئلے کو ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر یہ بات اتنی سادہ نہیں اور نہ ھی اس سے ان ملاحدہ کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے کیونکہ اس معاملے میں بھی انہیں بے شمار مفاد پرست اور بسا اوقات جھوٹے و بد کردار ڈاکٹروں و نرسوں پر بھروسا کرنا ہوگا۔ مثلا:

1. خون کا سمپل جس سرنج کے ذریعے لیا جارھا ہے نیز جس بوتل میں اسے محفوظ کیا جارھا ہے وہ میڈیکلی درست حالت میں ھیں (تاکہ خون کے خلیوں کے اثرات ضائع نہ ھوں)۔ جن مشینوں کے ذریعے رپورٹ لی جارھی ھے وہ بھی بھترین، عمدہ واپ ڈیٹڈ ھیں۔اب کونسے میڈیکل انسٹرومنٹس و مشینیں وغیرہ واقعی درست واپ ڈیٹڈ ھیں اسکا فیصلہ کرنے کے لئے ان مشینوں سے متعلق وسیع میڈیکل علم کی ضرورت ھے

2. کسے معلوم کہ خون کے سمپل پر واقعی ٹیسٹ اپلائی کیا گیا؛ یہ بھی تو ممکن ھے کہ یونہی رپورٹ بنا کر ان کے ھاتھ میں تھمادی گئی ہو، کونسا انکے سامنے ٹیسٹ ھوتا ھے، یہ تو سمپل دے کر گھر آجاتے ہیں۔ پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ انہی کی رپورٹ ان کو دی گئی؛ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی اور کے ٹیسٹ کی رپورٹ پر انکا نام لکھ کر انہیں تھمادی گئی ہو وغیر ھم۔

3. پھر میڈیکل سائنس وجہ نیٹکس کا سارا علم بھی تو ظنی ہے، اس میں کئی نظریات بیک وقت موجود ھوتے ھیں۔ اب کونسا نظریہ درست ھے اسکا فیصلہ کرنے کے لئے بھی وسیع علم کی ضرورت ھے۔

4. اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ڈی این اے رپورٹ واقعی آپ کی ہوئی تو اپنے مرے ہوئے دادا نانا کی نسبت کا کیا کریں گے؟

الغرض ان ملاحدہ کے پاس اپنی حلت نسلی کو ثابت کرنے کا ''سوائے اعتبار کرنے'' کے کوئی چارہ نہیں۔ دوسرا راستہ یہ ھے کہ سب ملحدین بذات خود یہ تمام متعلقہ علم سیکھ کر، تمام انسٹرومنٹس خود ایجاد کر کے اور اپنی ھی زیر نگرانی یہ ٹیسٹ کروا کر اپنی اپنی رپورٹس پیش کریں۔

☆اعتبار کرنا پڑتا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تقریبا ساری زندگی اعتبار کی بنیاد پر قائم ہے، یہ سمجھنا کہ جدید انسان تو اپنی زندگی کا ہر فیصلہ سائنسی شواھد کی بنیاد پر کرتا ہے، محض ایک افسانہ ہے۔

1. ایک میڈیکل سٹور سے دوا خرید کر اس پر ایکسپائری ڈیٹ دیکھی اور بغیر میڈیکل ٹیسٹ کئے کھالی، کیوں؟ دوا بنانے والی کمپنی اور بیچنے والے دکاندار پر ''اعتبار''؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایکسپائری ڈیٹ غلط لکھی ہو؟

2. ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانے کا آرڈر کیا اور سرو ہونے پر کھانے کی سائنسی رپورٹ کے بغیر فوراً اندر انڈیل لیا، کیوں؟ ریسٹورنٹ والوں پر ''اعتبار''، کیا یہ ممکن نہیں کہ کھانے میں غیر صحت بخش اجزاء شامل ہوں؟

3. سپر سٹور سے کھانے کی چیز کا ڈبہ خریدا، اس پر اجزاء پڑھے اور بغیر لیبارٹری ٹیسٹ استعمال کر لیا، کیوں؟ کمپنی پر ''اعتبار''، کیا یہ ممکن نہیں کہ ڈبے پر اجزاء غلط لکھے ہوں؟

4. ڈرائیور کا لائسنس چیک کئے نیز اس لائسنس کے درست ہونے کی تصدیق کئے نیز تصدیق کرنے والے ادارے کے مصدقہ ہونے کی تصدیق کئے بغیر بس پر سوار ہو جاتے ہیں، کیوں؟ بس کمپنی پر ''اعتبار''

درج بالا سب پر اعتبار کیونکہ یہ ''اعتبار'' ہے کہ ریاست سب پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے۔ گویا ایک ''اعتبار'' کے پیچھے دوسرا ''اعتبار''۔ الغرض صبح سے لے کر شام تک اپنے روزمرہ کے فیصلوں کے بارے میں سوچتے جائیں، ان میں 95 فیصد سے زائد کام ایسے ہونگے جہاں 99 فیصد سے زیادہ انسان کسی نہ کسی پر اعتبار ہی کر رہے ہوتے ہیں، وہ بھی ایسے افراد اور اداروں پر جن کے بارے میں انہیں آئے روز جھوٹ و فراڈ میں ملوث ہونے کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ تو اگر ایک سچے شخص (نبی) پر اعتبار کر کے کچھ مزید حقائق کا اعتراف کر لیا جائے تو اس ''اعتبار'' میں فی نفسہ ۔ اعتبار ہونے کے لحاظ سے عقلاً کیا مسئلہ ہے؟

☆ سائنسی علم پر ''اعتبار''

بعض لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ روزمرہ زندگی کے جن امور پر ہم اعتبار کر رہے ہیں انہیں اصولاً ہر شخص سائنسی علوم کے پیمانے پر جانچ کر سمجھ سکتا ہے۔ یہ دعوی بھی محض ایک ''اعتبار'' ہی ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی علوم میں کسی نظریئے و دعوے کا اثبات جن علمی ظروف (مثلاً میتھمیٹکس وغیرہ) کے ذریعے اور جس اعلی علمی سطح پر کیا جاتا

ہے انہیں سمجھنا عام آدمی تو درکنار متعلقہ مضمون کے اچھے خاصے ماہر واستاد کے لئے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہر سائنسی مضمون کے اعلی سطح کے ماہرین آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہی تبادلہ خیال (communicate) کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ وہ باتیں صرف وہی محدود سے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بعد میں اس مضمون کا کوئی ماہر ان تمام مباحث کو کم تر درجے والے ماہرین کے تعارف کے لئے سادہ سی زبان میں لکھ دیتا ہے کہ ماہرین کے درمیان اب یہ بحث چل رہی ہے۔ پھر یہ کم تر درجے والے اساتذہ ان تعارفی مقالوں کے ذریعے انہیں اپنے طلباء کو سکھا دیتے ہیں اور کچھ لوگ انہیں دلچسپ جان کر اخباری کالمز یا ٹی وی پروگرامز کی زینت بنا کر عوام کے سامنے پیش کرنے لگتے ہیں کہ ''سائنس دانوں یا سائنس کے مطابق فلاں فلاں۔۔۔۔'' جبکہ یہ دعوے کرنے والوں کی 99.99 فیصد اکثریت میں یہ علمی لیاقت ہی نہیں ہوتی کہ وہ متعلقہ ماہرین کے اصل ماخذات (پیپرز یا مقالہ جات) کو سمجھ بھی سکیں۔ بس سب کچھ اعتبار پر چل رہا ہوتا ہے کہ ''اتنا بڑا ماہر علم ہے، پوری زندگی لگا دی اس نے، تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہو گا''۔

یہ حال تقریباً ہر پختہ سائنسی علم کا ہے، تو اب جن لوگوں کو اعتبار کے اصول پر اعتراض ہے انہیں چاہئے کہ پہلے تمام سائنسی علوم کے ماہر بنیں اور پھر زندگی کے فیصلے کرنا شروع کریں۔ پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس ''سنہرے اصول'' کے سہارے ایک بھی فیصلہ نہ کر پائیں گے کیونکہ ان علوم میں مہارت سے قبل ہی موت واقع ہو جائے گی۔ الغرض خود تو ساری زندگی اعتبار کے سہارے گزارتے ہیں اور اہل مذہب کو طعنہ دیتے ہیں کہ ''تم نبی پر اعتبار کرتے ہو''۔ تو بھائی تم اس کے سواء کیا کر رہے ہو؟

☆ حیلہ: ''سائنسی علم کی جانچ تو کوئی بھی کر سکتا ہے نا''

جب ملاحدہ کو کہا جائے کہ ''عملی زندگی میں آپ سب بھی بس اعتبار ہی کرتے ہیں'' تو اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم سائنس دانوں کی بات پر اعتبار کرتے ہیں البتہ ہمارے اور اہل مذہب کے اعتبار میں ایک جوہری فرق

ہے اور وہ یہ کہ سائنسی علم کو ہر شخص جانچ ((reproduce سکتا ہے، یعنی سائنسی علوم کے تجربے میں شامل ہونا ممکن ہے۔ اس کے برعکس وحی صرف ایک نبی کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے اور پوری دنیا کا کوئی بھی انسان اسے جانچ نہیں سکتا۔ یوں ان دونوں قسم کے اعتبار میں بہت فرق ہے، ایک کو جانچنا ''ہر کسی'' کے لئے ممکن ہے جبکہ دوسرے کو جانچنا ''کسی کے لئے بھی'' ممکن نہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے سائنسی علم پر اعتبار زیادہ علمی و قابل توجیہہ ہے۔

اس جواب پر مختلف سطحوں پر گفتگو کرنا ممکن ہے، سر دست اس میں پیوست ایک غیر ثابت شدہ مفروضے کی نشاندہی کرنا مقصود ہے۔ اصلا اس جواب میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ''سائنس میں اپنے مخصوص ایریا آف سمیشلائزیشن سے باہر دیگر سائنسی علوم کو جانچنے کے پیمانے موجود ہیں، چنانچہ 'ہر سائنس دان' کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ چاہے تو ان کی جانچ کر لے۔'' یہ دعوی صرف ایک فرضی قضیہ ہے جو خود سائنسی علمی پیمانے پر پورا نہیں اترتا۔ دیکھئے جب آج تک ایسا کوئی انسان گزرا ہی نہیں کہ جس نے تمام علوم میں شمولیت کے بعد انکی سچائی کو جان لیا ہو، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فرضی قضیئے کی سچائی کی کیا دلیل ہے کہ ''سائنس دان بغیر جانے جن حقیقتوں کو مان رہا ہے اگر کوئی چاہے تو اسے پرکھ سکتا ہے؟'' آخر بذات خود یہ قضیہ آج تک کس انسان نے verify کر کے ثابت کیا کہ 'میرے محدود سے علم کے باہر جو کچھ سائنسی علم ہے وہ سائنسی پیمانوں پر ثابت شدہ ہی ایک سچائی ہے اور میں نے اسے verify کر لیا ہے، لہذا اب کوئی بھی ایسا کر سکتا ہے؟'' تو جو قضیہ آج تک کسی انسان نے verify کیا ہی نہیں اور نہ ہی اس کا امکان ہے اس کی بنا پر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ''ہر انسان کے لئے ایسا کرنا ممکن ہے؟'' آخر کسی شخص کو یہ کیسے پتہ چلا کہ جس علم کا وہ ماہر نہیں اسے پرکھا جا سکتا ہے جبکہ اس نے ابھی اسے پرکھا ہی نہیں؟!

اتنا ہی نہیں، بلکہ اپنے محدود سے سائنسی علم کے باہر جو بے انتہاء علم موجود ہے اس کے بارے میں یہ کون کہہ سکتا ہے اور کس نے ایسا کیا؟ دیکھئے کسی دعوے کو جانچنے کا سائنسی پیمانہ یہی ہے نا کہ یا تو وہ تجرباتی مشاھدے میں آیا ہو اور یا منطقی طور پر قابل مشاھدہ ہو۔ تو یہ دعوی کہ ''سائنسی علوم کی سائنسیت کو کوئی بھی انسان جانچ سکتا ہے'' ان دونوں پیمانوں پر پورا نہیں اترتا، ایسا انسان نہ تو کبھی گزرا اور نہ گزرے گا جو یہ کہہ سکے کہ ''تمام سائنسی علوم reproducible ہیں

اور میں نے یہ verify کر لیا ہے''۔ چنانچہ جانچ کئے بغیر یہ صرف ''اعتبار'' پر مبنی ایک مفروضہ ہی ہے کہ میرے محدود سے علم کے باہر جو دیگر سائنسی علوم ہیں وہ سب بھی reproducible ہیں کیونکہ اس دعوے کی جانچ آج تک کسی نے نہیں کی اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ پس یہ دعوی صرف ایک فرضی قضیہ ہے، اس کی بنیاد پر اعتراض تب درست ہے جب پہلے اسے ثابت کر دیا جائے۔ تو یہ کیونکر مان لیا جائے کہ ''سائنسی علوم کو ہر شخص reproduce کر سکتا ہے؟'' ہمارا کہنا یہ ہے کہ نہیں کر سکتا، ہر سائنسی علم کے حقائق و تجربات نہایت ہی محدود لوگوں کے ذاتی تجربات ہی تھے اور رہیں گے، اپنے ان محدود تجربات سے باہر ہر کسی کو بس یہ ''اعتبار'' ہی ہے کہ دوسرے سب لوگوں کا علم بھی اسی طرح جانچ کے لائق ہی ہو گا۔!

یہ تو تھا اس جواب کا ایک منطقی تجزیہ۔ اب آیئے عملی پہلو کی طرف۔ عملا ملاحدہ بھی وہی کر رہے ہیں جس کا وہ اھل مذھب کو طعنہ دیتے ہیں۔ کسی ایک علم میں شریک ہو کر حقائق معلوم کرنے والا سائنسدان بھی اس نہایت ہی محدود سے علم سے باھر دیگر تمام سائنسی علوم میں ایک اعتبار کرنے والا بے بس مقلد ہی ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے ہی مضمون کے ایک چھوٹے سے ایریا کا ماھر ہوتا ہے، خود اس کے مضمون میں بھی اس کے ایریا آف سپیشلائزیشن سے باھر کا علم نہایت وسیع ہوتا ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ ایک بڑے سے بڑے سائنسدان کی زندگی کا بھی 99 فیصد حصہ دوسرے ماھرین پر اعتبار کے سہارے قائم ہوتا ہے۔ کیا کوئی ایسا سائنسدان ہے جس نے تمام سائنسی علوم کے حقائق میں شمولیت اختیار کر کے زندگی گزاری ہو؟ ایسا نہ تو کوئی تھا اور نہ ہی ہو گا۔

یہ جواب کسی بھی طرح ملاحدہ کا مسئلہ حل نہیں کرتا کیونکہ وہ علمی منزل جس پہ پہنچ کے کوئی شخص اس علم کو reproduce کر سکتا ہے ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد اکثریت کے لئے ممکن ہی نہیں ہوتی، گویا یہ تمام اکثریت ہمیشہ ایک نہایت ہی چھوٹی سی اشرافیہ کی بات ماننے اور ان پر اعتبار کرنے پر مجبور ہے کہ ''انکی بات ٹھیک ہی ہو گی''۔ دوسری طرف وحی کے تجربے کی گواھی کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ھزار انسانوں نے دی جنہیں انکے

معاشرے کے ھزاروں لاکھوں انسانوں نے صادق و امین پایا۔ لہذا ''عملی زندگی'' میں صورت حال ایک ہی رھتی ہے۔

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ''سائنسی علوم کم از کم ان لوگوں پر تو ثابت ہیں جو انہیں پڑھتے ہیں جبکہ وحی کا علم کسی پر بھی ثابت نہیں'' تو یہ دعوی اپنی نوعیت میں بذات خود ایک ذاتی تجربے جیسا ہے۔ مثلا میرے والد کے لئے فزکس کی سائنسی جانچ ثابت نہیں اور عمر کے جس حصے میں وہ پہنچ چکے اب انکے لئے یہ کرنا ممکن بھی نہیں۔ بتایئے اب وہ کسی ماھر فزکس کے ذاتی تجربے پر کیوں اعتبار کریں؟ اور اگر اعتبار کریں تو اس اعتبار میں جوھری طور پر کیا فرق ہے؟

رہی یہ بات کہ ''علمی و منطقی اعتبار سے علمی معیار کے قریب کونسا علم ہے'' تو اس کا جواب تو اس پر منحصر ہے کہ ''علمی معیار'' کسے مانا جارھا ھے؟ ھر معلومات کو جانچنے کا علمی معیار الگ الگ ہے۔ ٹماٹر لال ہے کو جانچنے کا معیار بصارت صحیحہ ہے، دو جمع دو چار ہوتے ہیں کو جانچنے کا معیار منطق صحیحہ ہے، اور ماضی کے کسی واقعے کی سچائی کو جانچنے کا معیار مخبر کے کردار پر ہے۔ اگر مخبر سچا ہے اور اسکی بات ایسی ہے کہ جس کو عقل ناممکن نہ کہے بلکہ اسکی ضرورت کی قائل ہو تو ایسی بات کو ماننا ہی علمی معیار کے مطابق ہے۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ وحی کو تجرباتی علوم کے پیمانوں پر جانچ کر اس کی تصدیق کا مطالبہ کرنا بذات خود حماقت انگیز استدلال ہے کیونکہ وحی خبر ہے اور خبر ان پیمانوں پر قابل جانچ نہیں ہوتی جن پیمانوں ہر حواس کا علم قابل جانچ ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ''نیوٹن نامی ایک انسان گزرا ہے'' اس دعوے کو میں تب مانوں گا جب کوئی مجھے کسی دوربین میں نیوٹن دکھادے یا کسی تجربے سے اسے ثابت کردے تو اس کی عقل پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔ ہر دعوے کے اثبات کے لئے دلیل دعوے کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے۔

خدااور مادی اسباب

بنا کسی گہری یا فلسفیانہ بحث میں جائے خدا کے وجود کو ثابت کرنے لیے جب ہم بات کرتے ہیں تو یہ بدیہی استدلال اس طرح دیا جائے گا کہ

1۔ہر چیز کا کوئی خالق ہے۔(بدیہی مشاہدہ)

2۔کائنات میں ہم جو بھی بنتا بگڑتا دیکھتے ہیں اس کے لیے کوئی نہ کوئی ذمہ دار ہے۔کوئی کارخانہ، کوئی کشتی، کوئی عمارت، کوئی بھی گاڑی، اپنے آپ نہیں بنتی۔ہر چیز بنائی جاتی ہے۔(بدیہی مشاہدہ)

3۔ایک پینڈو گنوار کے ہاتھ میں بھی اگر چاول یا گندم کی بوری لا کر رکھ دی جائے تو وہ یہ نتیجہ نکالنے میں قطعاً متردد نہیں ہو گا کہ ان چاول یا گندم پر کاشت سے لے کر کٹائی اور صفائی تک کا ایک دور گزرا ہے۔(بدیہی مشاہدہ)

4۔ مرغی کے انڈے میں ایک بچے کی پیدائش کیونکر ممکن ہوئی؟

ان تمام مشاہدات کی روشنی میں ایک ہی توجیہہ بنتی ہے کہ کوئی نادیدہ طاقت ہے جو انڈے میں بچے کو بنانے کا کام کرتی ہے۔

واضح رہے کہ یہاں بحث یہ نہیں کہ وہ طاقت اس بچے کو بنانے کا کام کیسے کرتی ہے؟ لیکن کرتی ہے۔ یہ ضروری امر ہے۔

یہ تو بات ہوئی ایک انڈے کی۔

اب آجائیں کائنات پر۔

ایک پینڈو گنوار شخص یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جس طرح ہر چیز کو بنانے والا کوئی ہے اس طرح کائنات بھی کسی نے بنائی ہے۔ یہ بات کتنی غیر منطقی ہو سکتی ہے اس میں نِزاع ہے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے۔ وہ یہ کہ ایک سادہ سی منطقی تفہیم رکھنے والا شخص کم از کم اس بات پر خود کو آمادہ قطعاً نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات اپنے آپ بن گئی۔ یہ اپنے آپ بننے والا فارمولا ہر کسی کو ہضم نہیں ہوتا۔ ایک بدیہی مشاہداتی علم کی موجودگی میں یہ اپنے آپ اور خود بخود والے مرحلے کو کس طرح سمجھایا جائے؟ دوسری طرف اے بائیو جینیسس کے نظریے میں جب یہ کہا گیا کہ مٹی اور کیچڑ میں مچھر اور مکھیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں تو یہاں ٹھنڈا ہو کر بیٹھنے کی بجائے مزید تحقیقات جاری رکھیں اور ثابت کیا گیا کہ ایسا نہیں ہوتا۔ خود بخود کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی جاندار تو چاہیے جو جاندار پیدا کر سکے۔

مسئلہ یہاں آکر پیدا ہو رہا ہے کہ ہر چیز میں ''مادی اسباب'' کارفرما ہیں۔ اس وجہ سے اس نادیدہ طاقت یا ''خدا'' کا انکار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم ایک اور بات جو بھول جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا یہ مادی اسباب خود بخود چل رہے ہیں؟ یا ان کو کوئی گائیڈ بھی کہیں سے مل رہی ہوتی ہے۔ اگر آپ اسے یہ کہیں کہ یہ مادہ کی خصوصیات ہیں تو سوال

اٹھے گا کہ کیامادہ کی ''خصوصیات'' کا کوئی حقیقی وجود ہے؟ یا یہ فرضی داستان ہے؟ اگر وجود ہے تو ان خصوصیات کا تعین کون کرے گا؟ ایک بات تو طے ہے کہ آپ مادی اسباب اور خصوصیات کی موجودگی کا جھانسہ دے کر جان نہیں چھڑا سکتے۔ پانی یونٹ ایٹمو سفیرک پریشر پر سو درجہ حرارت سیلسیس پر ابلے گا۔ یہ قانون خود ہی طے ہوا یا اس ''قانون'' کا کوئی سبب ہو گا؟ اگر سبب ہو گا تو اس سبب کا کیا سبب ہو گا؟ اور یہ سبب کی کڑی کی شروعات کہاں ہو گی؟ یا پھر سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ''سبب'' اپنی ماہیت میں کیا چیز ہے؟ اور یہ کہاں سے اور کیسے وجود میں آئی؟ مادے کو کس نے اس ''سبب'' کا پابند بنایا؟

ایک بیج کو جرمنیشن کے لیے بنیادی طور پر تین چیزیں ضروری ہیں۔ پانی، آکسیجن اور مناسب درجہ حرارت۔ ان کی موجودگی میں وہ بیج جرمنیٹ کرتا ہے۔ لیکن لیکن لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن کیوں؟

انہی کی موجودگی میں کیوں؟

خدا کی غیر موجودگی کا مقدمہ لڑنے والے سائنس کو ہتھیار بنا کر خدا کا غیر دریافت شدہ ہونا اس کے غیر موجود ہونے پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس نکتے کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ سائنس کہیں بھی خدا کی غیر موجودگی کا مقدمہ نہیں لڑتی۔ ہاں یہاں یہ سوچ ضرور کام کرتی ہے کہ ہر چیز میں مادی اسباب کا دخل ہے۔ اس جھانسے کی بات اوپر گزر چکی ہے۔

اب اسی انڈے پر آجائیں۔ جی جی مجھے معلوم ہے، آپ کہیں گے انڈے سے بچے خدا نہیں نکالتا۔ اس کے سوتے ہوئے ایمبریو کو جگانا پڑتا ہے۔ مناسب آب وہوا کی موجودگی میں جب بیضہ جاگتا ہے تو بچے کی پیدائش شروع ہوتی ہے۔

آپ ٹھیک ہیں۔ مجھے اس بات سے کوئی انکار نہیں۔ مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ آپ خدا کے کسی چیز کے پیدا کرنے کو اس کے ''ہاتھ'' سے نقش و نگار کرنا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ نظریہ غیر ممکن ہے۔ یہاں نزاع لفظی یا پھر تصوراتی ہے۔ تخلیق

((Creationاور طریقۂ تخلیق((process of creationکا ہے۔آپ یہ کہیں گے کہ انڈہ بغیر کسی رہنمائی((Guidanceکے بچے میں بدل جاتا ہے۔اور ہم کہتے ہیں اسے رہنمائی ملتی ہے اس خاص میٹا بولزم اور ری ایکشنز کے اس خاص ترتیب((Sequenceمیں ہوتے رہنے کی۔ گویا آپ جسے سائنسی یا فطری عوامل کہیں گے اسے ہم طریقۂ تخلیق کہتے ہیں۔ تحریر:مزمل شیخ بسمل

تجرباتی علم پر وجود خدا کو پرکھنے والوں کی بنیادی اغلاط

جو لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ ''اگر تجرباتی یا امپیریکل (حواس پر مبنی) دلیل (evidence) کی بنیاد پر وجود خداوندی ثابت نہیں کیا جاسکتا تو اسکا مطلب وجود خداوندی کا عدم وجود ھے'' ایسے لوگ قابل رحم حد تک عقل کے دشمن ہیں۔انکا یہ دعوی تہہ در تہہ فلسفیانہ اغلاط کا مجموعہ ھے، یہاں چند ایک بیان کی جاتی ھیں۔

1.ان حضرات کو اتنی بنیادی بات بھی معلوم نہیں کہ evidence کی نوعیت و ماہیت مطلوب evident یعنی subject of knowledge کا دائرہ تبدیل ھونے سے تبدیل ہو جاتی ھے، کسی ایک ہی قسم کے evidence کو حقیقت و علمیت کے تمام دائروں پر اپلائ کرنا کم عقلی کے سواء اور کچھ نہیں۔ جسے ''ثبوت'' کہا جاتا ہے وہ عقلی بھی ہوتا ہے، حسی بھی اور خبر پر مبنی بھی جبکہ ملحد ثبوت سے مراد صرف ''حسی'' لیتے ہیں۔اب الف ب سے بڑا ہے، ب ج سے بڑا ہے، تو معلوم ہوا کہ الف ج سے بڑا ہے۔اس کا کیا (حسی) ''ثبوت'' ہے؟ یا'' تمام الف ب ہیں، اور ج الف ہے، معلوم ہوا کہ ج ب ہے''۔اس استدلال کے درست ہونے کا کونسا حسی ثبوت ہے؟ ارسطو نامی شخص دنیا

میں گذرا۔اب اس کا(حسی)''ثبوت''کیا ہے؟الغرض ثبوت کی نوعیت دعوے کی نوعیت بدلنے سے بدل جاتی ہے۔ اہل مذہب کا دعوی یہ ہے کہ یہ کائنات تقاضا کرتی ہے کہ خدا کے وجود کو ماننا ایک عقلی لازمہ ہے نہ کہ حسی۔

2. پھر یہ طے کرنا بھی ضروری ھوتا ھے کہ جس شے کی) evidenceship مثلا تجرباتی دلیل) کی بنیاد پر کسی شے کے evident ھونے یا نہ ھونے کا فیصلہ کیا جارہا ھے کیا وہ evidence بذات خود اس لائق ھے بھی کہ اس معاملے میں اسپر اعتماد کیا جاسکے؟

3. پھر یہ طے کرنا بھی ضروری ھوتا ھے کہ کسی شے کے evidence کہلانے کیلئے اس میں کن صفات کا ھونا ضروری ھے((what is it to count as evidence کیونکہ فی الحقیقت کسی شے کا evidence ھونا اس میں پائی جانے والی ان صفات ہی کی بنا پر ھوتا ھے جو اصلا مطلوب مانی جارہی ہوتی ہیں۔ اگر وہ صفات جنکی بنیاد پر evidence کو evidence مانا جا رہا ھے وہ ہی بدیہی اور متفق علیہ نہ ھوں تو اس شے کو 'آفاقی عقلی evidence'مان کر ہر شے پر اپلائی کرنا نیز ہر شے کے وجود کیلئے اس پر پورا اترنے کا مطالبہ کرنا بذات خود ایک مہمل بات بن کر رہ جاتی ھے

4. تجرباتی علم کی بنیاد پر کسی شے کا ثبوت وعدم ثبوت طے کرنا دونوں ہی ناممکن باتیں ہیں، لہذا اس علم کی بنیاد پر وجود خداوندی کو کسنا پرلے درجے کی غیر عقلی بات ھے

5. انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تجرباتی علم کسی شے کا جواز((justification نہیں دیتا بلکہ محض اسکی ایک ممکنہ ظنی تشریح((probable explanation بیان کرتا ھے اور بس۔ دوسرے لفظوں میں امپیریکل دلیل (evidence for justification ھونے یا نہ ھونے کا جواز و دلیل) نہیں بلکہ محض evidence for (one's created explanation آپکی خود ساختہ بیان یا تشریح کی دلیل) کا درجہ رکھتی ھے۔اب ایسی دلیل کی بنیاد پر وجود خداوندی کو کسنا کہاں کی علمیت ھوئی؟

6. چلئے غلط طور پر ایک لمحے کیلئے مان لیتے ہیں کہ تجرباتی دلیل کسی شے کو کسی درجے میں ثابت کر سکتی ھے۔ لیکن مسئلہ استقراء(problem of induction) یہ بتاتا ھے کہ یہ کبھی حتمی، آفاقی اور کلی علم فراہم نہیں کر سکتی، یعنی جو کچھ اب تک اس کے دائرے میں نہیں آیا اس کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ھے کہ 'ہمیں نہیں معلوم کہ اسکا وجود ھے یا نہیں'، لیکن یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ 'ہمیں معلوم ھے کہ اسکا وجود نہیں ھے'۔ ایسا دعوی صرف ایک نادان امپیریسسٹ ہی کر سکتا ھے جسے اپنے علم کی حدود و قیود ہی کی خبر نہ ھو۔ دوسرے لفظوں میں امپیریکل نالج کی بنیاد پر کسی بھی درجے میں عدم وجود خداوندی کا دعوی کرنا ایک مضحکہ خیز اور فاش غلطی ھے (یعنی اس کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ھے کہ 'ہمیں نہیں معلوم کہ خدا ھے یا نہیں'، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ 'ہمیں معلوم ھے کہ خدا نہیں ھے'، چہ جائیکہ اس پر پوری جہالت اور ڈھٹائی کے ساتھ بحث بھی کی جائے)۔

7. یہ دلیل قائم کرنے والوں کا مفروضہ یہ ھے کہ امپیریکل نالج 'حقیقت جیسی کہ وہ ھے' اسے دریافت و معلوم کرنے کا نام ھے اور جو شے اس دائرہ علم کی گرفت میں نہیں آرہی وہ حقیقت ھے ہی نہیں۔ مگر یہ محض لغو مفروضہ ھے کیونکہ امپیریکل نالج 'حقیقت جیسی کہ وہ ھے' کی دریافت نہیں بلکہ 'حقیقت جیسی کہ انسان اپنی خواہشات کے مطابق بنانا چاہتا ھے کی تخلیق کا دائرہ ھے'، یعنی یہ اوبجیکٹو نہیں سبجیکٹو نالج ھوتی ھے۔ اب یہ عجیب تماشا ھے کہ علم کا ایک ایسا دائرہ جو میں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے خود سے وضع کر رکھا ھے ہر وہ جو شے جو اس دائرہ علم میں فٹ نہ آئے میں اسکے وجود ہی کا انکار کر دوں، فیاللعجب (اسکی مثال تو ایسی ہی ھے کہ میں اپنی مرضی کا ایک گھر تعمیر کروں اور جو شے اس گھر میں فٹ نہ آئے اسکے وجود ہی کا انکار کر دوں)۔ خود اپنے نفس کے اظہار کیلئے تعمیر کردہ علم کی بنیاد پر کائنات کی ہر شے یہاں تک کہ وجود خداوندی کو جانچ کر رد کرنا کیا کوئی علمی دعوی ھے؟ درحقیقت اس قسم کے دعوں کی علم کی دنیا میں کوئی وقعت نہیں ھوتی۔

بن دیکھے خدا پر یقین کیوں؟

ہمارے ہاں ایک مغالطہ عام ہو گیا ہے کہ سائنسی علم 'ایمان بالشہود' کا قائل ہے، جبکہ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے 'ایمان بالغیب' لازم ہے اور اس ایمان بالغیب سے مراد اندھا ایمان ہے۔ اس مغالطے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا ایمان خدا کے وجود پر غیر مستحکم ہو جاتا ہے۔ اس کا گمان ہوتا ہے کہ جب ایک ہستی حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں آسکتی تو ایک عام انسان کو خدا کے وجود پر کیسے قائل کیا جاسکتا ہے؟ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ مغالطہ، سائنس اور خدا کا یہ تقابل انتہائی نتائج پیدا کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس نظریے کا صحیح طرح جائزہ لے لیں۔

یہاں سب سے پہلے تو اس غلط فہمی کو رفع کر لینا چاہیے کہ سائنس صرف 'ایمان بالشہود' ہی کی قائل ہے۔ عصر حاضر میں بہت سی عظیم علمی حقیقتیں جو سائنس نے دریافت کی ہیں، جنھیں پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ علمی درس گاہوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ سراسر 'ایمان بالغیب' ہی کا ثمر اور نتیجہ ہیں۔ دوسری بات ہمیں یہ سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان بالغیب کے معنی بن دیکھے ماننے کے ہیں' بے سوچے سمجھے 'ماننے کے نہیں ہیں۔

ایمان بالشہود یا براہ راست تجربہ و مشاہدے کو ہی حقیقت سمجھنا تجربیت (Positivism) کہلاتا ہے۔ تجربیت کا فلسفہ مغربی عقلیت پسندی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے جس کی رُو سے چونکہ مذہبی تصورات مثلاً جنت و دوزخ یا خدا ہمارے

تجربے اور محسوسات کی دنیا سے باہر ہے اس لیے اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی میں اس نقطۂ نظر کے فروغ نے خدا کے عقیدے کو لوگوں کی نگاہ میں بے دلیل بنادیا اور بہت سے لوگوں نے اسے علمی اور عقلی اعتبار سے بے بنیاد عقیدہ کہہ کر رد کردیا کہ خدا کا وجود چونکہ براہ راست مشاہدے میں نہیں آسکتا تھا چنانچہ یہ کائنات کی ایک فرضی یا خود ساختہ توجیہہ ہے۔

تاہم بیسویں صدی میں صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ علم کے پھیلاؤ اور وسعت نے سائنس دانوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا کہ بے شمار علمی حقائق ایسے ہیں جن کا براہ راست مشاہدہ ممکن نہیں ہے، مگر ان کے بالواسطہ اثرات اس قدر واضح اور مبنی بر حقیقت ہیں کہ ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی ایک بہت بڑی مثال قانون تجاذب law of Gravitation ہے۔ یہ قانون بذات خود بالکل ناقابل مشاہدہ ہے۔ کشش ثقل کوئی مادی شے نہیں ہے جسے کوئی شخص آپ کے سامنے کھڑا کرسکے۔ لیکن اس کے اثرات اس قدر واضح اور حقیقی ہیں کہ اس کا انکار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح Energy یعنی قوت کو حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا، لیکن اس کے کمالات اور کارستانیوں سے سب واقف ہیں۔ آج کی سائنس محسوسات کے قفس سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اب سائنس بھی انرجی، اضافت، اور ویو میکانکس (Wave Mechanics) جیسے بے شمار ناقابل مشاہدہ امور کو تسلیم کرکے اسی ایمان بالغیب (بن دیکھے ماننے) کے قفس میں ہے۔ سائنسی حلقوں میں آج جتنے بھی نظریات قائم کیے گئے ہیں وہ سب اسی طرح بالواسطہ استنباط پر مبنی ہیں۔

جدید سائنس جیسے کوانٹم فزکس میں ہمیں حسی ثبوت نہیں ملتا بلکہ ہم مختلف ذرات کے اثرات کو بالواسطہ دیکھتے ہیں کسی مشین پر یا کسی سکرین پر جن میں اس کے اثرات گراف کی صورت میں یا نمبروں کی صورت میں نظر آتے ہیں. یہ اثرات نہ تو براہ راست مشاہدہ ہیں نہ حسی ثبوت ہیں لیکن ہم ان اثرات کو بنیاد بنا کر پوری ایک کائنات تصور کیے بیٹھے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں. کیونکہ یہ اثرات تقاضا کرتے ہیں کہ اُن ان دیکھے ذرات کے وجود کو تسلیم کیا جائے. خدا کے عقیدے پر استدلال کی نوعیت بھی یہی ہے۔ اگر آفاق و نفس کی نشانیاں خدا کے عقیدے کی تائید کر رہی ہیں اور ان

مشاہدات سے جائز طور پر خدا کے وجود کا استنباط ہو رہا ہو تو یہ عین جدید سائنسی منطق کے مطابق درست اور قابل تسلیم قرار پائے گا۔ اگر ایمان بالغیب یعنی استنباطی استدلال کو صرف اس لیے رد کر دیا جائے کہ وہ براہ راست مشاہدے کی چیز نہیں ہے تو اس سے صرف خدا کا عقیدہ ہی نہیں بلکہ سائنس کا پورا قلعہ زمیں بوس ہو جائے گا۔

مخالفین مذہب دراصل طریقِ استدلال کو نہ سمجھنے کے غلطی میں مبتلاء ہیں۔ وہ مذہب کے ان غیبی امور کو بھی براہ راست(Direct Observation) سمجھنا چاہتے ہیں جس کا تعلق استنباطی استدلال(Inference reasoning) سے ہے۔ مذہب کے ان امور کا تعلق چونکہ غیبیات سے ہے اس لیے اس پہلو کا مطالعہ براہِ راست استدلال کے بجائے استنباط کے منطقی اصول سے اسی طرح مطالعہ کر کے تسلیم کرنا چاہیے جس طرح اس اصول سے آج جدید سائنس کائنات سے متعلق ہونے والی تحقیقات میں ناقابل مشاہدہ امور کو معقول(Valid) سمجھتی ہے۔

کیا خدا کی موجودگی کا نظریہ غیر سائنسی ہے؟

سائنسی طریقہ کار دو باتوں پر یقین رکھتا ہے مشاہدہ اور تجربہ. مشاہدہ کسی چیز کا براہ راست دیکھنا. لیکن جدید سائنس خصوصاً کوانٹم فزکس کے عروج کے بعد مشاہدہ کی تعریف میں ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے. اب ہم ایسی بہت سی اشیاء پر یقین رکھتے ہیں جن کا براہ راست مشاہدہ ممکن نہیں اور شاید کبھی ممکن نہ ہو. جیسے الیکٹران، پروٹان، کوارکس، بگ بینگ اور متوازی کائنات کا نظریہ. اس ترمیم کے مطابق اگر ہم کسی چیز کا براہ راست مشاہدہ نہیں کر سکتے تو ہم اس کے اثرات کو دیکھتے ہوئے اس کی موجودگی کا یقین کر لیتے ہیں. ہم نے الیکٹران نہیں دیکھا لیکن اس کے اثرات میگنیٹک

فیلڈ میں اور بجلی کے صورت میں ہمارے سامنے ہیں اس لیے ہم اس کے وجود کے قائل ہیں. مشاہدہ کی بنیاد پر کسی شہ کی موجودگی کا یقین براہ راست استدلال کہلائے گا اسے ہم primary rationalism کہتے ہیں اور بنا دیکھے محض اثرات کی بنیاد پر یقین بالواسطہ استدلال کہلاتا ہے جسے ہم secondary rationalism کہتے ہیں. جدید سائنس یعنی کوانٹم فزکس کے مطابق ہم کسی شہ کی مکمل حقیقت سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے. آج سائنس یہ ثابت کر چکی ہے کہ کسی بھی شہ کی حرکت، حالت حتی کے وقت بھی معین نہیں ہے یہ سب اضافی ہیں اور ہم بیک وقت ان میں سے کسی کے بارے میں یقین سے یہ دعوی نہیں کر سکتے کہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کیا ایسا واقعی ہو رہا ہے؟ کیونکہ اگر وہ منظر جو میں دیکھ رہا ہوں کوئی دوسرا شخص جو کسی مختلف حالت میں ہے دیکھتے گا تو اس کے لیے یہ منظر شاید مختلف ظاہر ہو. اس لیے جدید سائنس میں کسی بھی سائنسی نظریہ کو تسلیم کرنے کے لیے ایک اہم شرط یہ لگائی جاتی ہے کہ یہ نظریہ ہمارے مشاہدات کی درست تفہیم کرتا ہو اور مستقبل کے بارے میں ایسے پیش گوئیاں کرتا ہو جن کی تصدیق ممکن ہو.

یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ اگر ہم جدید سائنس کے اصولوں کو اپنائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی موجودگی کا نظریہ غیر سائنسی نہیں ہے. خدا قرآن میں کہتا ہے کہ اس کائنات میں، دن رات کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں. یہ نشانیاں کس کی ہیں؟ کسی ذات کی موجودگی کی نشانیاں جو عقل کل ہے. یہ کائنات، اس کی ترتیب، اس کا ربط سب اس بات کی نشانیاں ہیں کہ یہ نظام حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آیا بلکہ یہ کسی ذہین ذات کی تخلیق ہے. یہ بالواسطہ استدلال ہے یعنی secondary rationalism. یہاں ہم اس کائنات کو دیکھتے ہیں، اس کے ربط کا مشاہدہ کرتے ہیں خود اپنے ذات پر غور کرتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ کائنات، اس کا ربط، انسان کا اپنا وجود اور انسان کا باشعور ہونا اور ہماری دنیا کی ہر شہ کا بامقصد ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سب کا ایک خالق حقیقی ہے اور وہ ایک واحد و یکتا خدا ہے.

کیا یہ استدلال ہمارے مشاہدات کی درست تفہیم کرتا ہے. کامن سینس کہتی ہے کہ ہاں یہ درست تفہیم ہے کیونکہ اگر ہم ایسی کسی ذات کے وجود کی نفی کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کائنات بے مقصد ہو جاتی ہے بلکہ خود انسانی وجود اور یہ زندگی

بے مقصد ہو جاتی ہے. جبکہ ہم مشاہدہ کی بنیاد پر یہ دعٰوی کر سکتے ہیں کہ ہمارے مشاہدہ میں کوئی شہ بے مقصد نہیں. اس کائنات کو، انسانی وجود کو اور اس کائنات کی ترتیب کو اگر کوئی نظریہ معنی دیتا ہے تو وہ خدا کے وجود کا اقرار ہے. اور ہم یہ پیش گوئی پورے یقین سے کر سکتے ہیں کہ اس کائنات میں ربط ہمیشہ ملے گا یہ کائنات بے ربط، بے ہنگم نہیں ہو گی. اس میں تضاد نہیں ہو گا. اور اس بات کا اشارہ قرآن میں بھی ملتا ہے لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا‌ۚ فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ''اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔''

ہم قدم قدم پر دیکھتے ہیں کہ کائنات ہر شہ میں ربط ہے اس میں کہیں کوئی بگاڑ نہیں. سائنسدان خود بھی اس ربط کا برملا اظہار کرتے ہیں. جیسے کہ Physicist and author Paul Davies wrote, "The cliché that 'life is balanced on a knife-edge' is a staggering understatement in this case: no knife in the universe could have an edge that fine."

کائنات کے اس ربط کو سائنسدان fine tuning کا نام دیتے ہیں. قرآن کائنات کے اس ربط کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے. وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ دَآئِبَيۡنِ‌ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ ''اور تمہاری خاطر سورج اور چاند کو اس طرح کام پر لگایا کہ وہ مسلسل سفر میں ہیں، اور تمہاری خاطر رات اور دن کو بھی کام پر لگایا۔''

قرآن ہمیں کائنات کی اس ترتیب پر غور کرنے کی نہ صرف ترغیب دیتا ہے بلکہ مظاہر فطرت کو نشانیاں کہتا ہے جنھیں دیکھ کر اہل عقل اس کی ذات کا ادراک کر سکیں. اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِىۡ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ "بیشک آسمان اور زمین کی تخلیق میں، رات دن کے لگاتار آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لیکر سمندر میں تیرتی ہیں، اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں (۱۰۵)"

نہ صرف کائنات میں ربط ہے بلکہ ہم قرآن کی روشنی میں یقین کے ساتھ یہ دعوی بھی کر سکتے ہیں کہ اس سارے نظام کی ایک ابتداء تھی اور اس کا ایک اختتام بھی ہو گا. یہ دونوں نظریات جدید سائنس تسلیم کر چکی ہے. وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ "اور اس دن ہم ان کی یہ حالت کر دیں گے کہ وہ موجوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں گے، (۵۱) اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو ایک ساتھ جمع کر لیں گے۔" اور دوسری جگہ اس طرح فرمایا. اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿۱﴾ قیامت قریب آ لگی ہے اور چاند پھٹ گیا ہے۔ (سورت القمر)

یہ وہ دعوی ہیں جو مستقبل میں قابل مشاہدہ ہیں اور جدید سائنس ان کے درست ہونے کو آج ہی تسلیم کرتی ہے. جس طرح ہم جدید سائنس میں ارتقاء، بگ بینگ، اور کشش ثقل یا اس طرح کے دوسرے نظریات کو secondary rationalism بالواسطہ طور پر مانتے ہیں یہی طریقہ کار خدا کے وجود کے دلائل کے طور پر بآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہ عین سائنسی اصولوں کے مطابق ہو گا. ہاں اگر کوئی ایسا شخص جو جدید سائنس پر یقین رکھتا ہو اور پھر بھی اصرار کرے کہ اسے خدا ہر صورت دکھائی دے تو اس سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ الیکٹران و پروٹان و بگ بینگ، ارتقاء اور دوسرے مشہور سائنسی نظریات کا ہمیں براہ راست مشاہدہ کروادے. اگر وہ بنا براہ راست مشاہدے کے ان اشیاء اور نظریات کو درست تسلیم کرتا ہے تو خدا کی ذات پر اعتراض کا کوئی سائنسی جواز اس کے پاس موجود نہیں.

سید اسرار احمد، سہراب نصیر

==========

غیب بالشہود+شہود بالغیب=علم

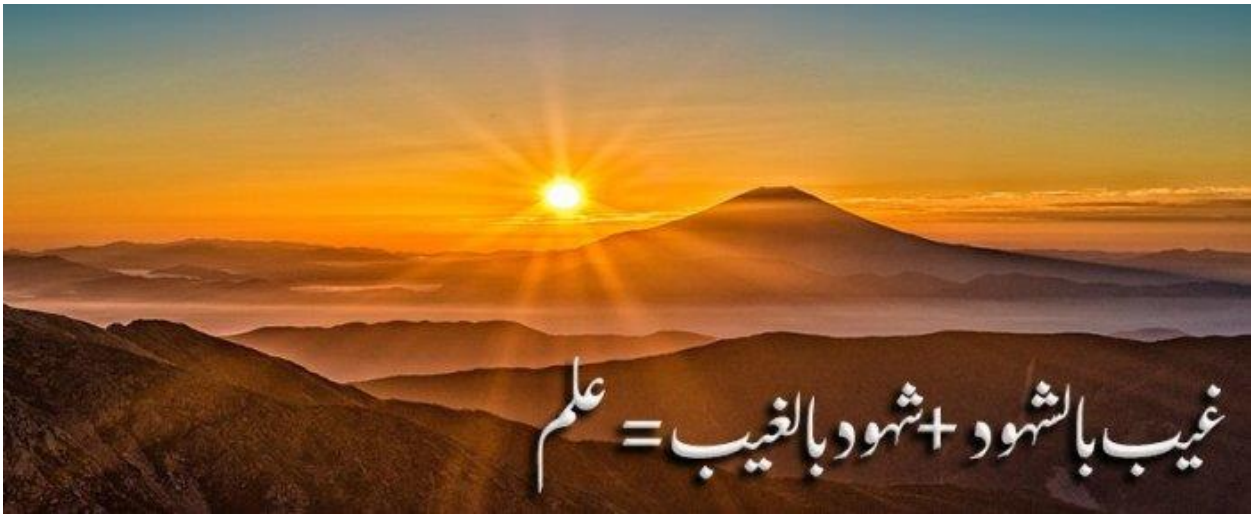

یہ دنیا زمان و مکان کی ایسی دیواروں میں محصور ہے جن کے سامنے سنگ و آہن، دخان و بھاپ بھی نہیں۔ ان بے اماں دیواروں میں کوئی دروازہ ہے نہ کواڑ، کوئی دریچہ ہے نہ کھڑکی، کوئی روزن ہے نہ درز، کوئی چھید ہے نہ روشندان، گویا کچھ بھی نہیں۔ کوئی فترت معلوم، نہ فتق ظاہر، نہ آغاز کا پتہ، نہ انجام کی خبر، گویا کچھ بھی نہیں۔ نہ کوئی کڑی ٹوٹی ہوئی، نہ کوئی اینٹ گری ہوئی، نہ چھت ہلی ہوئی، نہ فرش دھنسا ہوا، گویا کچھ بھی نہیں۔ ان دیواروں میں گرا ہوا، یا گھرا ہو، یا محبوس، یا متوطن، یا مسافر، یہ آدمی حیران ہے کہ یہ گھر ہے، یا اندھا کنواں ہے، یا منزل ہے، یا راستہ ہے، یا کال کوٹھڑی؟

جانوں تو حیرتناک اور مہیب، جیوں تو بھیانک اور ہولناک۔ ہستی سوال در سوال، حیات الم در الم، شعور پیچ در پیچ، اور وجود تہہ در تہہ۔ کیا یہ کائنات کسی انجانے کھونٹے سے جھولتا، میرے لیے باہر سے مقفل کوئی پنجرہ ہے، یا صرف کوئی مقفل پنجرہ، یا صرف پنجرہ؟ آدمی خود اندر باہر کا مجموعہ ہے، اور سوچتا ہے کہ کیا یہ کائنات صرف ''اندر'' ہی ہے یا اس کا کوئی ''باہر'' بھی ہے؟ انسان کے باہر کے، یعنی آفاق کے راستے دن کو بھی روشن اور رات کو بھی معلوم، لیکن کائنات کے سارے سورجوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کے اندر، اس کے انفس میں اندھیرا، ایسا کہ کائنات کے سارے سورج مل کر بھی اسے اجیار نہ پائیں! کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا انسانی ''باہر'' اس کائناتی ''اندر'' سے جڑا ہوا اور مانوس، اور میرا انسانی ''اندر'' کسی غیبی ''باہر'' کا پیاسا اور طلبگار؟ اسی اندھیرے اور پیاس میں آدمی نے یہ ضرور پالیا کہ وہ سورج جو اندر کو روشن کردے وہ علم ہے۔ بجا کہ علم روشنی ہے، اندر کی، لیکن کیسا علم، اور کہاں کا علم؟

اس میں تین بڑے گروہ ہیں۔ اہل سفسطہ، اہل عقل اور اہل مذہب۔ اہل سفسطہ علم کو مطلوب لیکن ناممکن مانتے ہیں۔ اہل عقل علم کو مطلوب اور صرف شہود میں ممکن مانتے ہیں۔ اور اہل وحی غیب و شہود میں علم کو ممکن مانتے ہیں۔ سوفسطائی یہ کہتے ہیں کہ ''علم ممکن نہیں''، اور اہل عقل کہتے ہیں کہ ''علم ممکن ہے، وحی ممکن نہیں'' اور اہل مذہب کہتے ہیں کہ ''علم ممکن ہے کیونکہ وحی ممکن ہے''۔ سوفسطائیت اپنی اصل میں انکار شہود ہے، اور عقلیت اپنی اصل میں انکار غیب ہے۔ اہل مذہب کے ہاں شہود حس میں معلوم اور وحی سے بامعنی ہے، غیب شعور و وجود کا لنگر/اینکر ہے۔ شعور ایک برزخ ہے جہاں غیب و شہود کے ''دریا'' مل جاتے ہیں۔

یونانی اہل عقل کی نبرد آزمائی اول اول سوفسطائیوں سے ہوئی، اور بعد ازاں جدید اہل عقل کی اہل مذہب سے، اور اہل عقل دونوں پر فاتح رہے۔ اس فتح نے انسان کو بدل دیا، اور جدید انسان نے دنیا کو بدل دیا۔ اہل عقل کا دعویٰ بڑا، کام لمبا، کارنامہ حیرت انگیز اور نتیجہ المناک نکلا۔ تحریک تنویر سے پس جدیدیت تک کے سفر میں اہل عقل معنی، امید اور جمال سے تہی ہو کر ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئے ہیں جو سوفسطائیت سے بھی بدتر ہے۔ اب ''آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا'' والی آپشن بھی باقی نہیں رہی، اور اہل عقل کو ''آدمی کو بھی میسر نہیں حیواں ہونا'' کی صورت حال درپیش ہے۔ جدید علم کی منتہائے کمال پر، یعنی پہلے کامیاب ایٹمی دھماکے کے دہلا دینے والے منظر کو دیکھ کر، مین ہیٹن پروجیکٹ کے انچارج سائنسدان اوپن ہائیمر نے کہا تھا کہ ''اب ہم سب کتی کے بچے ہیں!''۔ میرا خیال ہے کہ اس نے فرط جذبات میں مبالغے سے کام لیا اور بڑی امید باندھی، کیونکہ جدید انسان کو اب ''کتی کا بچہ'' بننا بھی نصیب نہیں، اور وہ ایک نامعلوم پوسٹ ہیومن مخلوق بننے میں کوشاں لیکن ناکام ہے، جو نہ انسان ہے، نہ حیوان ہے اور نہ مشین۔

انسانی شعور کے دو ایسے مسئلے ہیں جن کو اول علمی قدم اٹھنے سے پہلے حل کیے بغیر کوئی علم ممکن نہیں۔ شعور کے اندر منشاء (origin) کا سوال طے کرنا عقل کو اینکر دینے کے لیے لازم ہے، اور شعور سے باہر کسی unknown (غیب) کو فرض کرنا عقل کے فعال ہونے کے لیے لازم ہے تاکہ ''دریافت'' اور علم کی مسلسل تنظیم نو کو باقی رکھا جا سکے ورنہ عقلی علم کے مذہبی علم کی طرح ''ساکت ہونے کا خدشہ'' باقی رہتا ہے۔ جدید سائنسی ذہن کائنات کے منشاو مبدا کا سوال پہلے فرض کر کے، مان کے، اور زمان و مکاں کے دائرے میں known (شہود) اور unknown (غیب) فرض کر کے علم کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ اگر سائنس کائنات کے اندر unknown فرض نہ کرے تو علم کا آغاز ممکن نہیں، اور اگر اس فرضی unknown کو قائم نہ رکھ سکے تو بھی علم ممکن نہیں۔ یعنی جدید عقل اس کائنات کے اندر ہی اپنے غیب و شہود کو فرض کر کے دریافت اور علمی یافت کے کام کا آغاز کرتی ہے۔ سائنسی ذہن کا منشائی موقف اور اس کا فرض کردہ unknown مذہبی آدمی کے ایمان بالغیب سے مشابہ ہے۔ شہود سے انسان کا تعلق حسی اور استدلالی یعنی عقلی ہے، اور غیب سے ایمانی۔ مذہبی آدمی غیب اور خبر غیب کو مانتا ہے اور جدید آدمی اپنا غیب

فرض کرتااور اسے مانتاہے۔ غیب علم کی شرط اول ہے،اور غیب کو ''مانے'' بغیر علم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر غیب سے بھی انسان کا تعلق عقلی ہو جائے تو علم لایعنی(absurdہو جاتاہے،اور جدید علم کی لایعنیت ''سائنسی غیب'' کے عقلی مفروضہ ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ سائنس unknownفرض ہی اس لیے کرتی ہے کہ اپنے known کو بامعنی رکھ سکے۔ لیکن کائناتِ معلوم کی غیب و شہود میں ارادی اور عقلی تقسیم امکانِ علم کو ختم کر دیتی ہے، کیونکہ مفروضہ unknown عقل ہی کا زائیدہ ہے،اور وہ علم کو ایسا کوئی تصور نہیں دے پاتا جو حقیقت نفس الامر بھی ہو۔ اس وقت امکانِ علم کے حوالے سے جدید انسان کو ناامیدی اور لایعنیت کا سامنا ہے اسی وجہ سے ہے۔

''غیب بالشہود'' وحی کا دائرہ ہے،اور ''شہود بالغیب'' نظری اور عرفانی علوم کا دائرہ ہے جو اپنی تشکیل اور معنویت کے لیے وحی پر منحصر اور اس کا محتاج ہے۔

مقولہ احمد جاوید صاحب، تشریح محمد دین جوہر

خدااور معروضی اخلاقیات[[Objective Morality

خداکا جاننا خیر کا جاننا ہے!

ذرا تصور کیجئے کہ آپ اپنی دن بھر کی مصروفیات کے بعد تھکے ہارے گھر لوٹتے ہیں اور ٹی وی کے سامنے براجمان ہو جاتے ہیں۔ حسبِ معمول آپ مختلف چینلز کو سرف کرتے ہیں کہ اچانک ایک مشہور چینل پر ایک سرخی آپ کو حیران اور پریشان کر دیتی ہے۔اور اس سے بھی زیادہ تاسف اور بے چینی کا آپ شکار ہوتے ہیں جب آپ کے سامنے یہ خبر چلتی ہے کہ ایک شخص نے پانچ سال کے بچے کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اسی لمحے اگر آپ سے کوئی یہ سوال کرے کہ کیا اخلاقی طور پر اس شخص نے غلط کیا تو یقیناً باقی لوگوں کی طرح آپ کا جواب بھی ہاں میں ہوگا۔ آپ سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا اس شخص نے معروضی طور پر بھی اخلاقی قبیح فعل سرانجام دیا ہے تو تب بھی آپ ہاں میں جواب دیں گے۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ معروضیت یا معروضی حقیقت کیا ہے؟ تو ادھر معاملہ تھوڑا نازک، غور طلب اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔

☆معروضیت کی تعریف:

اگر ہم لفظ آبجیکٹو (Objective) کی تعریف کریں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لفظ مختلف حقائق کے بیان میں ذاتی تعصبات سے بالاتر غیر جانبدار رویے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اخلاقیات کے تناظر میں اس سے مراد اخلاقیات کا کسی کے ذہن پر منحصر نا ہونا یا ذاتی احساسات، پسند ناپسند سے ماورا ہونا ہے۔ اس کی مثال ریاضیاتی سچائی ایک جمع ایک کا حاصل دو اور سائنسی حقیقت جیسا کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے' سے بھی دی جاسکتی ہے، یہ درست ہیں چاہے ہم جیسا مرضی محسوس کریں۔ چنانچہ اگر ''اخلاق'' ہم انسانوں سے نہیں بلکہ خارجی ہیں تو ان کی بنیاد کیا ہے؟ اگر معروضی اخلاقیات ہماری محدود سوچ، خیالات پر منحصر نہیں تو پھر ان سوالوں کے جواب چاہیں: یہ کہاں سے آئے؟ انکی فطرت کیا ہے؟ ان سوالوں کے جواب کے لیے ایک منطقی بنیاد چاہیے، وہی انکی معروضی فطرت اور ماخذ کی وضاحت کرے گی۔ یہ تمام سوال فلسفے کی ایک شاخ اخلاقی علم ((Moral Ontology سے متعلق ہیں۔

معروضی اخلاقی سچائی کی وضاحت ایسے بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ انسانی جانبداری اور ذات سے ماورا ہیں۔ مثال کے طور پر ایک پانچ سالہ بچے کو مارنا ایک غلط فعل ہونا ہمیشہ غلط ہی مانا جائے گا چاہے پوری دنیا اس فعلِ قبیح پر متفق ہو جائے اور اس کو درست قرار دے دے۔ ہم انسان نہ صرف کچھ اخلاقی اصولوں کو معروضی مانتے ہیں بلکہ یہ معروضی اخلاق ہمارے اندر اخلاقی ذمہ داری اور فرائض کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہم کو بتاتے ہیں کہ کچھ افعال ہمیں سرانجام دینے چاہیئے اور کچھ سے اجتناب، ہماری کچھ اخلاقی ذمہ داریاں ہیں جنکا دارومدار ہماری یا کسی کی پسند ناپسند پر نہیں ہے بلکہ وہ باہر سے ہیں،۔ اسی حوالے سے پروفیسر این مارخم (Ian Markham) وضاحت کرتے ہیں کہ ہماری اخلاقی زبان ہم سے ماورا کسی چیز کو ظاہر کرتی ہے: ''الفاظ 'ہمارے لیے مناسب ہے' یا 'چاہیئے' میں ایک ایسی اخلاقی حقیقت پنہاں ہے جو ہماری زندگی اور دنیا سے ماورا ہے۔ یہ 'اخلاقی زبان' فی نفسہ ایک خارجی اور آفاقی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔''(254)

اب ہم سوال کی طرف آتے ہیں کہ

☆''اخلاق معروضی کیوں ہیں؟''

اس کی وجہ بہت ہی سادہ ہے، وہ یہ کہ تصورِ اخلاق معروضی اس لئے ہے کہ یہ ہم کو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے، اس سے پہلے کہ میں اسکی تفصیل بیان کروں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو شخص خدا پر یقین نہیں رکھتا وہ اخلاقیات کا مظاہرہ نہیں کر سکتا اور جو خدا پر یقین رکھے گا وہی اخلاقی طور پر صحیح رویہ اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کا وجود نہ ہو تو دنیا میں کوئی معروضی اخلاقی تصور موجود نا ہوتا۔ یقیناً ہم معروضی اخلاق پر عمل کر سکتے ہیں اور ماضی میں دہریت پسند طبقات نے خدا پر ایمان کے بغیر بھی اعلیٰ اخلاقیات کا مظاہرہ بھی کیا۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ہم خدا کو ہٹا دیں تو ہماری اخلاقی اقدار زیادہ سے زیادہ کچھ معاشرتی روایات کا درجہ رکھیں گی اور ان کو معروضی حیثیت نہیں جا سکے گی۔ مثلاً تفریح کی خاطر قتل کرنے کو غلط سمجھنے اور کسی معصوم مقتول کی طرف داری کرنے میں کوئی فرق نہیں ہوگا کیونکہ دونوں معاشرتی روایت کہلائی جائیں گی۔ لہٰذا خدا کا وجود ہی تمام معروضی اخلاقی سچائیوں کی بنیاد ہے کوئی اور نظریہ یہ بنیاد مہیا نہیں کر سکتا۔

خدا ہی ہمیں یہ تصورِ اخلاق دیتا ہے کیونکہ وہ اس کائنات اور ہماری داخلی کیفیت سے ماوراذات ہے۔ پروفیسر این مارخم(Ian Markham)اسی طرح وضاحت کرتے ہیں؛''خدا ہی وہ ذات ہے جس نے ہم پر ''چاہیئے'' یا'' یا ایسا ہونا چاہیے'' جیسی اخلاقی قدروں کو لاگو کی ہیں اور اخلاقیات کی آفاقی حیثیت کو وزن بخشی کیونکہ خدا اس کائنات سے باہر ہے اور خالق ہے وہی آفاقی احکامات دیتا ہے۔''(256)

اسلامی نقطہء نگاہ سے خدا کی ذات کامل ترین ہے، وہی علیم ہے اور سب سے طاقتور اور اچھا ہے۔ کامل اچھائی خدا کی ظاہری فطرت ہے۔ اسمائے حسنہ میں سے ایک نام ''البر'' ہے جس کا مطلب ہے تمام اچھائیوں کا منبع۔ جب خدا ایک اخلاقی حکم دیتا ہے تو وہ اس کی منشاء کے عین مطابق ہے اور اسکی منشاء کسی بھی طرح سے اس کی ذاتِ عالی سے متصادم نہیں۔ لہٰذا خدا جو بھی حکم دیتا ہے وہ اچھائی ہے کیونکہ وہ خود اچھا ہے اور صرف وہی بتا سکتا ہے کہ کیا اچھا ہے:

''کہو کہ بے شک خدا بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔''(سورۃ الاعراف:۲۸)(257)

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ بہت سے دہریے اس بات کو مانتے ہیں کہ خدا کا انکار کرنے سے معروضی اخلاقیات کا وجود ممکن نہیں۔معروف دہریہ فلاسفر مسٹر جے ایل میکائی (J. L. Mackie)، (Ethics: Inventing Right and Wrong)میں لکھتے ہیں؛

''معروضی اخلاقی اقدار کا کوئی وجود نہیں۔۔مطلب یہ کہ نہ صرف اخلاقی اچھائی جو بعض اوقات اخلاقی اقدار بھی کہلاتی ہیں بلکہ صحیح، غلط، فرض ذمہ داری اور کسی فعل کا برا ہونا اور قابل مذمت ہونا سب کے سب معروضی حیثیت نہیں رکھتے۔''(258) مسٹر جے ایل میکائی نے دہریت کے عمومی نظریے کے برعکس یہ سمجھ لیا کہ دہریت کا نظریہ اپنانے سے اخلاقیات کی معروضی حیثیت نہیں مانی جاسکتی۔ لہٰذا اگر خدا نہیں ہے تو کوئی معروضی اچھائی بھی نہیں ہے۔!

☆ایوتھروتذبذب((Euthyphro's dilemma

کچھ دہریے اسکالرز اوپر پیش کی گئی دلیل کا جواب افلاطون اور ایوتھرو کے مغالطے سے دیتے ہیں۔وہ اسے یوں بیان کرتے ہیں کہ کیا کوئی چیز اخلاقی طور پر اس لیے اچھی ہے کہ اسکا خدا نے حکم دیا یا خدا نے اسکا اس لیے حکم دیا کہ وہ اخلاقی طور پر اچھی ہے؟

یہ سوال خدا پرست لوگوں کے لئے ایک مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے کیونکہ یہ دو میں سے ایک بات پر یقین مانگتا ہے: یا تو یہ کہ اخلاقیات کی بنیاد خدا کا امر ہے یا یہ کہ وہ خدا پر انحصار نہیں کرتی۔اگر تو خدا کا امر بنیاد ہے تو خیر اور شر کیا ہے یہ خدا کی صوابدید ہے، اگر یہ معاملہ ہے تو یہ لازمی نہیں کہ انسان معروضی طور پر خیر اور شر کو جان سکے۔اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ معصوم بچے کو قتل کرنا معروضی طور پر غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا جس پر چاہے برا یا شیطانی ہونے کا لیبل لگا

دے۔اسی مسئلے کا دوسرا رخ یہ کہ اخلاقیات خدا پر انحصار نہیں کرتیں بلکہ خارجی حیثیت کی حامل ہیں، اس سے یہ ماننا ہو گا کہ خدا کو بھی اسی خارجی اخلاقی معیارات کے تحت نظام چلانا ہو گا جو کہ ایک موحد یا خدا پرست کے لئے نا قابل قبول ہے کیونکہ اسکے ایمان کا حصہ ہے کہ وہ خدا کو ایک بے نیاز اور ہر چیز پر قادر ذات تسلیم کرے۔

اگر سطحی طور پر یہ دیکھا جائے تو یہ سوال/مسئلہ اپنے اندر وزن رکھتا ہے لیکن اگر تھوڑا غور کریں تو اس کا بودا پن واضح ہو جائے گا۔ کیونکہ ایک اور تیسرا رخ بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خدا اچھائی کا منبع ہے۔!

فلسفہ کے پروفیسر شبیر اختر اپنی کتاب ''قرآن اینڈ دی سیکولر مائنڈ'' میں لکھتے ہیں: ''ایک تیسری صورت بھی ممکن ہے: کہ الہامی کتب میں بتایا گیا سراپا خیر خدا ہے، ایک اعلی ذات جو اچھائی کے اندر موجود خیر اور جنسی بے راہ روی سے جڑے شر کو غیر منطقی طریقے سے تبدیل نہیں کرتا۔ خدا ہمیشہ اچھی ہی بات کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ خود اچھائی اور بھلائی کا منبع ہے۔''(259)

پروفیسر شبیر کے مطابق اسکا ایک اخلاقی معیار موجود ہے جو کہ مغالطے کی دوسری صورت کے برعکس خدا سے جدا نہیں ہے بلکہ اس کا وجود خدا ہی کا عنایت کردہ ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ مذہبی اور مسلم عام طور پر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا لازمی طور پر سراپا اچھائی ہے۔ وہی مکمل اور فطری اخلاقی معیار مہیا کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی معصوم کا قتل بلا وجہ یا بغیر کسی بنیاد کے بُرا یا شیطانی نہیں کہا گیا بلکہ وہ ایک ضروری اور معروضی اخلاقی قاعدے کے نتیجے میں قابلِ مذمت ٹھہراتا ہے۔اسکا مطلب قطعاً یہ بھی نہیں ہے کہ خدا اس قاعدے اور قانون کا پابند ہے بلکہ در حقیقت یہ قاعدہ خود اس کی ذاتِ عالی کی صفات کا مظہر ہے۔

ایک دہریت پسند یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ ہم کو خود پہلے یہ پتہ ہونا چاہیئے کہ اچھائی کیا ہے تاکہ خدا کا اچھا ہونا ثابت کیا جا سکے لہٰذا یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ اچھائی یا بھلائی کیا ہے خدا بتلائے گا کیونکہ اس کی ذات ہی کامل اور تمام اچھائی کی بنیاد ہے۔ قرآن اس بات کو یوں بتاتا ہے:

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر وہی رحمان (اور) رحیم۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۶۳)(260)

وہی اللہ ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ غیب کا جاننے والا ہے اور حاضر کا بھی۔ وہی ہے جو بِن مانگے دینے والا، بے انتہا رحم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے، پاک ہے، سلام ہے، امن دینے والا ہے، نگہبان ہے، کامل غلبہ والا ہے، ٹوٹے کام بنانے والا ہے (اور) کبریائی والا ہے۔ پاک ہے اللہ اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہے جو پیدا کرنے والا۔ پیدائش کا آغاز کرنے والا اور مصوّر ہے۔ تمام خوبصورت نام اسی کے ہیں۔ اُسی کی تسبیح کر رہا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ کامل غلبہ والا (اور) صاحبِ حکمت ہے۔ (سورۃ الحشر: ۲۳۔۲۵)(261)

مختصراً یہ کہ تمام اخلاقی سچائیاں اور قاعدے خدا کی ذات کی مرہونِ منت ہیں اور خدا نے اپنی منشاء کا اظہار اپنے احکامات کے ذریعے دیا ہے اور یہ احکامات اس کی ذاتِ عالی جو کامل ترین اور بہترین صفات کی حامل ہے' سے کسی بھی طریقے سے متصادم نہیں ہیں۔

☆کیا معروضی اخلاقیات کی کوئی متبادل بنیاد بھی موجود ہے؟

بہت سے ملحدین یہ دلیل دیتے ہیں کہ خدا کے علاوہ توجیہات بھی ممکن ہیں اور بتا سکتی ہیں کہ کچھ اخلاقی قاعدے معروضی کیوں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حیاتیات، معاشرتی دباؤ اور اخلاقی حقیقت پسندی شامل ہیں۔

☆حیاتیات(:Biology)

کیا حیاتیاتی علم معروضی اخلاقیات کی وضاحت کر سکتی ہے؟ سادہ جواب نہیں میں ہے۔ چارلس ڈارون نے ایک دلچسپ مثال دی کہ اگر بیالوجی یا فطری انتخاب اخلاقیات کی بنیاد رکھتا۔ اسکے مطابق اگر ہم مختلف قسم کے حیاتیاتی حالات سے

دوچار ہوتے تو جسے ہم معروضی اخلاقیات کہتے ہیں بالکل مختلف ہوتے۔ ''اگر انسانوں کو بھی شہد کی مکھیوں جیسے حالات درپیش ہوتے تو اس میں کسی کو شک نا ہوتا کہ ہماری غیر شادی شدہ عورتیں کام کرنے والی مکھیوں کی طرح سوچتیں کہ یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ اپنے بھائیوں کو ماردیتی اور مائیں اپنے جوان بیٹیوں کو، اور کوئی بھی اس میں دخل اندازی نہیں کرتا۔(262)

دوسرے الفاظ میں اگر اخلاقیات حیاتیاتی تبدیلیوں پر منحصر ہوتا تو وہ ان تبدیلیوں سے خارجی حیثیت نہ رکھتے لہٰذا اپنی معروضیت کھو بیٹھتے۔ ڈارون کی مثال کو مزید جانوروں تک بھی پھیلایا جاسکتا ہے۔

کچھ لوگ اس کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فطری چناؤ ہی ہے جو کہ ہمیں اخلاقی معروضیت کو سمجھنے کی صلاحیت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ بھی غلط بات ہے، تصوراتی طور پر فطری چناؤ یہ کر سکتا ہے کہ ایسی صلاحیت دے سکتا ہے کہ ہم ایسے اخلاقی اصول بنائیں جو ہمارے زندہ رہنے اور افزائشِ نسل میں معاون ہوں یہ معروضی اخلاقی قاعدے فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اخلاقی فلسفی فلپ کچر(Philip Kitcher)لکھتا ہے؛ ''فطری چناؤ زیادہ سے زیادہ ہمارے لئے یہ کر سکتا ہے کہ ہم کو کچھ معاشرتی نظام اور اس سے جڑے اخلاقی اصول بنانے کی صلاحیت فراہم کردے۔''(264)

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حیاتیات اخلاقی معروضیت کی بنیاد ہے تو لازمی طور پر ان کی حیثیت بے معنی سی ہو گی کیونکہ وہ ایک غیر عقلی اور غیر شعوری ارتقائی تبدیلیوں کے نتیجے میں رونما ہوئے ہونگے۔ اس کے برعکس یہ حقیقت کہ اخلاقیات الہامی احکامات سے آئی اس کو معروضیت اور معنویت بخشتی ہے کیونکہ انسان اپنے آپ کو اس قاعدے اور قوانین کے بارے میں خدا کے حضور جوابدہ سمجھتا ہے جو کہ نہایت معقول بات ہے نہ کہ چند خلیوں اور ارتقائی تبدیلیوں کے سامنے جوابدہ ہونے کا تصور!

☆معاشرتی دباؤ(:Social Pressure)

دوسری ممکن توجیہہ معاشرتی دباؤ یا اتفاقِ رائے ہے۔ لیکن یہ فلسفے کی رو سے انسانیت پرستوں اور دہریت پسندوں کے لئے مشکلات کھڑے کر دیتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرتی اتفاقِ رائے یا دباؤ اخلاقیات کی معروضیت کو ختم کر دیتا ہے۔ان کو علاقائی اور اضافی حیثیت دے دیتا ہے۔اس توجیہہ سے مختلف مسائل اور اخلاقی تضادات جنم لیتے ہیں۔جیسا کہ نازیوں کے کیئے گئے مظالم کو ہم اس تناظر میں کیسے معروضی طور پر غلط ثابت کر سکیں گے۔اگر ہم یہ کہہ بھی دیں کہ لوگوں نے مجموعی طور پر جرمن نازیوں کے خلاف بندوق اٹھائی اور ایک معاشرتی اتفاقِ رائے کا مظاہرہ کیا گیا لیکن دوسری طرف ہمیں ان کے کیے گئے مظالم پر بھی اتفاقِ رائے کے شواہد ملتے ہیں، نیز اس کے علاوہ تاریخ میں اور بہت ساری مثالیں ہیں جن سے اس نظریے کی توثیق ہوتی ہے۔

*اخلاقی حقیقت پسندی(:Moral Realism)

آخری ممکن توجیہہ اخلاقی حقیقت پسندی کی ہے۔اس کو اخلاقی معروضیت بھی کہا جاتا ہے۔اس متبادل کے مطابق اخلاق معروضی ہوتے ہیں اور ہمارے دل و دماغ سے خارجی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ موضوع یعنی خدا کے بخشے ہوئے اخلاقی قاعدوں کے برعکس اخلاقی حقیقت پسند کسی بنیاد کے قائل نہیں ہیں۔ان کے نزدیک محبت والفت، ہمدردی، رواداری اور انصاف جیسی اخلاقی سچائیاں اپنے تئیں خود معروضی طور پر موجود ہیں کسی بھی بنیاد کی محتاج نہیں۔

اس حقیقت پسندی کے نظرئے میں کچھ سقم ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقی اقدار اپنے تئیں خود وجود رکھتی ہیں یا انصاف خود بخود وجود رکھتا ہے؟ یہ خیال ایک بے معنٰی اور مہمل سی بات ہے۔ ہم خود بخود موجود انصاف کو جان نہیں سکتے۔ نمایاں ہے کہ بندے کو یہ سمجھنا ہو گا کہ اگر اخلاقیات معروضی (انسان کی ذاتی رائے سے بالاتر) ہیں تو انکی ایک منطقی وضاحت چاہیے۔ ورنہ یہ سوال کہ 'اخلاق معروضی کیسے ہوتے ہیں' بلاجواب رہے گا ۔اخلاقیات کی معروضی حیثیت کسی نہ کسی عقلی دلیل کی محتاج ہے ورنہ اخلاق معروضی کیسے ہیں؟ کا جواب نہ دیا جاسکے گا۔

دوسرا یہ کہ اخلاقیات صرف چند سچائیوں کی جان لینے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ اخلاقیات انسان کے اندر ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس بھی پیدا کرتی ہے کہ ہم کو رواداری اور انصاف پسند ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن اخلاقی حقیقت پسندی (Moral Realism) یہ جوابدہی کا احساس پیدا ہونا ممکن نہیں، یہ اس ذمہ داری کا احساس اور جوابدہی کی کوئی بنیاد فراہم نہیں کرتی کہ انسان کو کیوں انصاف پسند ہونا چاہیئے اور نہ ہونے کی صورت میں کیا ہو گا۔؟ کیونکہ یہ محض یہ جان لینا کوئی اخلاقی سچائی معروضی ہے یہ لازم نہیں کرتا کہ ہم اس پر عمل کرنے کے بھی پابند ہیں۔ان کا فائدہ تب ہے جب یہ احساس ذمہ داری بھی پیدا کریں۔اخلاقی حقیقت پسندی کا نظریہ اسکی کوئی وجہ بیان نہیں کرتا کہ انسان کو اخلاقی کیوں ہونا چاہیے، جبکہ یہ معروضی اخلاقیات الہامی احکامات سمجھی جائیں تو یہ نا صرف انہیں معروضی بناتی ہیں بلکہ یہ اسکی بنیاد بھی فراہم کرتی ہیں کہ انسان اخلاقی کیوں بنے، کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا کی اطاعت اس پر فرض ہے۔یہ انسان میں احساس ذمہ داری و جوابدہی کو اجاگر کرتا ہے جو اس کی ہمہ وقت اخلاقی اقدار پر کاربند رکھنے میں معاون اور مددگار ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ معروضی اخلاقیات کے لئے خدا کا وجود ہونا لازم ہے کیونکہ وہ اس کائنات سے ماورا ہے اور اپنے احکامات کے ذریعے ایک آفاقی اخلاقی قاعدہ دے سکتا ہے۔

*اگر منکرین خدا اخلاقی معروضیت کا انکار کریں؟

آخری حربے کے طور پر کچھ ملحدین علمی ہزیمت سے بچنے کے لئے اخلاقیات کی معروضی حیثیت کو ماننے سے یکسر انکار بھی کر دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے ہم اسے مان لیتے ہیں لیکن اخلاقیات کو معروضی نا ماننے کے باوجود مسئلہ حل نہیں ہوتا، یہ دو دھاری تلوار کی طرح ہے۔ کیونکہ جیسے ہی انہوں نے یہ کہا کہ اخلاقیات کی کوئی معروضی حیثیت نہیں ہے پھر انہیں کسی مذہب پر انگلی اٹھانے کا کوئی حق نہیں رہتا یا خصوصی طور پر اسلام پر کسی معروضی انداز میں اعتراض نہیں کر سکتے

۔وہ داعش اور کے کے جیسی انتہا پسند تنظیموں بلکہ شمالی کوریا میں قائم ڈکٹیٹر شپ آمریت کے خلاف بھی انگلی نہیں اٹھا سکتے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ یہ کرتے ہیں اور معروضی اخلاقیات کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو ان تمام اخلاقی فیصلوں اور اعتراضات کیساتھ یہ شق ڈال دینی چاہیئے کہ ''یہ میرا ذاتی مؤقف ہے۔''اور جب یہ کریں گے تو ان کی ساری تنقید اور اعتراضات بے معنی ہو جائیں گے کیونکہ وہ معروضی اخلاقیات کو مانتے نہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ انسان ہمیشہ بنیادی اخلاقیات جیسے کہ قتل، زیادتی اور چوری کے بُرا ہونے کو معروضی ہی سمجھتا ہے۔

☆دلیل کو سمجھنے میں غلطی((Misunderstanding the argument

کچھ دہریت پسندوں اور حتیٰ کہ کچھ محققین نے اس موضوع کو اخلاقی علمیت/تصور علم (Moral epistemology) کو اخلاقی علم الوجود(Moral ontology) کیساتھ خلط ملط کرنے کی وجہ سے غلط سمجھا ہے۔ ہماری پیش کردہ دلیل اس بات سے متعلق نہیں ہے کہ ہم یہ کیسے جانتے ہیں کہ کیا چیز اچھی ہے؟ جو کہ مورل اپسٹمالوجی کا حصہ ہے۔ بلکہ اس کا تعلق اس سے ہے کہ اخلاقی تصور کہاں سے آئے اور انکی فطرت کیا ہے جسکا تعلق مورل آنٹالوجی سے ہے۔ خدا کے احکامات معروضی بننے کے لیے اخلاقیات کو وجودی بنیاد(Ontological foundation) فراہم کرتے ہیں۔

اس باب میں پیش کی گئی دلیل کا تعلق مورل اپسٹمالوجی سے ہے ہی نہیں ہے بلکہ مورل آنٹالوجی سے ہے جسکا تعلق اخلاقیات کی بنیادوں اور فطرت کیساتھ ہے۔ اس دلیل کو سادہ سے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی چیز اپنے اندر اچھائی یا بھلائی رکھتی ہے، کیا وہ معروضی طور پر اچھی یا بھلی ہے؟ اگر یہ معروضی طور پر اچھی ہے تو یہ خدا کا وجود مانگتی ہے کیونکہ وہی معروضی بھلائی کی واحد بنیاد ہے۔ اسکا تعلق اس سے نہیں کہ ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ کب کوئی چیز اچھی ہوتی ہے۔

☆معروضی بمقابلہ مطلق((Absolute vs objective

ایک نہایت جائز اور معقول اعتراض کسی بھی ماہر الہیات کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظامِ انصاف یا کسی اور نظام ہائے انصاف میں بعض اوقات قتل کرنا (اگر اپنے اور اپنے خاندان کی حفاظت کے لئے ہو) جائز بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی فعل معروضی طور پر برا نہیں ہے۔ یہ ایک دلچسپ اعتراض ہے لیکن معروضی اخلاق کو مطلق اخلاقیات سے خلطِ مبحث کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ معروضی اخلاقیات اور مطلق اخلاقیات بالکل مختلف چیزیں ہیں، مطلق اخلاقیات یہ کہتی ہے کہ اخلاقی عمل ہر حال میں اچھا یا برا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جو قتل کرنے کو مطلقاً غلط سمجھتا ہے وہ ذاتی دفاع میں کئے گئے قتل کو بھی برا سمجھے گا اور اخلاقی غلطی جانے گا جبکہ اس کے برعکس معروضی اخلاقیات سیاق و سباق کی اہمیت اور نزاکت کا خیال رکھتی ہیں۔ معروضی اخلاقیات کے تحت ایک اخلاقی سچائی کچھ یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ کسی بھی انسان کو بغیر کسی معقول وجہ کے قتل کرنا غلط اور برا ہے۔ اس اخلاقی قول میں سیاق و سباق کی حساس فطرت یہ شق پیدا کرتی ہے کہ اس قتل کو جسٹیفائی یا معقول ثابت نا کیا جاسکے۔ مثلاً کسی ایسے شخص کو قتل کرنا اخلاقی طور پر درست اور جائز تھا جو کسی اسکول میں گھس کر معصوم بچوں کو گولیوں سے بھون ڈالتے ہوئے قتل ہوا۔ یہ ہماری دلیل مطلق اخلاقیات سے تعلق نہیں رکھتی۔

اخلاقی اضافیت پر نوٹ (A note on ethical relativism):

ایک اخلاقی اضافت پسند جو یہ سمجھتا ہو کہ اخلاقیات کا انحصار ثقافت اور معاشرتی اقدار پر ہوتا ہے اور علاقائی حیثیت رکھتی ہیں، اس ضمن میں یہ کہہ سکتا ہے کہ مطلق اور معروضی اخلاقیات پر یہ بحث اخلاقیات کا اضافی ہونا ثابت کرتی ہیں نہ کہ معروضی۔ جبکہ جو اخلاقیات کو معروضی حیثیت دیتے ہیں وہ یہ دلیل پیش کریں گے کہ لوگ کیا سمجھتے ہیں یا کرتے ہیں، ایک غیر متعلق بات ہے کیونکہ ان سے معروضی اخلاقی سچائیوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اضافت پسندوں کی دلیل اس تناظر میں بودی ہے کیونکہ یہ بتاتی ہے کہ معروضی اخلاقیات ثقافتی یا کلچرل رویوں سے بدل بھی سکتی ہے، یا ثقافتی رویے اخلاقیات کی معروضی حیثیت کو جھٹلا سکتے ہیں جو کہ ابتداء سے ہی ایک غلط مؤقف ہے۔

کیونکہ معروضی اخلاقیات کی تعریف ہی یہ ہے کہ یہ محسوسات، عقائد اور ثقافت سے ماورا ہوتے ہیں لہٰذا اضافت پسندوں کا اعتراض اس بنیاد پر بے معنی ہے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اس مضمون میں ہم نے دہریت پسندوں کی خاطر قابلِ غور دلائل پیش کئے ہیں۔ اگر دہریت پسند اخلاقی اقدار کو معروضی تسلیم کرتے ہیں ان کو خدا کا وجود بھی ماننا پڑے گا کیونکہ صرف وہی معروضی اخلاقیات کی عقلی اور شعوری بنیاد ہو سکتا ہے یا انہیں پھر کوئی اور متبادل فراہم کرنا ہوگا۔ اگر وہ نہیں کر سکتے تو پھر ان کو اپنے اندرونی احساس کو ختم کرنا ہوگا جو معروضی خیر اور شر کو پہچانتا ہے اور معروضی اخلاقیات کے وجود کو یکسر ماننے سے انکار کرنا پڑے گا۔ اور جب وہ انکار کر دیں گے تو پھر وہ کسی بھی صورت میں اسلام پر انگلی نہیں اٹھا سکیں گے اور نہ ہی اخلاقیات پر مبنی فیصلے صادر کر سکیں گے جو اپنے اندر معروضیت کا عنصر رکھتے ہوں اور زیادہ سے زیادہ یہ ان کی اپنی داخلی کیفیات کا اظہار ہی کہلایا جا سکے گا۔

اخلاقیات کے پس منظر سے اسلام کا الوہیت سے متعلق نظریہ بہت ہی واضح اور قابلِ فہم ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ کی ذات کامل ترین ہے اور خیر و بھلائی کا منبع ہے۔ وہ ایک دانا اور حکیم ذات ہے اور اس کا کوئی بھی حکم اس کی ذاتِ عالی سے متصادم نہیں ہے۔ ایسے خدا کو جاننے اور ماننے سے ہی ہمیں معروضی اخلاقیات کی بنیاد مل سکتی ہے جو انسانوں کے لئے رہنمائی اور روشنی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لہٰذا خدا کا جاننا، خیر کا جاننا ہے۔

تحریر حمزہ اینڈرئیس، ترجمہ کتاب دی ڈیوائن ریلٹی

حوالہ جات:

Markham, I. S. (2010) Against Atheism: Why Dawkins, 254 Hitchens, and Harris are Fundamentally Wrong. West Sussex: Wiley-Blackwell, p. 34.

The arguments presented in this chapter, including some of 255 the ideas, have been inspired by and adapted from Craig, W. L. Can We Be Good Without God? Available at: http://www.reasonablefaith.orgl can-we-be-good-without-god [Accessed: 24th October 2016J; Craig, W. L. (2008) Reasonable Faith: Christian Truth and Apologetics Wheaton, Illinois: Crossway Books, pp. 172-183.

Ibid.256

The Qur' an, Chapter 7, Verse 28.257

Mackie,]. L. (1990) Ethics: Inventing Right and Wrong. 258 London: Penguin. 1990, p. 15.

Akhtar, S. (2008) The Qur'an and the Secular Mind. 259 Abingdon: Routledge, p.99. 260The Qur'an, Chapter 2, Verse 163.

The Qur'an, Chapter 59, Verses 22 to 24.261

Darwin, C. (1874) The Descent of Man and Selection in 262 Relation to Sex. 2nd Edition, p.1 Available at: http://www.gutenberg.orglebooksI2300 [Accessed 4th October 2016J.

National Geographic (1996). Sharks in Love. Available at: 263 http://video.nationalgeographic.com/video/shark_nurse_mating [Accessed 24th October 2016J.

Cited in Linville, M. D. (2009) The Moral Argument. In: 264 Craig, W. L. and Moreland, J.

P. (ed.). The Blackwell Companion to Natural Theology. West Sussex: Wiley-Blackwell, p. 400.

خدائی شہادت-قرآن

غور کیجیے، ہماری معلومات کا بیشتر حصہ لوگوں سے سنی ہوئی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ان میں ایسی باتیں بھی شامل ہوتی ہیں جن پر ہم پورا یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً ہم میں سے بہت سے لوگ امیزون کے جنگلات میں بسنے والے قبائل، فوٹو سن تھسہ مز، بالائے بنفشی شعاؤں، اور جراثیموں کے وجود کے قائل ہیں۔ بات واضح کرنے کے لیے میں ایک مثال دیتا ہوں۔اگر ایک بالکل اجنبی شخص کے سامنے یہ ثابت کرنا ہو کہ آپ جس خاتون کو اپنی والدہ کہتے ہیں یہ واقعی آپ کی حقیقی والدہ ہیں تو آپ یہ بات کیسے ثابت کریں گے؟ یہ سوال اگرچہ کچھ نامعقول لگتا ہے لیکن یہ درحقیقت معلومات حاصل کرنے کے ایک نہایت اہم ذریعہ کی نشاندہی کرتا ہے جسے عموماً خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔اس سوال کا جواب آپ مختلف صورتوں میں دے سکتے ہیں مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ 'میری والدہ نے مجھے خود بتایا'، یا، 'میرے برتھ سرٹیفیکیٹ پر لکھا ہے'، یا، 'میرے والد صاحب پیدائش کے وقت وہاں موجود تھے اور انہوں نے مجھے بتایا'، یا، 'میں نے اپنی والدہ کا ہسپتال کا ریکارڈ چیک کیا ہے'... وغیرہ۔ یہ تمام جواب درست ہو سکتے ہیں لیکن غور کریں، ان سب کی بنیاد دراصل کسی دوسرے شخص کی کہی ہوئی بات ہی ہے۔ لہٰذا کسی شکی مزاج شخص کی ان سے تسلّی نہیں ہو گی۔آپ اس کو ثابت کرنے کے لیے پھر شاید ڈی این اے ٹیسٹ کی دلیل دینا چاہیں، یا کوئی ویڈیو دکھانے کی کوشش کریں۔

سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ان خاتون کو اپنی والدہ کسی ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد تسلیم نہیں کیا تھا، اور نہ ہی کسی ویڈیو کو دیکھ کر۔ کیونکہ ویڈیو میں جو بچہ ہے وہ آپ ہی ہیں یہ ثابت کرنے کے لیے بھی آپ کو دوسرے لوگوں کی ہی بات پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ تو بھلا بتائیے آپ نے کیسے یہ جانا کہ جنہیں اپنی والدہ سمجھتے ہیں، وہی آپ کی حقیقی والدہ ہیں؟

یہ مثال کچھ طنزیہ سہی لیکن یہ درحقیقت معلومات حاصل کرنے کے ایک نہایت اہم ذریعے کو واضح کرتی ہے اور وہ ذریعہ ہے 'گواہی' کا۔

ہمارے بہت سے خیالات کچھ اس طرح ترتیب پاتے ہیں کہ پہلے ہم کچھ معلومات، حقائق یا مفروضوں پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر ان کی سمجھ میں آنے والی توجیہہ سوچتے ہیں۔ چلیں اس والدہ والی مثال پر پھر سے بات کرتے ہیں۔ تصور کیجیے کہ حمل کے آخری ایام ہیں اور پیدائش کی متوقع تاریخ کو گزرے ہفتہ ہو چلا ہے۔ اچانک آپ کی والدہ کو دردِ زہ اٹھنا شروع ہوتا ہے۔ آپ کے والد اور طبّی عملہ فوراً اخذ کر لیتا ہے کہ اب آپ کی والدہ آپ کو جنم دینے کو ہیں۔

ایک اور مثال لیجیے۔ چند سال گزرتے ہیں، آپ کی والدہ ایک بسکٹ کا کھلا ہوا پیکٹ آپ کے پاس پڑا دیکھتی ہیں، اور آپ کے منہ اور کپڑوں پر اس کے ذرّات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھ جاتی ہیں کہ آپ نے بسکٹ کھائے ہیں۔

ان دونوں مثالوں میں معاملے کی جو نوعیت سمجھی گئی، ضروری نہیں کہ وہی حقیقت بھی ہو، یا اس کی کوئی اور تعبیر نہ کی جا سکتی ہو، لیکن شواہد کو دیکھتے ہوئے جو سب سے معقول توجیہہ کی جا سکتی تھی وہ یہی تھی۔ سوچنے کے اس طریقے کو 'استدلال' یعنی توجیہہ کے ذریعے نتائج تک پہنچنا کہتے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے یہ مثالیں کیوں پیش کیں؟ دراصل ان مثالوں سے ہم نے جو باتیں سمجھی ہیں، ان کی بنیاد پر ہم اس مضمون میں یہ دکھائیں گے کہ قرآن پاک عربی زبان کا ایک یکتا شاہکار ہے جس کی کوئی مثل نہیں اور درحقیقت اس کا خالق خدا کے سوا کوئی اور ہستی نہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ قرآن جیسی کوئی دوسری کتاب تصنیف نہیں کی جا سکتی تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج تک کوئی انسان قرآن پاک جیسے لسانی اور ادبی کمالات تخلیق نہیں کر سکا۔ قرآن پاک کا منفرد ادبی اسلوب اور بلاغت کا تسلسل اس کی متعدد خوبیوں میں سے ہے۔ ممکن ہے آپ کو میرا یہ دعویٰ اور اوپر بیان کی گئی مثالیں کچھ بے ربط معلوم ہوں، اس لیے میں چاہوں گا کہ آپ ان نکات پر غور کریں، بات واضح ہو جائے گی۔

قرآن پاک محمد ﷺ پر عرب میں ساتویں صدی میں نازل ہوا۔ یہ دور عرب کے لسانی اور ادبی عروج کا زمانہ تھا۔ ساتویں صدی کا عرب معاشرہ ایسے افراد پروان چڑھاتا جو اپنی مقامی زبان میں خیالات کے اظہار پر کمال درجے کا

عبور رکھتے تھے۔ کسی شاعر کا پیدا ہونا ان کے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہوتا۔ شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا تھی، وہ شاعری کے لیے جیتے اور شاعری کے لیے مرتے تھے۔ شاعری کے ذوق کو نکھارنا اور کلام پر دسترس حاصل کرنا ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ یہ ان کے لیے آکسیجن اور زندگی بخشنے والے خون کی مانند تھا گویا وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے جب تک وہ اپنے کلام کے معیار کو اعلیٰ ترین درجے تک نہ پہنچالیں۔

لیکن جس لمحے انہیں قرآن سنایا گیا،... وہ دم بخود رہ گئے۔ ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ مبہوت ہو گئے یہ دیکھ کر کہ قرآن کے آگے ان کے عظیم ترین شعراء کے لبوں پر بھی تالے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ قرآن جیسا کوئی کلام نہ لا سکے۔ اس سے بھی بڑھ کر، جب قرآن نے چوٹی کے ماہرینِ کلام کو مقابلے کی دعوت دے ڈالی کہ اس جیسے منفرد ادب اور زبان والا کوئی شہپارہ بنالائیں تو وہ اس میں بھی بری طرح ناکام ہوئے۔ ان میں سے چند نے تسلیم بھی کیا کہ قرآن خدا ہی کی جانب سے ہے۔ لیکن زیادہ تر نے انکار، مخالفت، تشدّد، قتل وغارت اور افواہ سازی کا راستہ لیا۔ کئی اشخاص اٹھے کہ جنہوں نے متعلقہ فنون میں اس غرض سے مہارت حاصل کی کہ قرآن کے چیلنج کا جواب دیا جا سکے اور یہ سلسلہ صدیوں جاری رہا، لیکن بالآخر انہوں نے تسلیم کیا کہ قرآن کی مثل کچھ بنانا ناممکن ہے اور وہ جان گئے کہ ان سے قبل آخر ماہرینِ کلام کیوں ناکام ہوتے رہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک ایسا شخص جو خود عرب نہیں، یا عربی زبان میں دسترس نہ رکھتا ہو، کیوں کر اس بات کو تسلیم کرے کہ قرآن کے جیسا کوئی کلام بنانا ممکن نہیں؟ یہاں سے معاملہ شروع ہوتا ہے 'گواہی' کا۔ ہمارے دعوے کی بنیاد در حقیقت وہ معلومات ہیں جو عربی زبان کے موجودہ اور قدیم ماہرین کی تحریری اور زبانی 'گواہی' کے ذریعے ہم تک پہنچیں۔ اگر یہ سچ ہیں، اور وہ لوگ جو قرآن پاک کو چیلنج کرنے اٹھے اور اس کے الہامی طرزِ کلام کی مانند کچھ پیش نہ کر سکے، تو پھر قرآن کا مصنف کون ہے؟ یہاں آکر 'گواہی' کا دائرہ کار ختم اور 'استدلال' کا شروع ہوتا ہے۔ اس 'استدلال' کو سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن کے بے مثل ہونے کی ممکنہ صورتوں پر غور کرنا ہو گا جو کہ کچھ یوں ہیں۔ قرآن یا تو کسی عجمی کی تصنیف ہو، یا کسی عرب کی، یا محمدؐ خود ہی اس کے مصنف تھے، یا پھر یہ مان لیا جائے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے۔ اس

مضمون میں یہ سارے پوائنٹ زیرِ بحث آئیں گے ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ قرآن جیسے بے مثل کلام کا خالق کسی عجمی، کسی عرب، یا خود محمدؐ کو قرار دینا عقل سے بعید خیال ہے۔ لہٰذا قرآن کے بے مثل اور یکتا ہونے کی جو واحد توجیہہ سمجھ میں آسکتی ہے وہ یہی ہے کہ قرآن پاک کو تصنیف کرنے والا خود خدا ہی ہے۔

ہم نے اب تک ان تصورات پر بات کی ہے کہ گواہی معلومات تک رسائی کا ایک قابلِ بھروسہ ذریعہ ہے اور استدلال سوچنے کا ایک موزوں اور معقول طریقہ ہے کہ جسے استعمال کرتے ہوئے ہم حقیقت کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس مضمون میں آگے ہم گواہی کی علمی حیثیت پر بات کریں گے اور تفصیلاً بتائیں گے کہ معلومات کی ترسیل بذریعہ گواہی کو عقل و سمجھ کے دائرے میں رہتے ہوئے کیسے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہم واضح کریں گے شواہد کی بہترین ممکنہ توجیہہ (استدلال) کو کیسے موثر طور پر استعمال کیا جاتا ہے تاکہ ان دونوں تصورات کی مدد سے قرآن پاک کے یکتا اور بے مثل ہونے کو ثابت کریں۔ یہ مضمون آپ کو اس نتیجے تک پہنچائے گا کہ انسانوں کا اس الہامی کتاب کے جیسا کوئی کلام بنانے سے عاجز ہونا دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس کتاب کو بھیجا۔ اور یہ سب کچھ اس طرح بیان کیا جائے گا کہ اسے سمجھنے کے لیے قاری کا عربی زبان سے واقف یا اس کا ماہر ہونا لازم نہ ہوگا۔

’گواہی‘ کی علمیت ((The epistemology of testimony

علم کی یہ شاخ تصورِ علم (epistemology) اس سوال سے متعلق ہے کہ ہم لوگوں سے سنی ہوئی باتوں سے معلومات اور درست تصورات آخر کیسے اخذ کرتے ہیں۔ (1) لہٰذا ایک بہت اہم سوال جس کا یہ جواب دینے کی کوشش کرتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی کہی گئی باتوں سے ہم معلومات کیسے حاصل کرتے ہیں؟ (2) اس سلسلے میں پروفیسر بنجمن مک مائیلر (’ Benjamin McMyler) گواہی‘ کے ذریعے حاصل کی گئی معلومات کا ایک خلاصہ پیش کرتے ہیں:: میں جانتا ہوں کہ گریٹر ہوسٹن ایریا میں کوپر ہیڈ سب سے عام پایا جانے والا زہریلا سانپ

ہے۔ میں جانتا ہوں کہ نپولین واٹرلو کی جنگ ہار گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ جس لمحے میں یہ تحریر کر رہا ہوں پٹرول کی قیمت اوسطاً 4.10 امریکی ڈالر فی گیلن ہے۔ میں یہ سب باتیں جیسا کہ ماہرینِ علم بتاتے ہیں 'گواہی' کے ذریعے جاننے کے قابل ہوا، یعنی کسی دوسرے شخص یا گروہ نے مجھے ان کی بابت بتایا تب میں نے جانا)

مک مائیلر کا بتایا ہوا خلاصہ بآسانی سمجھ میں آتا معلوم ہوتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ ہم کیسے ایسی باتوں کو علم سمجھتے ہیں جو ہم تک فقط دیگر افراد کی گواہی کے ذریعے ہی پہنچی ہوتی ہیں۔ 'دنیا گول ہے' اس کی ایک زبردست مثال ہے۔ یہ تصور کہ زمین گول ہے ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لیے کوئی سائنس یا ریاضی کے فارمولے سے ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ اس کی بنیاد خالصتاً لوگوں سے سنی ہوئی باتیں ہی ہیں۔ آپ شاید جواباً کہنا چاہیں کہ 'میں نے تصویریں دیکھی ہیں'، یا 'میں نے سائنس کی کتابوں میں پڑھا ہے' یا 'میرے تمام اساتذہ نے مجھے یہی بتایا ہے' یا شاید یہ کہ 'میں زمین کی بلند ترین چوٹی پر چڑھ کر زمین کی گولائی دیکھ سکتا ہوں'، یا اس ہی طرح کچھ اور۔ لیکن تھوڑے سے غور و خوص سے آپ جان لیں گے کہ آپ کے تمام جوابات دراصل 'گواہی' کے ذریعے حاصل کی گئی معلومات پر ہی مشتمل ہیں۔ مثلاً تصاویر کا دیکھنا گواہی ہی کی ایک شکل ہے کیونکہ آپ کو اس شخص یا ادارے کی بات پر اعتماد کرنا ہوگا کہ جس کا کہنا ہے کہ یہ کرہ ارض کی تصویر ہے۔ اس کی معلومات سائنس کی کتابوں سے حاصل کرنا بھی 'گواہی' کی ہی ایک صورت ہے کہ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کتاب کے لکھنے والے نے اس بارے میں حقیقت بیان کی ہے۔ اساتذہ سے علم حاصل کرنے کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اسی طرح کسی بلندی پر کھڑے ہو کر زمین کی گولائی کا مشاہدہ کرنے کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں کہ اول تو ہم میں سے بہت سوں نے کبھی ایسا کیا نہیں اور دوسرا ہمارا یہ فرض کرنا کہ کسی بلندی پر چڑھ کر زمین کی گولائی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، بھی لوگوں سے سنی ہوئی باتوں پر ہی مشتمل ہے۔ اور بالفرض آپ ایسا کر بھی چکے ہوں تب بھی یہ زمین کو گول ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہے کیونکہ اس سے بہت سے بہت یہ ہی پتہ لگتا ہے کہ زمین کی سطح کسی درجے گولائی رکھتی ہے، نہ کہ یہ کہ زمین مکمل طور پر گول ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ زمین ایک نصف گیند کی مانند ہو، یا کسی پھول

کے جیسی ساخت رکھتی ہو۔ مختصراً یہ کہ ہم میں سے بیشتر لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی گواہی کے نتیجے میں ہی اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ زمین گول ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ معلومات کا حصول گواہی کے بنا ممکن ہی نہیں'۔ علمیت ((Epistemologyکے پروفیسر، سی اے جے کوڈی(C. A. J. Coadyاب تک کی ہماری گفتگو کا خلاصہ بتاتے ہیں، اور چند ایسی باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کو 'گواہی' کے سواء کسی دوسرے ذریعے سے جانا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ کہتے ہیں''۔۔ ہم میں سے اکثر نے کبھی بچے کی پیدائش کا از خود مشاہدہ نہیں کیا، نا ہم نے جسم میں خون کی گردش کا معائنہ کیا، نا ہم نے زمین کے اصل جغرافیے کو دیکھا، نا ہم نے ملک کے قانون کی ورق گردانی کی، اور نا ہی ہم نے اپنی اس معلومات کے ماخذ کا کبھی مشاہدہ کیا کہ آسمان پر نظر آنے والی روشنیاں دراصل نہایت طویل فاصلے پر موجود کائناتی اجسام ہیں'۔(4)

'گواہی' معلومات حاصل کرنے کا ایک بنیادی اور نا گزیر ذریعہ ہے۔ ماہرینِ علمیات گواہی سے متعلق چند بہت اہم سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلاً گواہی سے کب اور کیسے شواہد حاصل کیے جا سکتے ہیں؟ اور یہ کہ کیا گواہی بنیادی نوعیت کی حامل ہے؟ گو کہ یہ ہمارے اس مضمون کا مقصد نہیں کہ علمیت سے متعلق سوالات کا حل پیش کریں یا انہیں واضح کریں، تاہم ہم اس میں چند بحثوں کا حاصل پیش کریں گے تاکہ یہ بالکل واضح ہو جائے کہ گواہی معلومات کے حصول کا ایک معتبر ذریعہ ہے۔

☆ کیا گواہی بنیادی نوعیت کی حامل ہے؟((Is testimony fundamental?

اس سے مجھے لارنس کراس جو کہ ایک بے باک ملحد ہے کے ساتھ کی گئی ایک گفتگو یاد آئی جو ہم نے ایک عام اجتماع میں کی۔ میں نے اس کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلانے کی کوشش کی کہ مشاہدہ معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ اس سے میرا مقصد شواہد پر انحصار کرنے والے حضرات کے ایک فرضی تصور کو آشکار کرنا تھا۔ میں نے گواہی سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ ارتقاء پر یقین رکھتے ہیں؟۔ اس نے کہا ہاں۔ تو میں نے سوال کیا کہ کیا آپ

نے ارتقاء کو ثابت کرنے کے لیے کیئے گئے سارے تجربے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے؟اس کا جواب نہیں میں تھا۔(5) یوں اس کے، بلکہ ہم میں سے بہت سوں کے طرزِ فکر کے بارے میں ایک سنجیدہ نوعیت کا سوال سامنے آیا۔آخر ہم جن چیزوں پر یقین رکھتے ہیں اس (یقین) کی کیا وجوہات ہوتی ہیں؟ درحقیقت ہمارے بہت سے خیالات لوگوں سے سنی ہوئی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان کو صرف اس لیے مشاہداتی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو سائنسی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

کچھ زیادہ پرانی بات نہیں، 'گواہی' کو بطور علم کی ایک شاخ 'کسی سنجیدہ تحقیق کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ علم کی دنیا میں یہ سکوت بالآخر متعدد تحقیقات اور مقالوں کی اشاعت سے اختتام پذیر ہوا جن میں سب سے معروف پروفیسر، سی اے جے کوڈی (C. A. J. Coady) کا مقالہ 'گواہی پر ایک فلسفیانہ گفتگو' (Testimony: A Philosophical Discussion) ہے۔پروفیسر کوڈی گواہی کو معلومات کے حصول کے ایک معتبر ذریعے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور گواہی کے ذریعے معلومات کے حصول پر ڈیوڈ ہیوم کے 'تجزیہ پسندانہ تاثرات' پر تنقید کرتے ہیں۔ 'تجزیہ پسندانہ/ تخفیفی' سوچ دعویٰ کرتی ہے کہ گواہی کی تائید معلومات کے دیگر ذرائع سے مثلاً تاثر، یاد داشت، تعارف وغیرہ سے ہونا ضروری ہے۔دوسرے الفاظ میں گواہی بذاتِ خود کوئی معنی نہیں رکھتی اور یہ لازم ہے کہ اسے دیگر ذرائع، یعنی تجربے سے حاصل کی گئی معلومات سے تقویت دی جائے۔اس کے رد میں پروفیسر کوڈی گواہی کو بنیادی نوعیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ گواہی سے حاصل کی گئی معلومات معتبر ہوتی ہیں اور ضروری نہیں کہ معلومات کے دیگر ذرائع مثلاً مشاہدہ سے ان کی تصدیق کی جائے۔ گواہی کے بارے میں یہ بیانیہ 'گواہی کے تخفیفی نظریے کے رد'((anti-reductionist thesis کے طور پر جانا جاتا ہے۔

پروفیسر کوڈی تجزیہ پسندانہ نظریے کو ہیوم کے نقطہ نظر پر تنقید کے ذریعے رد کرتے ہیں۔ہیوم کو اس کے 'معجزات کے بارے میں' مقالے کی وجہ سے تجزیہ پسندانہ نظریے کا سرخیل سمجھا جاتا ہے، جو کہ اس کی کتاب 'انسانی سمجھ کی جانچ' کا دسواں باب ہے۔ہیوم کا تجزیہ پسندانہ نقطہ نظر گواہی سے حاصل کی گئی معلومات کی نفی نہیں کرتا، بلکہ وہ درحقیقت اس

کی اہمیت بتاتا ہے۔ 'ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دلائل کی کوئی شکل ایسی نہیں جو اتنی عام، کارآمد اور انسانی زندگی کے لیے اہم ہو جتنی کہ انسانوں کی گواہی سے حاصل ہونے والا علم ہے۔(6) البتہ ہیوم کا کہنا ہے کہ گواہی پر ہمارا اعتبار تب ہی قائم ہوتا ہے جب گواہی اور ہمارا تجربہ ایک دوسرے کی تائید کرتے ہوں۔ یہ ہیوم کا وہ نکتہ ہے جس پر وفیسر کوڈی بے بنیاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن پروفیسر کوڈی کی تنقید صرف اس ایک نکتے تک محدود نہیں رہتی، بلکہ مجموعی طور پر اس بحث میں ان کے دلائل کی مضبوطی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

پروفیسر کوڈی کہتے ہیں کہ ہیوم کا 'اجتماعی مشاہدے' کا سہارا لینا ایک ناختم ہونے والے دائرے میں گھومنے کے مترادف ہے۔ ہیوم کا کہنا کہ گواہی صرف اس صورت میں معتبر ہوتی ہے جب اس سے ملنے والی معلومات کی تائید مشاہدہ میں آنے والے حقائق سے ہوتی ہو۔ لیکن یہاں قابلِ مشاہدہ حقائق سے ہیوم کی مراد کسی کا ذاتی مشاہدہ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب لوگوں کا مجموعی تجربہ ہے۔ اس ہی نکتے کے بارے میں پروفیسر کوڈی کہتے ہیں کہ ہم ہمیشہ ذاتی مشاہدے سے حاصل شدہ معلومات سے کام نہیں چلا سکتے۔ اور یہیں سے ہم ایک کبھی نہ ختم ہونے والے دائرے میں پھنس جاتے ہیں۔ ہر معاملے میں کسی کے ذاتی مشاہدے پر ہی اعتبار کرنا کافی نہیں کیونکہ وہ علم بہت تھوڑا اور کسی چیز کی وضاحت کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ 'تجزیاتی نقطہ نظر' درست نہیں۔ اس کا یہ دعویٰ کہ گواہی پر اعتبار کے لیے دیگر ذرائع مثلاً مشاہدے کی تائید کی ضرورت ہے، بذاتِ خود اس ہی مفروضے پر قائم ہے جس کی یہ نفی کرنا چاہتا ہے یعنی گواہی کا بنیادی نوعیت کا حامل ہونا۔ اور اس کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ یہ جاننے کے لیے کہ کسی چیز کے بارے میں لوگوں کا اجتماعی مشاہدہ کیا ہے، ہمیں دوسرے لوگوں کی گواہی ہی کی ضرورت ہوگی کیونکہ ہم نے از خود اس کا مشاہدہ نہیں کیا ہوتا۔!

ماہرین کی رائے پر بھروسہ کرنا((Relying on experts

ہمارے زمانے کی سائنسی ترقی کہ جس پر ہم سب فخر کرتے ہیں کبھی ممکن نہ ہو پاتی اگر ہم ماہرینِ فن کی جانب سے بیان کی گئی تجرباتی معلومات پر یقین نہ کرتے۔ ارتقاء ہی کی مثال لے لیجیے۔ رچرڈ ڈاکنز کبھی اس نظریے کی سچائی کا پر زور دعویٰ نہ کر پاتا اگر یہ لازم ہوتا کہ یہ دعویٰ کرنے سے پہلے وہ تمام تجربات خود کرے اور ان کے نتائج کا خود مشاہدہ بھی کرے۔ ممکن ہے وہ چند ایک مشاہدے یا تجربات خود دہرا بھی لیتا لیکن پھر بھی اسے دوسرے سائنسدانوں کی بتائی ہوئی معلومات پر یقین کرنا پڑتا۔ ارتقاء پر تحقیق کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ہر چیز کا از خود مشاہدہ کرنا ممکن ہی نہیں، اور اگر ایسا کیا جانے لگے تو سائنس ترقی کرنے سے قاصر ہو جائے گی۔

اوپر بیان کی گئی مثال ایک اہم سوال اٹھاتی ہے۔ ایسی صورت میں کہ جب گواہی کے ذریعے جو بات ہم تک پہنچ رہی ہو وہ دراصل ایک ماہرِ فن کی رائے ہو، گواہی کی کیا حیثیت سمجھی جانی چاہیے؟ یونیورسٹی میں فلسفے کے لیکچرار ڈاکٹر الزبتھ فرِکر (Elizabeth Fricker) کا اس بارے میں کہنا ہے کہ:

'کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں دوسروں کی گواہی پر بھروسہ کرنا ایک معقول طرزِ فکر ہوتا ہے اور اس کے برخلاف کرنا عقل سے بعید سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ ایک شخص کی اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے محدود ہونے کے شعور کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ دیگر افراد بعض امور میں تو اس سے مماثلت رکھتے ہیں لیکن بعض امور میں وہ اس سے مختلف ہیں اور نتیجتاً کسی خاص معاملے میں وہ اس سے بہتر علمی استعداد رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مجھے کبھی حسرت ہوتی ہو کہ میں اڑ نہیں سکتا، یا اپنے کام کرنے کی صلاحیت کو متاثر کیے بنا ایک ہفتے تک جاگ نہیں سکتا، یا وہ تمام باتیں نہیں کھوج سکتا جو میں جاننا چاہتا ہوں۔ لیکن اپنی محدود ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو اپنی حد جانتے ہوئے، میرے لیے عقلی طور پر اس پر تأسف کی کوئی گنجائش نہیں بنتی کہ میں دیگر افراد کے الفاظ پر احتیاط کے ساتھ بھروسہ کروں کہ جس کے نتیجے میں مجھے بے پناہ علمی سرمایہ اور بیش بہا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔(7)

اعتبار[[Trust

یہاں سے معلومات بذریعہ گواہی تصور پر بحث میں 'اعتبار' کا تصور داخل ہوتا ہے۔ دیگر افراد کی رائے پر اس وجہ سے بھروسہ کرنا کہ وہ ایک خاص شعبے میں چوٹی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں اس وقت تک سود مند نہ ہوگا جب تک ہماری یہ رائے کہ وہ ماہرین واقعی قابلِ بھروسہ ہیں بذاتِ خود اعتبار کے قابل نہ ہو۔

گواہی کی نوعیت اور اس کے معتبر ہونے کی بحث 'تجزیہ پسندانہ' نقطہ نظر اور اس کی نفی سے آگے جا چکی ہے۔ فلسفے کے پروفیسر کیتھ لہرر کا اس مسئلہ پر کہنا ہے کہ گواہی کے قابلِ بھروسہ ہونے کا مسئلہ ان دونوں نظریات سے الگ ایک معاملہ ہے۔ لہرر اپنی دلیل کی بنا 'اعتبار' پر رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گواہی کے ذریعے معلومات کا حصول تمام حالات میں یکساں طور پر ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے کچھ مخصوص حالات درکار ہیں۔(8) وہ کہتے ہیں 'گواہی کے ذریعے آپ کوئی بات اس وقت یقینی طور پر جان سکتے ہیں جب بتانے والا بذاتِ خود قابلِ بھروسہ ہو۔ بصورتِ دیگر گواہی کو قابلِ یقین شہادت نہیں سمجھا جا سکتا۔(9) ایسا نہیں ہے کہ گواہی دینے والا شخص لغزشوں سے یکسر پاک ہو تب ہی اس کی گواہی پر بھروسہ کیا جائے(10) لیکن یہ ضروری ہے کہ گواہی دینے والے شخص کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ ویسے ہی آگے بیان کر رہا ہے جیسا کہ اس نے خود سنا تھا۔(11) لہرر اس خیال سے متفق ہیں کہ صرف راوی کا قابلِ بھروسہ ہونا اس بات کے لیے کافی نہیں کہ اس کی بتائی ہوئی بات سے حقیقت جانی جا سکے، اور نا صرف یہ کہ اس بات کی بھی چھان بین کی جانی چاہیے کہ آیا ایک شخص قابلِ بھروسہ ہے کہ نہیں (اس تصور کو لہرر نے 'سچائی کے ربط' کا نام دیا) بلکہ ہمیں خود بھی اس تحقیق میں دیانتدار اور قابلِ بھروسہ ہونا ہوگا۔(12)

گواہی سے پہنچنے والی معلومات کی چھان پھٹک کے لیے، معاملے کے پسِ منظر سے واقفیت، دیگر افراد کی علم کے اس شعبے سے متعلق رائے، اور ذاتی اور اجتماعی مشاہدات، یہ سب عوامل کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

لہرر کا کہنا ہے کہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کسی راوی کے قابلِ اعتبار ہونے کے بارے میں ہماری اپنی رائے بھروسے کے لائق ہے، ہمیں دیکھنا ہوگا کہ آیا اس سے قبل جو ہم نے کسی کے بارے میں رائے دی تھیں وہ درست ثابت ہوئیں یا

غلط۔ لیکن جب ہم کسی کے بارے میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کی گواہی قابلِ بھروسہ نہیں تو عموماً اس کے پیچھے دیگر لوگوں کی اس شخص سے متعلق گواہی ہوا کرتی ہیں۔(13) یہاں سے ایک کبھی ختم نہ ہونے والے سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے، کیونکہ کسی گواہی کی چھان بین کرنے کے لیے ہمیں دیگر مزید گواہیوں پر انحصار کرنا ہوتا ہے۔ لہرر کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک 'خیر کا چکر' ہے۔(14) لیکن کیسے؟ پروفیسر لہرر اس کی دو وجوہات بیان کرتے ہیں۔

'پہلی بات، سچائی یا دیانت سے متعلق کسی بھی مکمل تصور کو یہ بھی بتانا ہو گا کہ اس تصور کو حقیقت تسلیم کرنا ہمارے لیے کیوں کر درست ہے۔ لہٰذا اس نظریے کو اپنے اصولوں پر خود بھی پورا اترنا چاہیے اور ثابت کرنا چاہیے کہ اسے ماننا کیوں برحق ہے۔ دوسری بات جو کہ اتنی ہی اہم ہے، یہ ہے کہ ہمارے بذاتِ خود دیانت دار ہونے کا انحصار اس بات پر ہونا چاہیے کہ ہم نے ماضی میں کن امور کو درست تسلیم کیا، بشمول وہ حقائق جن کو ہم نے کسی دوسرے شخص کی گواہی کی بنا پر تسلیم کیا۔ نتیجتاً، کسی بات کو سچ تسلیم کرنے کے معاملے میں ہماری دیانت اور جن امور کو ہم نے ماضی میں حقیقت جانا، کے درمیان ایک طرح کا باہمی ربط پایا جائے گا۔ ہماری سچ تسلیم کی گئی باتوں کے درمیان پایا جانے والا باہمی تعلق ہی یہ بتاتا ہے کہ باتوں کو سچ تسلیم کرنے کی ہماری صلاحت کتنی قابلِ بھروسہ ہے۔(15)

رجوع کا حق[[The right of deferral

لہرر کی 'اعتبار' سے متعلق گفتگو سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم دیگر افراد یا ماہرین کی آراء کے قابلِ بھروسہ ہونے کو کیسے پرکھیں؟ پروفیسر بنجمن مک مائیلر نے ایک دلچسپ نکتہ پیش کیا ہے جو اس سوال کا جواب دینے میں مددگار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گواہی سے متعلق علمی مسائل کو ایک نئے پیرائے میں ڈھالا جا سکتا ہے، اور وہ ہے 'رجوع کرنے کے علمی استحقاق کے مسئلے کا بیان'۔(16) مک مائیلر کہتے ہیں کہ اگر ایک سامع کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ معاملے سے متعلق ابھرنے والے سوالات، بیان کرنے والے کی جانب لوٹا سکے تو اس سے 'گواہی' کے مسئلے کو ایک نئی جہت میسر آجائے گی۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ سننے والے اور بیان کرنے والے دونوں اشخاص ذمہ داری قبول کرنے کا اقرار کریں۔ بیان

کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ بتائے کہ جو وہ کہہ رہا ہے وہ اس تک بذریعہ گواہی پہنچا ہے۔اور سننے والا بخوبی واقف ہو کہ بیان کرنے والا اس کے لیے تیار ہے کہ اس کے سامعین اس کی بیان کی گئی معلومات سے متعلق کسی بھی مسئلہ پر اس سے رجوع کرنے کا حق رکھتے ہیں۔(17)

'گواہی' کو قابلِ بھروسہ بنایا جا سکتا ہے اگر مسائل کے لیے رائٹر یا بیان کرنے والے کی طرف رجوع کے طریقے کو اختیار کیا جائے۔اگر ان مسائل کے تسلّی بخش جواب مل جائیں تو اس سے بھروسہ بڑھ سکتا ہے۔مثلاً لسانیات کے ایک پروفیسر دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن یکتا و بے مثل ہے، یہ کہتے ہوئے وہ قرآن کی بلاغت، اور اس کی منفرد ادبی ساخت اور طرز پر روشنی ڈالتے ہیں۔سامعین پروفیسر صاحب کی بیان کی گئی معلومات کا راوی بننا قبول کرتے ہیں لیکن اس سے قبل کچھ اعتراضات کرتے ہیں۔یہ اعتراضات سوالات کی شکل میں ہیں۔جیسا کہ: کیا آپ قرآن سے اس کی مزید مثالیں پیش کر سکتے ہیں؟، قرآن کے ادبی اسلوب کے بارے میں دیگر ماہرین فن کی کیا رائے ہیں؟، جو ماہرین علم آپ کی بات سے اختلاف رکھتے ہیں ان کے اعتراضات کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟، اور یہ کہ قرآن کا تاریخی پسِ منظر جو معلومات ہمیں دیتا ہے آیا اس سے آپ کے دعوے کی تائید ہوتی ہے؟ پروفیسر صاحب ان سوالات کے تسلّی بخش جوابات دیتے ہیں اور یوں سامعین ان کی بات پر اعتبار کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

عینی شہادت سے متعلق چند باتیں[[A note on eyewitness testimony

ابھی تک ہماری ساری گفتگو گواہی کے ذریعے حاصل کی گئی معلومات سے متعلق تھی اور کسی واقعے یا جرم کے آنکھوں دیکھے احوال کی یادداشت پر ہم نے کوئی گفتگو نہیں کی۔

عینی شہادت سے متعلق دستیاب معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہمارے اس مضمون کا مقصد اگرچہ عینی شہادت پر کیے گئے مطالعے اور تحقیق کے نتائج اور مضمرات پر گفتگو نہیں ہے لیکن چونکہ عینی شہادت کے قابلِ بھروسہ ہونے پر ایک علمی سوال اٹھایا جاتا ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس معاملے کو گواہی کے ذریعے حاصل کی گئی معلومات کے

معاملے سے نہ جوڑا جائے۔ یہ دو بالکل واضح طور پر الگ معاملے ہیں۔ عینی شہادت کے درست ہونے میں، ہماری محدود اور ناقص یادداشت، نفسیاتی اثرات، اور ایک واقعہ کس ترتیب سے پیش آیا یہ یاد رکھنے کی محدود صلاحیت، ہماری رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ دوسری جانب گواہی کے ذریعے حاصل کیے گئے علم، تصورات اور خیالات پر یہ عوامل اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ گواہی کے ذریعے معلومات تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچتی ہیں جنہیں نسبتاً طویل عرصے میں غور و فکر کے بعد جذب کیا گیا ہوتا ہے۔

یہاں سے ہم اپنے موضوع سے تھوڑا دور نکلتے ہیں لیکن یہ بھی اس بحث کے لیے مفید ہو گا۔ ڈیوڈ ہیوم نے معجزات پر لکھا۔ اس کا کہنا ہے کہ معجزات کی بابت جاننے کا واحد ذریعہ عینی شہادت ہے۔ اس کے بقول ہمیں معجزے پر صرف اس صورت میں یقین کرنا چاہیے کہ جب عینی شاہد کے غلطی کرنے کا امکان، معجزے کے وقوع پذیر ہونے کے امکان سے زیادہ ہو۔(18)

واحد عینی گواہ کے معاملے میں اٹھنے والے اعتراضات سے ہٹ کر، متعدد عینی گواہوں کے بیان کو سنجیدگی سے لیا جا سکتا ہے (اسلامی تحقیق میں جسے تواتر کہا جاتا ہے)۔ اگر کسی معاملے میں کثیر تعداد میں (یا ایک معقول تعداد میں) گواہوں سے علیحدہ علیحدہ مختلف واسطوں سے معلومات حاصل کی گئی ہوں، اور ان گواہوں میں سے ایک بڑی تعداد ایک دوسرے سے کبھی ملی بھی نہ ہو تو ایسی معلومات کو رد کرنا نامعقول طرزِ عمل ہو گا۔ ہیوم نے خود اس طرح کی شہادت کی سچائی کو قبول کیا اور تسلیم کیا کہ معجزات کو ثابت کرنا ممکن ہے اگر کثیر تعداد میں شہادتیں دستیاب ہوں۔

'میں یہاں اپنے اس دعوے کی حدود واضح کرنا چاہوں گا کہ جب میں کہتا ہوں کہ معجزات کبھی بھی اس قدر یقین کے ساتھ ثابت نہیں کیے جا سکتے کہ ان پر کسی مذہب کی بنیاد رکھی جائے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ معجزات یا فطرت کے معمول کے خلاف ایسے واقعات رونما ہوں کہ جن کو انسانوں کی گواہی کے ذریعے تسلیم کیا جا سکے (اگرچہ ان کا ذکر انسانی تاریخ کی تمام روداد میں پایا جانا شاید ممکن نہیں)۔ فرض کیجیے تمام زبانوں کے تمام مصنف اس بات پر

متفق ہوں کہ یکم جنوری 1600 سے پورے کرۂارض پر آٹھ دنوں کے لیے مکمل تاریکی چھا گئی۔ اور فرض کیجیے کہ اس غیر معمولی واقعے کا تذکرہ آج بھی لوگوں کے درمیان اس طرح زندہ ہے کہ دیگر ملکوں کے سفر سے آنے والے تمام مسافر اس واقعے کا احوال کسی معمولی سے فرق یا تضاد کے بغیر بیان کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ہمارے دور کے تمام فلسفی حضرات کو چاہیے کہ اس واقعے پر شک کرنے کے بجائے، اس کو بطور حقیقت تسلیم کریں۔(19)

اس مضمون میں واقعات یا عینی شاہدین کی دی گئی خبر ہمارا موضوعِ گفتگو نہیں ہے، ہم گواہی کے ذریعے حاصل کی گئی معلومات پر بات کر رہے ہیں، اور ان دو سے وابستہ تصورات میں بہت واضح فرق ہے۔ لیکن پھر بھی ہم پڑھنے والوں کے لیے ان دو طرح کی شہادتوں کے درمیان فرق کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

مضمون کے اس حصے کو مکمل کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ گواہی معلومات کے حصول کا ایک لازم ذریعہ ہے۔ گواہی کے بنا ہمارے زمانے کی معروف سائنسی ترقی نہ ہو پاتی، ہمارے بہت سے مستند حقائق کی حیثیت فقط کسی شکی انسان کے وہم سے زیادہ نہ ہوتی، اور زمین کے چپٹا ہونے کے دعویداروں کو ہمارا یوں مزے سے جھٹلانا معقول رویہ نہ ہوتا۔ گواہی سے معلومات اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری دیگر افراد کی دیانتداری جانچنے کی صلاحیت قابلِ بھروسہ ہو نیز ہم ایسی معلومات سے متعلق شبہات کے ازالے کے لیے گواہی دینے والے شخص سے رجوع کریں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم یہ یقینی بنائیں کہ گواہی دینے والے شخص کی باتیں باہم مربوط ہیں، اور یہ جاننے کے لیے ہم اس کی دی گئی دیگر شہادتوں اور اس کے سابقہ احوال پر بھی نظر ڈال سکتے ہیں۔

☆توجیہ[[Inference to the best explanation

توجیہہ ایک نہایت کارآمد طرز فکر کا نام ہے کہ جس میں دستیاب حقائق اور سیاق وسباق سے متعلق معلومات کو ایک ربط دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم سے ہمارا معالج دریافت کرتا ہے کہ آپ کیسے ہیں تو ہم اپنی علامات کچھ یوں بتاتے ہیں: ناک بند ہے، گلے میں خراش ہے، چھینکیں آرہی ہیں، آواز بھاری ہے، کھانسی ہو رہی ہے، آنکھوں میں پانی آرہا ہے، بخار کی کیفیت ہے، سر اور جسم میں درد ہے، اور تھکن ہو رہی ہے۔ ان معلومات کی روشنی میں معالج یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کیوں بیمار ہیں۔ اپنی سابقہ معلومات کے ذریعے جو انہوں نے اپنی میڈیکل کی تعلیم کے دوران حاصل کی تھیں، وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ کی علامات کی درست توجیہہ دراصل نزلے سے ہی ہوتی نظر آتی ہے۔ تاریخ اور فلسفے کے پروفیسر پیٹر لپٹن(Peter Lipton) بالکل اسی طرح توجیہہ کے عملی اور ناگزیر استعمال کو بیان کرتے ہیں:

ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس مریض کو خسرہ ہے کیوں کہ دستیاب شواہد کی بہترین ممکنہ توجیہہ یہی ہے۔ خلا باز سیارہ نیپچیون کی حرکت کے قائل ہو جاتے ہیں کیوں کہ سیارہ یورینس میں دیکھی گئی غیر متوقع تبدیلیوں کی یہی سب سے بہترین توجیہہ ہو سکتی ہے۔ معقول ترین توجیہہ کے اصول کے مطابق، ہمارے نتیجہ اخذ کرنے کے عمل کا انحصار ممکنہ صورتوں پر ہوتا ہے۔ دستیاب حقائق اور اس کے سیاق وسباق سے متعلق تصورات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ کون کون سی صورتیں متبادل کے طور پر تصور کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ وہ درست ہوں۔(20)

ان ممکنہ صورتوں میں سے جنہیں ہم چنیں گے وہ نا صرف بظاہر معقول نظر آتی ہوں بلکہ ان کے ساتھ وہ حقائق بھی دستیاب ہوں جو ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتے ہوں۔ لپٹن کہتے ہیں 'ہم بظاہر معقول نظر آنے والی ممکنہ صورتوں سے آغاز کرتے ہیں اور پھر ہم ایسے حقائق تلاش کرتے ہیں جو ان کے درمیان فرق کر سکیں۔ ہم اخذ کیا گیا ایک نتیجہ اس وقت چھوڑ دیتے ہیں جب کوئی دوسرا اس سے زیادہ معقول متبادل پیش کر دے، چاہے سارے حقائق وہی ہوں جو پہلے والے نتیجے تک پہنچنے میں استعمال کیے گئے ہوں۔(21)

مزید حقائق تک رسائی وہ واحد طریقہ نہیں کہ جس سے ہم دو متبادل ممکنہ صورتوں میں سے ایک کو زیادہ معقول تسلیم کر سکیں۔ سب سے بہترین توجیہہ وہ ہو گی جو سب سے آسانی سے سمجھ میں آتی ہو۔ لیکن یہ باآسانی سمجھ میں آنا صرف پہلی شرط ہے، اس سے آگے ہمیں یہ بھی یقینی بنانا ہو گا کہ باآسانی سمجھ میں آنے کے ساتھ ساتھ یہ جامع بھی ہو۔ جامع ہونے سے مراد یہ ہے کہ ایک ممکنہ صورت میں توجیہہ کی مکمل گنجائش اور اس کا دائرہ وسیع ہو۔ ممکنہ صورت کو تمام دستیاب حقائق پر درست بیٹھنا چاہیے، چاہے وہ بالکل منفرد اور مختلف حقائق ہوں۔

کسی ممکنہ صورت کے جامع ہونے کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے مشاہدات اور حقائق کو بھی اپنے دامن میں سمو سکتی ہو جن سے ماضی میں لوگ واقف نہ تھے، یا جو بالکل غیر متوقع یا ناقابل توجیہہ سمجھے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اہم اصول یہ ہے کہ کسی ممکنہ صورت کو درست تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سے متعلق پہلے سے موجود معلومات کی روشنی میں اس صورت کے حقیقت ہونے کا امکان دیگر ممکنہ صورتوں سے زیادہ ہو۔ پرنسٹن یونیورسٹی کے تدریس سے وابستہ فلسفی گلبرٹ ایچ ہرمین (Gilbert H. Harman) کا کہنا ہے کہ جب ایک سے زیادہ صورتیں ممکن ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو حقیقی ماننے کے لیے ضروری ہے کہ دیگر تمام ممکنہ مفروضوں کو رد کیا جاسکتا ہو۔ اس طرح ہم اس بنیاد پر کہ ایک مفروضہ دیگر مفروضوں کے مقابلے میں حقائق کی زیادہ بہتر توجیہہ کر سکتا ہے، یہ نتیجہ قائم کر سکتے ہیں کہ ہماری فرض کی گئی صورت واقعی درست ہے۔(22)

اوپر جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاملے کی معقول ترین توجیہہ کرنا ایک ناگزیر طرزِ فکر ہے۔ یہاں تک کہ یہ ہمیں کسی معاملے کے بارے میں یقینی علم تک لے جاسکتا ہے۔ اگر ہمارے سامنے گنے چنے حقائق ہی دستیاب ہوں اور ان سے چند ہی ممکنہ صورتیں سامنے آسکتی ہوں تو معاملے کی معقول ترین توجیہہ کو کافی حد تک یقینی سمجھا جائے گا، کیوں کہ اس سے بہتر صورت فرض کرنے کی گنجائش یا ایسے حقائق جو ہماری معقول ترین توجیہہ کو تبدیل کر سکتے ہوں کے ملنے کے امکان نہیں ہوں گے۔ قرآن آسمانی کتاب ہے یہ دعوی اسی طرح یقینی طور پر ثابت ہوا ہے۔ قرآن کی تصنیف سے متعلق چند ہی ممکنہ صورتیں سوچی جاسکتی ہیں اور اس کے الہامی ہونے کے سوا اور کوئی

سمجھ میں آنے والی صورت ممکن نہیں۔ بطور مثال ہم اب یہ توقع نہیں کر سکتے کہ کلاسیکل عربی کا کوئی نیا لفظ لکھا جائے گا ، نیز عربی زبان کی کوئی نئی تاریخ رقم کیا جانا بھی بعید از عقل ہو گا۔

دلیل قائم کرنا((Formulating an argument:

ہماری ابھی تک کی بحث کا مقصد گواہی اور کسی معاملے کی معقول ترین توجیہہ کے ذریعے معلومات کے حصول کی اہمیت واضح کرنا تھا۔ لیکن صرف گواہیوں کا ذکر کرنا کافی نہ ہو گا کیوں کہ قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے سے متعلق ماہرین کی ایک سے زائد آراء ملتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس کے پسِ منظر سے متعلق مصدقہ احوال پیش کرنا ہوں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ قرآن کے بے مثل و یکتا ہونے کے حق میں جو رائے ملتی ہیں ان کو کیوں کر حقیقت پر مبنی تسلیم کیا جائے۔

سابقہ احوال میں قابلِ ذکر حقائق یہ ہیں کہ قرآن اپنے شاہکار زبان و ادب کے مقابلے کی دعوت دیتا ہے اور یہ کہ ساتویں صدی کے عرب اپنے خیالات کے اظہار کے لیے عربی زبان پر کمال درجے کا عبور رکھتے تھے، اور یہ کہ اس کے باوجود قرآن جیسا کوئی کلام وہ پیش نہ کر سکے۔ اگر ہم ان حقائق کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کے حق میں پائی جانے والی ماہرین کی آراء کو اختیار کرنا ایک معقول انتخاب سمجھا جائے گا کیوں کہ ان حقائق کا سچ ثابت ہونا ایسی آرا کو اختیار کرنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ آراء جو قرآن کے یکتا ہونے کے خلاف ہیں وہ عقل سے بعید سمجھی جائیں گی کیوں کہ وہ ایسے حقائق سے متصادم ہوں گی جو ثابت شدہ ہیں (ہم آگے انہیں ثابت کرنے جا رہے ہیں)۔ جب ایک دفعہ گواہی (ماہرین کی آراء) کے ذریعے حاصل معلومات پر اطمینان حاصل ہو جائے گا تو ممکنہ متبادل صورتوں کا تجزیہ کیا جائے گا تاکہ ان میں سے معقول ترین صورت تسلیم کی جا سکے کہ یا تو قرآن کسی عرب کی تخلیق ہے، یا کسی غیر عرب کی، یا محمد ﷺ کی، یا پھر خدا کی۔ اس آرگومنٹ کا خلاصہ یہ ہے:

1. قرآن انسانوں کو اپنے ادبی و لسانی شاہکار کے مقابلے کی دعوت دیتا ہے۔

2. ساتویں صدی کے عرب اس مقابلے کے لیے موزوں ترین افراد تھے۔

3. ساتویں صدی کے عرب قرآن کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے۔

4. ماہرین نے قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی تصدیق کی۔

5. ایسے ماہرین کی آراء جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں کیوں کہ وہ ثابت شدہ حقائق سے متصادم ہیں۔

6. لہٰذا ان پانچ نکات سے ثابت ہوا کہ قرآن یکتا و بے مثل ہے۔

7. قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی بابت یہ چار توجیہات سوچی جاسکتی ہیں، قرآن کسی عرب نے تصنیف کیا، یا کسی غیر عرب نے یا محمد ﷺ نے یا پھر خدا نے۔

8. قرآن کی تخلیق کسی عرب، غیر عرب یا محمد ﷺ کے بس سے باہر ہے۔

9. چناچہ جو سب سے معقول توجیہہ تصور کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ خود خدا نے اسے تخلیق کیا ہے۔

اس مضمون کے بقیہ حصے میں ہم ان حقائق کی تفصیل بیان کریں گے۔

1. قرآن انسانوں کو اپنے ادبی و لسانی شاہکار کے مقابلے کی دعوت دیتا ہے:

''پڑھیے اپنے رب کے نام سے''۔(23) یہ پانچ الفاظ محمد ﷺ پر چودہ سو سال قبل نازل ہوئے۔ محمد ﷺ کہ جن کے بارے میں معروف ہے کہ وہ مکہ سے کچھ دور ایک غار میں تنہائی میں غور و فکر کیا کرتے تھے پر ایک ایسی کتاب کا

نزول ہوا جس نے ہماری دنیا پر غیر معمولی نقوش ثبت کیے۔ محمد ﷺ کہ جن کو کبھی شعر کہتے نہیں سنا گیا، اور نہ جن میں کوئی قابل ذکر زبان دانی کے جوہر محسوس کیے گئے، پر ایک ایسی کتاب کے اترنے کا آغاز ہوا جس میں عقائد، قانون، عبادات، روحانیت اور معاشیات کے معاملات ایک بالکل نئے ادبی اسلوب اور طرز میں بیان ہوئے ہیں۔(24)

قرآن کے منفرد لسانی اور ادبی کمالات کو مسلمانوں نے اپنے اس عقیدے کہ قرآن خدا کی جانب سے الہام کیا گیا ہے' کی سند کے طور پر پیش کیا۔ قرآن کی مثل کوئی کلام تخلیق کرنے میں تمام افراد کی ناکامی نے مسلمانوں کے دینی عقیدے الاعجاز القرآن (قرآن یکتا و بے مثل ہے) کی بنیاد رکھی۔ 'اعجاز' ایک اسمِ فعل ہے جس کے معنی 'معجزاتی' کے ہیں اور یہ لفظ فعل 'عجزہ' سے ماخوذ ہے جس کے معنی 'عاجز ہو جانا، لاچار ہو جانا' ہیں۔ اس اصطلاح کے معنی وہ عقیدہ ظاہر کرتے ہیں کہ جس کے مطابق عربوں کے ماہرینِ کلام قرآن کے جیسا کوئی کلام پیش کرنے سے قاصر رہے۔ جلال الدین السیوطی جو کہ پندرہویں صدی کے مانے ہوئے مصنف اور عالم گزرے ہیں اس نظریے کو یوں بیان کرتے ہیں:

''جب محمد ﷺ نے انہیں مقابلے کی دعوت دی، وہ لوگ اس دور کے سب سے فصیح و بلیغ ماہرینِ کلام تھے، چناچہ انہوں نے انہیں دعوت دی کہ وہ قرآن کی مثل کوئی کلام تخلیق کر کے دکھائیں۔ سالہا سال بعد بھی وہ ایسا نہ کر سکے، جیسا کہ خدا نے فرمایا 'اگر یہ سچے ہیں تو ان سے کہو اس کی مثل کوئی کلام بنا لائیں'۔ اس کے بعد محمد ﷺ نے انہیں دعوت دی کہ وہ (پورا قرآن نہیں)، صرف دس سورتیں بنا لائیں۔ خدا کے الفاظ میں 'ان سے کہو، اچھا تو دس سورتیں ہی بنا لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جسے چاہو اپنی مدد کے لیے بلا لو، اگر تم سچے ہو'۔ اس کے بعد محمد ﷺ نے دعوت دی کہ صرف ایک سورت ہی قرآن جیسی بنا کر دکھا دو، جیسا کہ خدا نے فرمایا ''ان کے خیال میں کیا نبی ﷺ نے یہ خود گھڑ لیا ہے؟۔ ان سے کہو اس جیسی ایک سورت ہی تم بنا کر دکھا دو اور خدا کے سوا اپنی مدد کے لیے جسے چاہو بلا لو، اگر تم سچے ہو''۔ جب عرب ایک سورت بھی نہ بنا سکے جب کہ ان کے درمیان اس دور کے چوٹی کے ماہرینِ کلام موجود تھے، تو محمد ﷺ نے واشگاف الفاظ میں ان کی ناکامی اور بے بسی کا اعلان کر دیا اور قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے ثابت کر دیا۔

اس پر خدا نے فرمایا ''کہو اگر تمام کے تمام انسان، اور جنات مل کر بھی چاہیں کہ قرآن جیسا کچھ بنالیں تو وہ نہیں بنا سکتے چاہے وہ ایک دوسرے کی مدد ہی کیوں نہ کریں''۔(25)

قدیم مفسرین کے مطابق، قرآن کی وہ آیات جو اس جیسی دس سورتیں بنانے کے لیے مقابلے کی دعوت دیتی ہیں، وہ ہر زمانے کے ماہرین کلام کو اس کے کے ادبی و لسانی کمالات کے مقابلے کے لیے للکارتی ہیں۔(26)اس مقابلے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ گرامر کے چند محدود قواعد، ادبی و لسانی تراکیب، اور عربی زبان کے اٹھائیس حروف تہجی پر مشتمل ہیں۔اور یہ ذرائع بلا تخصیص، سب افراد کے لیے آزادانہ دستیاب ہیں۔یہ حقیقت کہ اپنے نزول کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی اس مقابلے کو نہ جیت سکا، عربی زبان اور قرآن سے واقفیت رکھنے والے بیشتر علماء کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں۔

2. ساتویں صدی عیسوی کے عرب عربی زبان پر سب سے زیادہ عبور رکھتے تھے:

قرآن نے عربی زبان کے چوٹی کے ماہرین کو مقابلے کی دعوت دی، یعنی ساتویں صدی کے عرب۔ مغربی و مشرقی علم و فضل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے عربی زبان کی بلاغت کی انتہاؤں کو چھو لیا تھا۔ایک مشہور سکالر تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ بلاغت اور کلام میں مہارت ساتویں صدی کے عربوں کے خون میں شامل تھی۔(27)نویں صدی کے شعراء کی سوانح لکھنے والے الجماہی کے مطابق 'شعر عربوں کے لیے ان کے تمام علم کو مرتب کرنے کا ذریعہ تھا اور ان کی ذہانت کا اعلیٰ ترین نشان تھا، اسی سے وہ اپنے معاملات کا آغاز کرتے اور اسی پر ان کا اختتام ہوتا'۔(28)چودھویں صدی عیسوی کے مشہور سکالر ابنِ خلدون عربوں کی زندگی میں شعر و شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'واضح رہے کہ عرب شاعری کو گفتگو کا ایک قابل فخر طریقہ سمجھتے تھے۔ چناچہ اسی میں انہوں نے اپنی تاریخ رقم کی، اس کے ذریعے انہوں نے اپنے خیر اور شر کے معیار محفوظ کیے اور اسی میں انہوں نے اپنے سائنسی اور عقلی علوم کی اصولی بنیادیں بیان کیں'۔(29)

ساتویں صدی کے عربوں کی معاشرت میں زبان پر قدرت اور کمال ایک نہایت موثر خوبی سمجھی جاتی تھی۔ادبی نقاد اور تاریخ دان ابنِ رشد اس معاشرے کی کچھ اس طرح تصویر کھینچتے ہیں: 'جب بھی کسی عرب قبیلے میں کوئی شاعر ابھرتا، دیگر قبائل اس قبیلے کو مبارکباد دینے پہنچتے، دعوتیں کی جاتیں، خواتین دھنیں بجاتیں جیسا کہ وہ شادی کے موقع پر کیا کرتیں، اور بزرگ اور جوان جھومتے جیسا کہ کسی خوشخبری پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ عرب ایک دوسرے کو صرف دو مواقع پر مبارکباد پیش کرتے، ایک کسی بچے کی ولادت پر اور دوسرا جب ان کے یہاں کوئی شاعر پیدا ہوتا۔(30) نویں صدی کے عالم ابنِ قطیبہ شاعری کو ایک عرب کی نگاہ سے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں 'شاعری، ان کے لیے گویا علم کی کان تھی، عقل و دانش کی کتاب تھی، جھگڑے کے موقع پر ایک سچا گواہ تھی، اور بحث و تکرار میں آخری دلیل'۔ (31)

ایک عرب کو عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کتنی ریاضت کرنی ہوتی تھی اس پر اسلامی علوم کے ایک ماہر نوید کرمانی روشنی ڈالتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب ایک ایسی دنیا میں رہتے تھے کہ جو شعر و شاعری کو خراجِ تحسین پیش کرتی تھی۔ 'قدیم عربی شاعری ایک نہایت پیچیدہ عجوبہ ہے۔ اس کی لغت، گرائمر کا انوکھا مزاج اور سخت اصول نسل در نسل منتقل ہوتے تھے، اور صرف اعلیٰ درجے کی خداداد صلاحیتیں رکھنے والے شاگرد ہی اس پر مکمل عبور حاصل کر پاتے تھے۔ ایک شخص کو سالوں بلکہ بعض صورتوں میں تو دہائیوں تک ایک ماہر شاعر کی زیرِ نگرانی شاعری سیکھنی ہوتی تھی تب جا کر وہ خود کو شاعر کہنے کے لائق ہوتا تھا۔ محمد ﷺ ایسے معاشرے میں پلے بڑھے کہ جس میں شاعری سے لوگ مذہب کی مانند عقیدت رکھتے تھے(32)

ساتویں صدی عیسوی کے عرب ایسی معاشرت میں جیتے تھے کہ جس میں عربی زبان میں اظہار کی بے مثل صلاحتیں پروان چڑھانے کے لیے مطلوب تمام سہولیات وافر موجود تھیں۔

3. ساتویں صدی کے عرب قرآن کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے:

اپنی ان تمام ادبی قابلیتوں کے باوجود وہ سب مل کر بھی قرآن کے ادبی و لسانی کمالات کے مقابلے کا کوئی عربی متن بنانے میں ناکام رہے۔ لسانیات کے ماہر پروفیسر حسین عبدالرؤف کہتے ہیں 'اس دور کے عرب زبان پر عبور، اس کے اصول ،کلام کی بلاغت، تقریر اور شاعری کے لحاظ سے زبان کی بلندیوں کو چھوتے تھے۔ اس کے باوجود، ان میں سے کوئی بھی، قرآن کی مانند کوئی ایک سورت بھی پیش نہ کر سکا'۔(33)

قرآنی علوم کی پروفیسر انجیلیکا نیورتھ (Angelika Neuwrith) کہتی ہیں کہ قرآن کے اس دعویٰ کو کبھی بھی شکست نہ دی جا سکی، نہ ماضی میں اور نہ ہی حال میں، یہ سچ ہے کہ کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔ میں سچ میں یہ سمجھتی ہوں کہ قرآن نے مغربی محققین کو بھی شر مسار کر دیا ہے کہ وہ یہ بتانے میں ناکام رہے کہ اچانک سے ایک ایسے ماحول میں جہاں کوئی قابل ذکر تحریر ہی موجود نہ ہو اس میں قرآن اس قدر پر معنی تصورات اور اتنی عالیشان زبان میں کیسے ظاہر ہو گیا۔(34)

لبید ابنِ ربیعہ سبعہ معلقات میں سے ایک شاعر تھے جنہوں نے قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کے اعتراف میں اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے شاعری چھوڑ دی۔ لوگ حیران تھے کیوں کہ لبید تو ان کے سب سے بڑے شاعر تھے۔(35) دریافت کرنے ہر انہوں نے جواب دیا 'کیا!۔۔ قرآن کے آجانے کے بعد شاعری کی کوئی گنجائش ہے؟'(36)

ایچ پامر ((H. Palmer جو کہ قرآن اور عربی زبان کے پروفیسر ہیں کہتے ہیں کہ صاحبانِ علم کے اس طرح کے دعوے حیرت کی بات نہیں۔ وہ لکھتے ہیں 'عربوں کے ماہر ترین اشخاص کا قرآن جیسے معیار کا کچھ بنالانے میں سدا ناکام ہونا باعثِ حیرت نہیں'۔(37)

اسلامی علوم کے ماہر، پروفیسر ایم اے دراز (M. A. Draz) تصدیق کرتے ہیں کہ ساتویں صدی کے ماہرین قرآن کے بیان میں یوں محو ہوئے کہ بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے۔ ''عربی زبان کے بلاغتِ کلام کے سنہری دور میں

زبان ترقی کرتے کرتے نفاست اور اظہار کی طاقت کی بلندیوں پر پہنچ چکی تھی، اور شعراء اور مقررین کو سالانہ میلوں میں بھرپور اعزاز کے ساتھ القابات سے نوازا جاتا تھا، ایسے حالات میں قرآن کے الفاظ نے شاعری اور نثر کو بے جان کر کے رکھ دیا، اور سات سنہری نظمیں جو کہ کعبے کے دروازے پر آویزاں کی جاتی تھیں 'اتار لی گئیں۔ اور سماعتیں ان سب سے کنارہ کش ہو کر قرآن کی شکل میں عربی زبان کے اس شاہکار پر جم گئیں۔(38)

ساتویں صدی سے ملنے والی کثیر شہادتیں اس سلسلے میں کسی بھی قسم کے شک کو باقی نہیں رہنے دیتیں کہ عرب عاجز تھے کہ وہ قرآن جیسا کوئی کلام پیش کرتے۔ اس حقیقت کا انکار کرنا کہ عرب بے بس ہو چکے تھے' بے دلیل ہو گا۔ جیسا کہ اس مضمون میں عینی شہادت پر بات کرتے ہوئے ہم نے پہلے عرض کیا، وہ روایتیں جو بتاتی ہیں کہ عرب قرآن کی مثل کچھ پیش کرنے میں ناکام ہوئے، تواتر (ایسا واقعے جس کا لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے ذکر کیا ہوا) کے درجے کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ماہرین کی ایک بڑی تعداد ہے کہ جن سے متعدد سلسلوں سے یہ معلومات ہم تک پہنچیں اور ان میں سے بہت سے ماہرین ایک دوسرے سے کبھی ملے بھی نہ تھے۔

ایک اور مضبوط دلیل جو اس بات کی تائید کرتی ہے کہ ساتویں صدی کے عرب قرآن جیسا کوئی کلام بنانے میں ناکام رہے، اس دور کے سیاسی و معاشرتی حالات سے متعلق ہے۔ قرآن میں مکہ میں بسنے والے قبائل کی غیر اخلاقی، ظالمانہ اور شیطانی طرزِ عمل کی بھرپور مذمت کی گئی ہے، جن میں خواتین سے ناروا سلوک، غیر منصفانہ تجارت، شرک، غلامی، بچوں کے قتل اور یتیموں سے غفلت شامل ہیں۔ قرآن کے پیغام نے مکہ کی قیادت کو للکارا، اور یہ ان کی لیڈرشپ اور ان کے اقتصادی مفادات پر ضرب لگانے والا تھا۔ اسلام کو پھیلنے سے روکنے کے لیے محمد ﷺ کے مخالفین کو بس اتنا کرنا تھا کہ قرآن کے لسانی و ادبی کمالات کے مقابلے میں اس جیسا کچھ تخلیق کر کے دکھا دیں۔

لیکن اسلام کا اپنے ابتدائی دور میں کہ جب یہ بہت کمزور تھا، کامیاب ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے اس دور کے سامعین قرآن کے اس چیلنج کا جواب نہ دے سکے۔ کوئی تحریک ہر گز کامیاب نہیں ہو سکتی اگر اس کے وہ دعوے کہ جن

پر اس کی بنیادیں کھڑی ہوں غلط ثابت ہو جاتیں۔ مکہ کے سرداروں کا اسلام کے خلاف جنگ اور تشدد جیسی مہم جوئی پر اترآنا یہ بتاتا ہے کہ اسلام کو ناکام کرنے کا آسان تر راستہ یعنی قرآن کے چیلنج کا جواب دینا کسی طور ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

4. اہلِ علم نے گواہی دی ہے کہ قرآن یکتا و بے مثل ہے

مشرق و مغرب کے دینی اور لادینی پسِ منظر رکھنے والے لاتعداد ماہرینِ علم نے اس کی تصدیق کی ہے کہ قرآن یکتا و بے مثل ہے۔ یہاں ہم نے ان میں سے صرف چند ایک کے ناموں کا ذکر کیا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کے مثل کوئی کلام نہیں بنایا جا سکتا۔

مشرقی علوم کے پروفیسر مارٹن زمِٹ (Martin Zammit) : اسلام سے پہلے پائی جانے والی طویل نظموں کے ادبی معیار سے قطع نظر۔۔ قرآن عربی زبان میں تحریری شکل میں پایا جانے والے سب سے ممتاز کلام کی حیثیت سے بلاشبہ اپنی مثال آپ ہے۔(39)

مشہور عالم شاہ ولی اللہ: اسکی اعلیٰ ترین درجے کی بلاغت کہ جس تک کسی انسان کا پہنچنا ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ ہم دورِ اول کے عربوں کے بعد کے زمانے کے ہیں اس لیے اس کا مکمل ادراک نہیں کر پاتے۔ لیکن جو ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن عظیم الشان میں سادہ لفظوں کو جس خوبصورتی کے ساتھ دلوں کو چھو لینے والے جملوں میں ڈھالا گیا ہے، کہ جن میں کوئی بناوٹ نہیں، اس کی مثال قدیم یا جدید دور کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔(40)

علومِ مشرق اور ادب کے مصنف اے جے آربیری (A. J. Arberry) : مجھ سے پہلے گزرے ماہرین کے کام کو کچھ آگے بڑھانے اور عربی قرآن کی مثل کوئی ایسا کلام بنانے کی کوشش میں کہ جس میں قرآن کی پر شکوہ بلاغت کی ادنی سی جھلک نظر آتی ہو، مجھے اس کے پیچیدہ اور جابجا پائے جانے والے مختلف نوعیت کے آہنگ کو سمجھنے میں مشکل کا

سامنا ہے، اور اس کے پیغام سے قطع نظر یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن انسانی تاریخ کے سب سے عظیم ادبی شاہکار ہونے کا ناقابل تردید دعوی کرتا ہے۔(41)

مشہور عالم تقی عثمانی: ان میں سے کوئی قرآن جیسے چند جملے بھی نہ بنا سکا۔ تصور کیجیے یہ وہ لوگ تھے کہ علامہ جرجانی کے بقول یہ ممکن نہ تھا کہ انہیں خبر ہو کہ زمین کے دوسرے سرے پر موجود کوئی شخص اپنے کلام کی بلاغت اور خطاب کی فصاحت پر نازاں ہے اور یہ اس کا اپنی شاعری میں مذاق نہ اڑاتے۔ یہ تصور کرنا محال ہے کہ انہیں بار بار مقابلے کے لیے پکارا جائے اور یہ خاموش بیٹھے رہیں اور آگے آنے کی جرات نہ کریں۔ انہوں نبی ﷺ کو اذیت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، ان پر جسمانی تشدد کرتے، انہیں پاگل قرار دیتے، انہیں جادوگر، شاعر اور کاہن کہتے، لیکن وہ قرآن کی مانند چند جملے بنانے میں بری طرح ناکام رہے۔(42)

امام فخر الدین: یہ اپنی بلاغت، اپنی منفرد طرز، اور غلطیوں سے مبراء ہونے کے سبب یکتا و بے مثل ہے۔(43)

الزملکانی: اس کے الفاظ اپنے متعلقہ معیار پر خوبصورتی سے پورے اترتے ہیں، اور اس کے جملے جس حکمت سے ترتیب دیے گئے ہیں ان کی معنیٰ خیزی کا کوئی مقابلہ نہیں، یہاں تک کہ اس میں پائی جانے والی ہر ادبی صنف اپنے ہر جملے اور ہر لفظ کے لیے لاثانی ہے۔(44)

پروفیسر بروس لارنس (Bruce Lawrence): واضح نشانی کے طور پر، قرآنی آیات لا متناہی سچائی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان سے تہہ در تہہ معنی کھلتے جاتے ہیں، روشنی در روشنی، معجزہ در معجزہ۔(45)

پروفیسر اور عربی دان ہملٹن گب (Hamilton Gibb): دیگر تمام عربوں کی طرح وہ (محمد) زبان اور بلاغت کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ تو اگر قرآن ان کی اپنی تخلیق ہوتا تو دیگر عرب بھی ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ انہیں کہو کہ اس

جیسی دس آیات بنالائیں، اور اگر نہ بنا سکیں (جو کہ صاف ظاہر ہے کہ وہ نہ بنا سکے) تو پھر قرآن کو ایک عظیم اور کھلا معجزہ تسلیم کر لیں۔(46)

قرآن کے بے مثل و یکتا ہونے کی لا تعداد دستیاب شہادتوں میں سے یہ صرف چند شہادتیں ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی مزید شہادتیں: المتنبّی اور شیکسپیئر

ابو الطیّب ابن الحسن المتنبّی الکندی عربوں کی نظر میں ایک بے مثال غیر معمولی صلاحیت کے حامل شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ دیگر شعراء نے بھی اس عظیم شاعر کی مانند قصیدہ گوئی اور منظوم کلام کہا لیکن کوئی ان کے بلاغت کے معیار اور اسلالیب کے تنوع کو نہ پہنچ سکا۔ چناچہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ المتنبّی یکتا ہے، کیوں کہ ہمارے سامنے ان کا کام بھی موجود ہے اور تمام ادبی وسائل بھی، لیکن ان کی جیسی شاعری کوئی نہیں کر سکا۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ قرآن کے یکتا اور بے مثل ہونے کے دعویٰ کو کمزور کر دیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ المتنبّی کی یہ ستائش بے بنیاد ہے۔ المتنبّی کے کام سے مماثل شاعری یہودی شعرئ موسی ابن عزراء اور سلمان ابن جبریل کے یہاں ملتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اندلسی شاعر ابن ہانی الاندلسی تو مشہور ہی مغرب کا المتنبّی کے لقب سے تھا۔(47)

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی عرب شاعری میں کسی نئی صنف کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اور یہ اس لیے تھا کہ یہ پہلے سے پائی جانے والی شاعری ہی کا تسلسل تھا۔ سکالر ڈینِس ای مک اولے (Denis E. McAuley) لکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کی شاعری براہِ راست تجربے کی بجائے سابقہ ادبی نہج سے ہی جڑی ہوئی تھی۔(48)

قدیم عربی شاعری میں یہ کوئی انہونی بات نہ تھی کہ ایک شاعر اپنے سے پہلے کے کسی شاعر کی نظم جیسی ایک نئی نظم کہتا کہ جو اسلوب، روانی اور موضوع میں اسی کے جیسی ہو۔ یہ ایک عام طریقہ تھا۔(49) یہ باعثِ حیرت نہیں کہ دینی

علوم کے پروفیسر ایمل ہومرین(Emil Homerin)نے ابن الفرید کے ادبی کام کا جائزہ لیااور اسے بڑی حد تک حقیقتاً المتنبّی کے پائے کا قرار دیا۔(50)

یہ واضح کرنے کے لیے کہ المتنبّی کے پائے کا کلام تخلیق کرنا ممکن ہے،انہوں نے بتایا کہ انہیوں نے ایک اور شاعر ابو نواس کے کام سے استفادہ کیا۔قرونِ وسطیٰ کے کئی ادبی نقادوں مثلاًالصاحب ابن عباد اور ابو علی محمد ابن علی حسن الہشیمی نے المتنبّی پر تنقید کی۔ابنِ عباد نے الکشف عن مساوی، شعر المتنبّی تصنیف کی جب کہ الہشیمی نے الرسالہ المضحفی ذکر سرقہ ابی الطیب المتنبّی میں المتنبّی کے ساتھ اپنی ملاقات کی آپ بیتی تحریر کی۔ان ادبی تنقیدوں کا حاصل یہ تھا کہ اگرچہ اس کا کام ایک غیر معمولی شخص کا تھا لیکن اس کے پائے کا کام تخلیق کرنا ممکن ہے۔الہشیمی المتنبّی کے خلاف ایک مضبوط دلیل پیش کرتا ہے اور دعوی کرتا ہے کہ اس کے کلام کی طرز یکتا نہیں ہے اور اس میں غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔پروفیسر سیگرا ے بون بیکر کہ جنہوں نے المتنبّی پر الہشیمی کی تنقید کا مطالعہ کیا اس نتیجے پر پہنچے کہ الہشیمی کی رائے کی اکثر و بیشتر مضبوط بنیادیں ہوا کرتی ہیں اور ایک قاری انہیں پڑھ کر آخر کار یہ محسوس کرتا ہے کہ المتنبّی بھی بس ایک عام سا شاعر تھا جس کے پاس نا صرف اپنے حقیقی خیالات کا فقدان تھا بلکہ اسے قواعد، لغت، اور فنِ خطابت پر بھی مطلوبہ عبور نہیں تھا، حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو اس نے نہایت برے ذوق کا مظاہرہ کیا۔(53)

شیکسپیئر کے بارے میں عمومی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ انگریزی زبان کے استعمال میں یکتا تھا۔لیکن اس کے باوجود اس کے کام کے بارے میں یہ دعوی نہیں کیا جاتا کہ اس جیسا کلام تخلیق کرنا ممکن نہیں ہے۔اس کی بیشتر نظمیں ایک عام پائے جانے والی طرز(iambic pentameter)پر تخلیق کی گئی ہیں کہ جو کہ منظوم کلام کا ایسا اسلوب ہے کہ جس میں ہر مصرعہ دس الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ الفاظ پانچ پانچ کے دو مجموعوں کی شکل میں ہوتے ہیں جن کو iambs یا iambic feet کہا جاتا ہے۔(54)اب چونکہ اس کے کام کا نقشہ ہمارے سامنے موجود ہے اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں کہ انگریز ڈرامہ نگار کرسٹوفر مارلو،اسی طرز میں لکھا کرتا تھا،اور شیکسپیئر کا موازنہ فرانسس بیومانٹ، جان فلیچر اور دیگر ڈرامہ نگاروں سے کیا جاتا رہا ہے۔(55)

قرآن کے بے مثل ویکتاہونے کے اقرار کالازمی نتیجہ یہ نہیں کہ سب اس کے الہامی ہونے کو تسلیم کرلیں:

ایک قابل غور نکتہ جو قرآن کے بے مثل ویکتاہونے کی علمی شہادتوں سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ ان ماہرین نے تسلیم کیا کہ قرآن کے مانند کوئی کلام بنانا ممکن نہیں، لیکن پھر بھی انہوں نے اس کے منجانب خداہونے کا اقرار نہیں کیا۔ اس دلیل میں خامی یہ ہے کہ یہ قرآن کے بے مثل ویکتاہونے کو معقول ترین ممکنہ توجیہہ کے ساتھ گڈ مڈ کررہی ہے۔ میں اس مضمون میں جو بحث پیش کررہاہوں وہ قرآن کے الہامی ہونے کو ان ماہرین کی رائے سے ثابت کرنا نہیں، بلکہ یہ بحث یہ بتانے کے لیے ہے کہ قرآن کے بے مثل ویکتاہونے کی جو معقول ترین توجیہہ کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے۔ ان ماہرین کا اس نتیجے یا قرآن کے الہامی ہونے سے اتفاق کرنا یا نہ کرنا غیر متعلق ہے۔ ماہرین کی رائے یہاں پیش کرنے کا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن یکتاہے اور اس کی مثل پیش کرنا ناممکن۔ ہمارا مقصود ان آراء کو پیش کرنے سے یہ نہیں کہ ان سے یہ بھی ثابت کیا جائے کہ قرآن خدا کی جانب سے ہے۔ یہ نکتہ تو قرآن کے متن کے یکتا و بے مثل ہونے سے اخذ ہوتا ہے، نا کہ اس سے کہ ان ماہرین نے قرآن کے بے مثل اور یکتاہونے سے کیا نتیجہ اخذ کیا۔

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ ممکن ہے ان ماہرین کی نظر سے وہ دلیل نہ گزری ہو کہ جو کہ معقول ترین توجیہہ کی جانب راہنمائی کرتی ہے، یا ممکن ہے کہ انہوں نے قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کے ممکنہ نتائج پر فلسفیانہ غور و فکر نہ کیا ہو۔ یہ علمی شخصیات ممکن ہے خدا ہی کی منکر ہوں اور فلسفہ فطرت پر یقین رکھتے ہوں۔ اور ان کی فطرت پرستی ان کو کسی بھی فوق الفطرت حقیقت تک پہنچنے سے روک دیتی ہو۔

بہت سے صاحبانِ علم خاص طور ہمارے دور کے پوسٹ ماڈرنسٹ ماحول میں رہنے والے افراد بہت سے علوم کو ایک خاص نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ چناچہ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو قرآن میں تو دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ان کا مقصد اس کے الہامی ہونے کی تصدیق یا اسلام قبول کرنا نہیں ہوتا بلکہ ادبی علوم کے مطالعہ کے غرض سے اس کو پڑھنا چاہتے ہیں۔

یہ علم کی جدید دنیا کا ایک عام رجحان بن چکا ہے۔ اس لیے جب یہ اہلِ علم قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے پر غور کرتے ہیں زیادہ امکان اس کا ہوتا ہے کہ وہ صرف اس کے ادبی کمالات پر غور کر رہے ہوں نہ کہ اس کے الہامی کتاب ہونے کے دعوے پر۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ آیا قرآن بے مثل ہے یا نفیس اور اگر ہے تو کس حد تک۔ وہ یہ جاننے سے قطعی دلچسپی نہیں رکھتے کہ قرآن کا یکتا اور بے مثل ہونا اس کے الہامی ہونے کے لیے درحقیقت کیا معنی رکھتا ہے۔

5. مخالف علمی آراء معقول نہیں کیوں کہ یہ ثابت شدہ سابقہ احوال کو نظرانداز کرتی ہیں

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کی روشنی میں گواہی کے ذریعے قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی جو معلومات ہم تک پہنچیں، ان پر یقین کرنا عقل کے تقاضے کے عین مطابق ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس موضوع پر مکمل اتفاق پایا جاتا ہے، یا تمام اہلِ علم یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ قرآن کے چیلنج کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ چند علمی آراء ایسی پائی جاتی ہیں اگرچہ کہ ان کی تعداد بہت کم ہے جو قرآن کے بے مثل ہونے کے خلاف ہیں۔ اگر ایک قابلِ بھروسہ شہادت کے لیے اتفاق لازم نہ ہو، تو آخر کیسے کوئی ایک گواہی کے سلسلے کو دوسرے سلسلے پر ترجیح دے؟

قرآن کے بے مثل و یکتا ہونے سے متعلق گواہی زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس کی بنیاد مستند سابقہ علم پر رکھی گئی ہے جن پر ہم نے 1، 2، 3 نکات میں گفتگو کی۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن انسانوں کو ایک ادبی و کلامی چیلنج کی دعوت دیتا ہے۔ ساتویں صدی کے عرب اس چیلنج کا جواب دینے کی سب سے بہتر استعداد رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود کلام کی دنیا کے یہ استاد اس چیلنج کا جواب دینے سے قاصر رہے۔

اس نظریے کی مخالف آراء کو لینا ایک عقل سے بعید بات ہوگی۔ کیوں کہ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اس سوال کا جواب دیا جائے کہ وہ لوگ جو اس چیلنج کا جواب دینے کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے، آخر کیوں اس میں ناکام رہے۔ اس کے جواب میں شاید اس مستند تاریخ کا انکار کر دیا جائے، یا ساتویں صدی کے عربی زبان کے چوٹی کے ماہرین سے زیادہ

بہتر عربی کی سمجھ بوجھ رکھنے کا دعویٰ کیا جائے۔اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخالف آراء کی بنیاد عقلی دلائل پر قائم نہیں۔ مستند تاریخ کے انکار کے لیے لازم ہوگا کہ عربی ادب کی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کیا جائے۔ یہ فرض کرنا کہ ساتویں صدی کے عربی زبان کے ماہرین سے بہترین اس زبان میں قابلیت حاصل کی جاسکتی ہے ایک بے بنیاد خیال ہے کیونکہ اس دور کے ماہرین کے ارد گرد ایک نسبتاً خالص ادبی ماحول تھا۔ یہ وہ ماحول ہے جس کے باعث زبان میں نفاست پیدا ہوتی ہے،اور جہاں غیر زبانوں سے آلودگی یا زبان کے بگاڑ کا امکان نہایت محدود ہوتا ہے۔آج کے دور میں عربی زبان کے ماحول میں دیگر زبانوں سے تال میل اور زبان کا بگاڑ بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے مقابلے میں زبان دانی کا دعویٰ کرنا جو زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے نہایت زرخیر ماحول میں پلے بڑھے ہوں،ایک بے معنی بات ہے۔

ان دلائل کی کمزوری سے قطع نظر، جب ان اہلِ علم کی آراء کا تجزیہ کیا جاتا ہے جو قرآن کے بے مثل و یکتا ہونے کے مخالف ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کے دانشمند حضرات زبان میں مہارت کی قلت کا شکار ہیں۔ اس خامی کی ایک مثال مشہور زمانہ جرمن مستشرق صاحبِ علم تھیوڈور نالڈک((Theodor Nöldeke کی تحقیق میں دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ ایک تدریس سے وابستہ قرآن کی ادبی خصوصیات کے نقاد تھے اور اس حیثیت سے قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کے عقیدے کو رد کرتے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کی تنقید سے اس قسم کی آراء کا غیر مصدقہ ہونا بالکل واضح ہو گیا۔ مثال کے طور پر نالڈک کا یہ کہنا کہ قرآن میں خطاب کرنے والی ہستی بار بار، بنا کسی قاعدے کے اور ایک بھدے انداز میں تبدیل ہوتی ہے۔(56)

قرآن کا وہ ادبی اسلوب جس کی طرف نالڈک نے اشارہ کیا دراصل پراثر تقریر کی ایک خاصیت ہے جسے التفات یا قاعدے کی تبدیلی کہا جاتا ہے۔ یہ ادبی اسلوب تحریر کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے اور عربی فنِ کلام کا ایک جانا پہچانا، تحقیق شدہ جز ہے۔(57)اس کا ذکر الاثیر، سیوطی اور زرخشی کی عربی فنِ کلام کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔(58)

قاعدے کے اس نوعیت کی تبدیلی ان پر مشتمل ہوتی ہے: فرد میں تبدیلی، عدد میں تبدیلی، جس سے خطاب کیا جارہا ہو، صیغے، حروفِ جار، ایک ضمیر کو اسم سے تبدیل کرنے سمیت متعدد دیگر تبدیلیاں شامل ہیں۔(59) ان تبدیلیوں کا اصل مقصد گفتگو کے مرکز و محور کو بدلنا، قاری کو کسی خاص معاملے پر خبردار کرنا، اور متن کی شان میں اضافہ ہوتا ہے۔(60) اس کے زیرِ اثر تحریر میں تنوع پیدا ہوتا ہے، اس کا ایک مقام دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے، اور لے اور روانی پیدا ہوتی ہے اور قاری کی توجہ ایک ڈرامائی انداز میں تحریر کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے۔(61)

قرآن کی ایک سو آٹھویں سورت قاعدے کی تبدیلی کی ایک بڑی خوبصورت مثال پیش کرتی ہے:

(اے نبی ﷺ) بے شک، ہم نے تمہیں الکوثر عطا کر دیا۔ پس تم اپنے رب کے لیے ہی نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔(62)

اس سورت میں مخاطب (خطاب کرنے والا) جمع کا صیغہ 'ہم'، غائب واحد کے صیغے 'اپنے رب' میں بدل رہا ہے۔ یہ تبدیلی کوئی حادثاتی نہیں، یہ ایک بہت نپی تلی اور پیغمبر محمد ﷺ اور ان کے رب کے درمیان قریبی تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ جب 'ہم' استعمال کیا گیا تو اس کا مقصد شاہانہ جلال، قوت، اور خدا کا مقتدر ہونا بتانا تھا۔ یہ ضمیر اس لیے استعمال کی گئی تاکہ معلوم رہے کہ خدا کے پاس یہ قوت اور صلاحیت ہے کہ وہ محمد ﷺ کو الکوثر عطا کر سکے۔ دوسری جانب، 'اپنے رب' کا مقصد گہرے تعلق، قربت، اور الفت کا اظہار تھا۔ ان الفاظ کا وسیع مفہوم ہے جو آقا، رزق دینے والے، اور خیال رکھنے والے پر مشتمل ہے۔ یہ زبان کا نہایت موزوں استعمال ہے کیوں کہ اس کا سیاق و سباق نماز، قربانی اور عبادت سے متعلق ہے 'پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو، اور قربانی کرو'۔ اس کے علاوہ اس سورت کا مقصد بھی پیغمبر محمد ﷺ کی دلجوئی ہے، اور ایسی محبت بھری زبان کے استعمال سے اس کی نفسیاتی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔

تھیوڈور کی قرآن پر تنقید نا صرف اس کے ذاتی رجحانات کا اظہار تھا بلکہ اس سے اس کا قدیم عربی کا ناقص فہم بھی آشکار ہو گیا۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلا کہ ساتویں صدی کے عرب مہارت کی کن بلندیوں پر فائز تھے۔ قاعدے کی یہ

تبدیلیاں قرآن کے رواں لب و لہجے کی علامت ہیں اور واضح طور پر قرآن کا ایک خاص اسلوب اور ایک جانا پہچانا طرزِ کلام ہے۔ قرآن اس اسلوب کو متن کی روح کے مطابق اور اپنی بات میں اثر پیدا کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں کہ پروفیسر نیل رابنسن نے اپنی کتاب(Discovering the Qur'an: A Contemporary Approach to a Veiled Text) ' ڈسکوورنگ قرآن: ایک پوشیدہ تحریر، دورِ حاضر کی نظر سے ' میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قرآن میں استعمال کی گئی قواعد کی تبدیلیاں دراصل کلام کی اثر انگیزی بڑھانے کا باعث ہیں۔(63)

لہٰذا ثابت ہوا کہ، مخالف آراء جو قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کا انکار کرتی ہیں، قابلِ التفات نہیں، کیوں کہ ان کو تسلیم کرنے سے الجھنیں پیدا زیادہ ہوتی ہیں اور حل کم۔ وہ سمجھ بوجھ جو اس طرح کی آراء کے پیچھے کارفرما ہے وہ ناقص اور عربی زبان کے درست فہم و تاریخ سے ناآشنا ہے۔ اگر قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کا انکار کرنا ہو تو ضروری ہے کہ ان سوالوں کا جواب دیا جائے: آخر کیا وجہ تھی کہ وہ عرب جو اس کے مقابلے کے لیے موزوں ترین تھے، وہ اس میں ناکام رہے۔ اس سوال کے ممکنہ جوابات عقلی طور پر سمجھ سے باہر ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر، مخالف آراء کو لینا غلط ہو گا۔

6. چناچہ (نکات 1-5) یہ ثابت ہوا کہ قرآن یکتا و بے مثل ہے۔

ایک سے لے کر پانچ تک سے یہ نتیجہ نکلا کہ قرآن کو بے مثل و یکتا تصور کرنا درست ہے۔

7. قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی توجیہہ کے متعلق چار ممکنہ صورتیں ہیں۔ یا تو اسے کسی عرب نے تصنیف کیا، یا کسی غیر عرب نے۔ یا پھر محمد ﷺ خود اس کے مصنف تھے، یا یہ مان لیا جائے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے۔

عربی زبان کی باریکیوں میں جائے بنا قرآن کے الہٰامی ہونے کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں گواہی اور استدلال کو استعمال کرنا ضروری ہے۔ اب تک ہم نے جو گفتگو کی ہے وہ یہ کہ قرآن یکتا و بے مثل ہے اس کی ایک قابل بھروسہ گواہی دستیاب ہے، اور یہ کہ اس کے یکتا و بے مثل ہونے کی توجیہہ کی یہی صورتیں سوچی جاسکتی ہیں کہ یہ کسی عرب، یا غیر عرب، یا محمد ﷺ یا خود خدا کی تصنیف ہو۔ تاہم، یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید کچھ مزید صورتیں بھی ممکن ہوں جو ابھی ہمارے علم میں نہیں۔ لیکن یہ دعویٰ دراصل ایک مغالطے کو جنم دیتا ہے جسے کچھ لوگ 'فرضی صورت کے مغالطے (" the fallacy of the phantom option")' کا نام دیتے ہیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی حقیقی متبادل صورت موجود ہو تو اس کو لازماً علمی بحث کے لیے پیش کیا جانا چاہیے۔ بصورتِ دیگر اس طرح کی گفتگو کچھ یوں معلوم ہوگی جیسے کہا جائے کہ درختوں سے پتے کششِ ثقل سے نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے گرتے ہیں لیکن ہم ابھی وہ وجہ جانتے نہیں ہیں۔

8. اسے کوئی عرب، غیر عرب یا خود محمد ﷺ تخلیق نہیں کر سکتے۔

یہ سمجھنے کے لیے قرآن کا ممکنہ مصنف کون ہو سکتا ہے، ہم اس مضمون کے بقیہ حصے میں تین خیالات کا تجزیہ کریں گے۔

کیا کسی عرب نے قرآن تصنیف کیا؟

چند اہم وجوہات ایسی ہیں کہ جن کی بنا پر یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کسی عرب کی تخلیق ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ انہیں زبان دانی پر وہ دسترس حاصل تھی جو کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکی، اس کے باوجود وہ قرآن کے چیلنج کا جواب نہ دے سکے اور اس زمانے کے چوٹی کے ماہرین نے تصدیق کی کہ قرآن کے کمالات کی نقل ممکن نہیں۔ اس دور کے ایک اعلیٰ پائے کے صاحب زبان، ولید ابن المغیرہ نے کہا

'تو میرے پاس کہنے کے لیے کیا تھا؟ خدا کی قسم تم میں سے کوئی مجھ سے بہتر شاعری کو نہیں سمجھتا، اور نہ تم میں سے کوئی شعر کہنے یا بلاغت میں میرا مقابلہ کر سکتا ہے، حتٰی کہ جنات کی شاعری میں بھی نہیں۔ اور اس پر میں قسمیہ کہہ رہا ہوں کہ محمد ﷺ کا کلام (یعنی قرآن) ان سب سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا جنہیں میں جانتا ہوں اور خدا کی قسم جو وہ کہتا ہے وہ بے حد لطیف ہے، اور وہ دل آویزی اور حسن سے مزیّن ہے۔(64)

دوسری قابلِ ذکر وجہ یہ ہے کہ ساتویں صدی کے مشرکینِ عرب نے ابتداء میں محمد ﷺ پر شاعر ہونے کا الزام لگایا۔ یہ مسلمانوں سے جھگڑنے اور جنگ کرنے سے کہیں آسان تھا۔ لیکن کسی بھی ایسے شخص کو جو عربی زبان اور شاعری میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہو، کو لازم تھا کہ وہ کئی سالوں تک شعراء سے تربیت لے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی یہ دعوی نہیں کر سکا کہ محمد ﷺ نے اس سے شاعری کی تربیت لی۔ محمد ﷺ کا اپنے پیغام کی کامیابی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے شاعروں اور ادیبوں سے یہ منوانے میں کامیاب رہے کہ قرآن درحقیقت ایک مافوق الفطرت شئے ہے۔ اگر قرآن کی نقل ممکن ہوتی، تو کوئی بھی شاعر یا ادیب قرآن کے اسلوب جیسی یا اس سے بہتر کوئی چیز بنا لاتا۔ علومِ اسلامی کے ماہر نوید کرمانی اس نقطے کو بالکل واضح کر دیتے ہیں۔ ''یہ بالکل ظاہر ہے کہ پیغمبر محمد ﷺ نے اس مقابلے میں شاعروں کو شکست دی، ورنہ اسلام جنگل کی آگ کی طرح اس قدر تیزی سے نہ پھیلا پاتا''۔([65])

اس سے بھی زیادہ بنیادی نوعیت کا سوال یہ ہے کہ قرآن پیغمبر محمد ﷺ پر ان کی پوری زندگی اترتا رہا، اگر پیغمبر محمد ﷺ کو چھوڑ کر یہ کسی عرب نے تخلیق کیا ہوتا تو اس کو پیغمبر محمد ﷺ کے ساتھ سائے کی مانند لگے رہنا لازم تھا تاکہ وہ جہاں بھی جاتے اور جب بھی موقع کی ضرورت ہوتی، وحی جاری کر سکتے۔ کیا واقعی کوئی اس پر سنجیدگی سے یقین کر سکتا ہے کہ اس قسم کا دھوکہ وحی کے مسلسل تیئس سال تک چل سکتا تھا؟

اچھا تو آج کے عربوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کے کہ آج کے دور کا کوئی عربی بولنے والا شخص قرآن کے جیسا کلام بنا سکتا ہے۔ اس کے پسِ پشت چند وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ساتویں صدی کے عرب

قرآن کو چیلنج کرنے کی زیادہ بہتر استعداد رکھتے تھے اور چونکہ وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے اس لیے یہ گمان رکھنا کہ آج کے دور کا ایک زبان پر کمزور گرفت رکھنے والا عرب اس دور کے عربوں سے زیادہ بہتر صلاحیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے، ایک غیر منطقی خیال ہے۔ دوسرا یہ کہ جدید عربی زبان نے پرانے زمانے سے چلی آنے والی کلاسیکل عربی کے مقابلے میں دیگر زبانوں سے زیادہ اثر قبول کیا ہے اور یہ زیادہ بگاڑ کا شکار ہوئی ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا عرب جو زبان کے لحاظ سے نسبتاً غیر معیاری ماحول میں پروان چڑھا ہو، وہ ایک ایسے عرب کا ہم پلہ ہو سکے جس نے ٹھیٹھ زبان کے ماحول میں زندگی بسر کی ہو۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ گو کہ آج کے زمانے کا ایک عرب بھی قدیم عربی سیکھ سکتا ہے لیکن اس کی بیان کی صلاحیتیں کسی ایسے شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو ایسے معاشرے کا حصہ ہو جو زبان دانی کی معراج کو پہنچا ہوا تھا۔

کسی غیر عرب نے قرآن تصنیف کیا؟

قرآن کسی غیر عرب کی تصنیف نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے لہٰذا اس کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے عربی زبان کی جانکاری لازم ہے۔ قرآن خود اس بارے میں بتاتا ہے: ''اور ہم بلاشبہ جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں، 'یہ ضرور کوئی انسان ہے جو محمد ﷺ کو سکھاتا ہے'، جس شخص کی جانب یہ اشارہ کرتے ہیں اس کی زبان غیر عربی جب کہ قرآن کی زبان تو صاف عربی ہے''۔(66)

قدیم مفسر ابنِ کثیر اس آیت کے معنی یوں بیان کرتے ہیں: ''یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن اپنے بلیغ طرزِ بیان اور کمال کے مطالب کے ساتھ جو کہ اس سے قبل کسی بھی پیغمبر پر نازل ہونے والی کتابوں سے زیادہ پختہ ہے، کسی ایسے شخص سے سیکھا گیا ہو جو کہ غیر عرب ہے اور بمشکل عربی بول سکتا ہے۔ کوئی بھی شخص جو معمولی سی بھی عقل سمجھ رکھتا ہو ایسی بات نہیں کہہ سکتا''۔(67)

یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوئی غیر عرب عربی زبان سیکھ لے؟ہاں، لیکن ایسی صورت میں اسے عربی بولنے والا تصور کیا جائے گااور اس کی مثال وہی ہو گی جو ہم نے پہلی ممکنہ صورت میں بیان کی۔تاہم ایک زبان کے بولنے والے مقامی اور غیر مقامی افراد کی بول چال میں فرق ہوتے ہیں جیسا کہ عملی ادبیات اور اسی نوعیت کی دیگر بہت سی علمی تحقیقات سے ثابت ہوا۔مثال کے طور پر انگریزی زبان میں مقامی اور غیر مقامی افراد کے درمیان بامحاورہ اور لفظی گفتگو میں وثوق سے امتیاز کرنے میں فرق پائے جاتے ہیں۔انگریزی بولنے والے ایسے افراد جن کے والد یا والدہ میں سے کوئی ایک بھی بدیسی تھااور وہ جن کے دونوں والدین مقامی تھے، میں بھی فرق پایا جاتاہے۔ایسے افراد جن کے والدین میں سے کوئی ایک بدیسی تھا، کچھ امور میں ان لوگوں سے جن کے والدین مقامی تھے نسبتاً بری کارکردگی کا مظاہرہ کرتے پائے گئے ۔حتٰی کہ ایسے بدیسی انگریزی بولنے والے جو مقامی انگریزی بولنے والوں کے برابر استعداد رکھتے تھے، میں بھی چند باریک سے فرق ضرور پائے گئے۔ کینیتھ ہالٹن اسٹام(Kenneth Hyltenstam)اور نکلس ابراہامسن (Niclas Abrahamsson اپنی تحقیق" Who can become native-like in a second language? All, some, or none?""ثانوی زبانوں میں مقامی افراد کی سی استعداد کون حاصل کر سکتاہے؟سب، صرف چند افراد، یا کوئی بھی نہیں"میں یہ نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ باصلاحیت بدیسی افراد اپنی گفتگو میں کچھ غیر محسوس آثار ظاہر کر رہے ہوتے ہیں جو باریک بینی اور ایک ترتیب وار تجزیے کے بغیر نظر نہیں آپاتے۔(70)چناچہ یہ سمجھنا کہ قرآن بحیثیت یکتا و بے مثل کمالات کے حامل اور ایک ادبی شاہکار کے، کسی غیر عرب یا بدیسی شخص کی تخلیق ہو سکتاہے ایک عقل سے بعید خیال ہے۔

کیا محمد ﷺ خود اس کے مصنف ہو سکتے ہیں؟

اس سلسلے میں یہ جاننا سود مند ہو گا کہ نزولِ وحی کے زمانے میں عرب زبان دان اپنی ابتدائی تہمت کہ، محمد ﷺ شاعر بن چکے ہیں، کے بعد محمد ﷺ کو قرآن کا مصنف قرار دینا ترک کر چکے تھے۔پروفیسر مہر علی لکھتے ہیں:

''یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ قرآن کو کوئی بھی اہلِ علم شاعری کی کتاب تصور نہیں کرتا۔ اور نہ پیغمبر محمد ﷺ نے کبھی شاعری کی کوشش کی۔ یہ درحقیقت ابتدائی دور میں ایمان نہ لانے والے قریش کی جانب سے نبوت کی مخالفت میں لگایا گیا الزام تھا کہ محمد ﷺ شاعر ہو گئے ہیں۔ لیکن جلد ہی انہیں اپنے الزام کے بے فائدہ ہونے کا اندازہ ہو گیا اور انہیں اپنے مخالفانہ بیانات کو اس ناقابلِ تردید حقیقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تبدیل کرنا پڑا کہ محمد ﷺ لکھنے پڑھنے سے ناآشنا اور شاعری کے فن سے قطعی ناواقف تھے، اور اب ان کا کہنا تھا کہ محمد ﷺ کو کوئی دوسرا شخص سکھاتا ہے جو ان کے لیے پرانی گھسی پٹی کہانیاں گھڑتا ہے اور انہیں صبح و شام سناتا ہے۔(71)

اہم بات یہ ہے کہ پیغمبر محمد ﷺ کو کلام کا ماہر نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی وہ کبھی شاعری یا قافیہ بندی میں مشغول پائے گئے۔ چناچہ یہ دعویٰ کہ وہ کسی طرح ایک لسانی و ادبی شہپارہ نکال لائے عقل و سمجھ میں نہ آنے والا ہے۔ کرمانی لکھتے ہیں ''اس دن تک جب سے انہوں نے اعلانیہ قرآن کی آیات سنانا شروع کیں، انہوں نے کبھی بھی شاعری کے کٹھن فن کو نہیں پڑھا تھا۔۔۔ اسوقت تک محمد ﷺ جو کچھ تلاوت کرتے تھے وہ شاعری، کاہنوں کی قافیہ بندی یا اس دور میں پائے جانے والے دیگر الہامی منظوم کلام سے مختلف تھا۔''(72)

مشہور سکالر تقی عثمانی اسی نوعیت کے دلائل پیش کرتے ہیں: ''یہ صدا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے کہنے والا وہ شخص تھا جس نے اپنے دور کے کسی معروف شاعر یا اہلِ علم سے کبھی تعلیم حاصل نہ کی تھی، کبھی ایک شعر تک نہ پڑھا تھا اور کبھی کاہنوں کے پاس اٹھا بیٹھا نہ تھا۔ شعر کہنے کا ان سے گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، حتٰی کہ کسی دوسرے شاعر کے اشعار بھی ٹھیک سے ازبر نہ تھے۔''(73)

نا صرف یہ، بلکہ پیغمبر محمد ﷺ کی ارشاد کی گئی مستند احادیث، قرآن کے اسلوب سے ایک بالکل جدا طرز رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر دراز (Draz) قرآن اور پیغمبر محمد ﷺ کے ذاتی کلام کے فرق کے بارے میں کہتے ہیں: ''جب ہم قرآن کے اسلوب کی بات کرتے ہیں تو ہم اسے شروع تا آخر یکساں پاتے ہیں، جب کہ پیغمبر محمد ﷺ کا اپنا ذاتی طرزِ کلام بالکل

مختلف ہے۔ یہ قرآن سے کہیں بھی برابری نہیں کرتا، اس کی مثال تو بس ایسی ہے جیسے ایک انسان بلندی پر محوِ پرواز پرندوں کی برابری نہیں کر سکتا ہاں انکے ساتھ حرکت کر سکتا ہے۔ جب ہم انسانوں کے طرزِ کلام کو دیکھتے ہیں تو یہ سب ہمیں سطحِ زمین سے لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی رینگنے والا ہوتا ہے اور کوئی نسبتاً تیز چلنے والا۔ لیکن جب آپ ان میں سے تیز ترین کو لے کر اس کا موازنہ قرآن کے ساتھ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سڑک پر چلتی گاڑیوں کی رفتار کا موازنہ مدار میں گھومتے سیارے کی رفتار سے کیا جا رہا ہو۔(74)

اس سے قطع نظر، ڈاکر دراز کی اسلوب کے مختلف ہونے کی دلیل ممکن ہے شاعروں اور نثر گو فنکاروں کو سامنے رکھتے ہوئے بہت زیادہ قوی معلوم نہ ہو۔ شاعر اور نثر گو فنکار اپنی روزمرہ کی گفتگو اور اپنے فنّی کلام میں ایک طویل عرصے تک اسلوب کا واضح فرق رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے کمزور تصور کی جائے گی کہ پیغمبر محمد ﷺ نے قرآن تصنیف نہیں کیا۔ لیکن یہاں اس کے ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر محمد ﷺ اور قرآن کا لب ولہجہ بالکل یکساں، یا ملتا جلتا بھی ہوتا تو قرآن کے یکتا و بے مثل الہامی کلام ہونے کے دعویٰ کے سچ ہونے کے امکانات معدوم ہو جاتے۔

پیغمبر محمد ﷺ اپنے پیغمبرانہ مشن کی تکمیل کے دوران بہت سی آزمائشوں اور اذیتوں سے گزرے۔ مثلاً، انکے بچوں کا کم عمری میں انتقال ہو گیا، ان کی محبوب ترین اہلیہ خدیجہؓ رحلت فرما گئیں، ان کا معاشرتی بائیکاٹ کیا گیا، ان کے قریبی ساتھیوں پر تشدد کیا گیا اور بعض کو قتل کر دیا گیا، ان پر اوباش لڑکوں کے ذریعے پتھر پھینکے گئے، ان کے خلاف جنگی مہمات شروع کی گئیں، لیکن ان سب کے درمیان قرآن کا ادبی اسلوب ویسا ہی رہا جیسا کہ خدائی کلام کو زیب دیتا ہے۔ (75)قرآن میں کسی بھی مقام پر محمد ﷺ کے جذبات اور زندگی کے مدّ و جزر کی پرچھائیں نہیں ملتیں۔ نفسیاتی اور جسمانی لحاظ سے ایسا ہونا ناممکن ہے کہ وہ سب کچھ جو محمد ﷺ پر بیتا، سہا جائے، اور اسکے نتیجے میں جو جذبات پیدا ہوں ان کا کوئی اثر قرآن کے ادبی اسلوب پر ثبت نہ ہوں۔

ادبی نقطہ نظر سے، قرآن ایک لاثانی شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس کی اکثر آیات وحی کے زمانے میں پیش آنے والے کسی خاص واقعے، یا حالات سے متعلق نازل ہوئیں۔ اس کی کسی آیت میں کبھی درستگی نہیں کی گئی، اس کے باوجود ان تمام آیات کے مجموعے نے ایک ادبی شاہکار کی شکل اختیار کر لی۔ اس تفصیل کی روشنی میں، یہ دعویٰ کہ قرآن محمد ﷺ نے تصنیف کیا ہوگا بالکل بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ نابغہ روزگار شخصیات نے آج تک جتنے بھی ادبی شاہکار تخلیق کیے وہ سب رد وبدل اور کانٹ چھانٹ کے مرحلے سے گزر کر کمال کے درجے تک پہنچے۔ دوسری طرف قرآن فی البدیہہ نازل ہوا اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ (75) ایک معیاری ادبی لٹریچر بنانے کے لیے لازم ہے کہ اس میں غور وخوص کر کے تبدیلیاں کی جائیں۔ یہ کسی بھی شخص کے بس میں نہیں کہ وہ کھڑے کھڑے نہایت نفیس نوعیت کا لٹریچر تخلیق کر ڈالے۔ جب کہ قرآن درحقیقت اسی طرح نازل ہوا۔ قرآن کی متفرق آیات مختلف سیاق کے ساتھ اور مختلف مواقعوں پر نازل ہوئیں اور جب ایک دفع لوگوں کے سامنے پیغمبر علیہ السلام نے ان کی تلاوت فرمادی، تو وہ ان آیات کے ادبی معیار کو بہتر بنانے کے لیے انہیں واپس نہیں لے سکتے تھے۔

حالات وواقعات پر مبنی یہ اس بات کی ایک نہایت مضبوط دلیل ہے کہ قرآن جو کہ یکتا و بے مثل ہے، محمد ﷺ اس کے خالق نہیں ہو سکتے۔ جب ہم اس ثبوت پر اور دیگر شواہد جن کا ہم نے ذکر کیا، پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مجموعی تاثر یہ ملتا ہے کہ یہ ماننا انتہائی مشکل ہے کہ قرآن محمد ﷺ نے تصنیف کیا ہو۔

اس نکتے کو واضح کرنے کئے لیے مشہور شاعر ابوالطیب احمد ابن الحسین المتنبی الکندی کے کام کی مثال دی جاسکتی ہے۔ المتنبی ایک بامثال نابغہ اور شعرا عرب میں عظیم ترین سمجھا جاتا تھا۔ چناچہ کچھ افراد نے سمجھا کہ چونکہ اس کا کام بے مثل ہے اور وہ ایک انسان ہی تھا اس لیے ثابت ہوا کہ قرآن بھی کسی انسان کی ہی تصنیف ہے۔ لیکن یہ دلیل عقلی طور پر درست نہیں مانی جاسکتی کیونکہ المتنبی اپنے کلام کو سنوارتا نکھارتا رہتا تھا جب تک کہ وہ اس سے مطمئن نہ ہو جائے۔ (77) محمد ﷺ کے ساتھ ایسی کوئی صورت درپیش نہ تھی۔ وہ قرآن کی وحی تلاوت کرنے کے بعد اس میں

کوئی ردوبدل، کانٹ چھانٹ یا ترمیم نہیں کیا کرتے تھے۔اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن کسی ادب کے غیر معمولی ماہرِ فن کے کی تخلیق نہیں کیوں کہ انہیں اپنے کام پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

چناچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن کو کسی انسانی کمال، خصوصاً محمد ﷺ کی کاوش کا نتیجہ سمجھنا سراسر غلط خیال ہے۔ ایک ادبی صاحبِ کمال کو بھی اپنے کلام کو معیاری شکل دینے کے لیے ردوبدل اور ترامیم سے گزارنا پڑتا ہے۔ لیکن قرآن کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا۔ کسی بھی انسانی تخلیق کی مثل دوسری شئے تخلیق کی جاسکتی ہے، بس اولین تخلیق کا نقشہ اور درکار اسباب و وسائل موجود ہوں۔ ہم یہ ادبی صاحبانِ کمال شیکسپیئر اور المتنبّی کی مثال کے ذریعے سمجھا چکے ہیں۔ چناچہ اگر بالفرض قرآن محمد ﷺ کی تخلیق ہوتا تو اس کی نقل بنائی جاچکی ہوتی۔

اس خیال کو کہ قرآن پیغمبر محمد ﷺ کی ادبی کاوشوں سے وجود میں آیا، رد کرنے کی ایک اہم ترین دلیل انسانوں کے اظہار کی دستیاب شکلوں اور ان کو تخلیق کرنے کے اسباب و وسائل میں چھپی ہے۔ خیالات کے اظہار کی تمام انسانی کاوشوں کی نقل ممکن ہے چاہے وہ کسی صاحبِ کمال نے کی ہو یا کسی عام شخص نے کی ہوں، بس شرط یہ ہے کہ اس کا نقشہ اور اسے بنانے کے لیے مطلوب اسباب و وسائل دستیاب ہوں۔ یہ دعویٰ متعدد انسانی اظہار کی صورتوں مثلاً آرٹ، ادب، یہاں تک کہ پیچیدہ ٹکنالوجی کے لیے بھی درست ثابت کر دکھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کسی بھی فن پارے کی نقل ممکن ہے چاہے وہ کتنا ہی غیر معمولی اور حیرت انگیز حد تک منفرد سمجھا جاتا ہو۔ لیکن قرآن کے معاملے میں، ہمارے پاس اس کا مکمل نقشہ بھی موجود ہے (بصورت مصحف قرآن)، اور اس کی تخلیق میں استعمال ہونے والے وسائل بھی، یعنی چند گنے چنے حروف اور پرانے دور سے چلے آرہے گریمر کے چند قاعدے۔ اس کے باوجود کوئی اس کی بلاغت، منفرد ادبی طرز اور اسلوب کا مقابلہ نہیں کر سکا۔

9۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ معقول ترین توجیہہ یہی ہے کہ قرآن من جانب خدا ہے۔

چونکہ قرآن کا خالق کوئی عرب نہیں ہو سکتا، کوئی غیر عرب نہیں ہو سکتا، پیغمبر محمد ﷺ خود نہیں ہو سکتے، لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سب سے معقول توجیہہ یہی ہے کہ قرآن خدا کی جانب سے ہے۔ یہ قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی سب سے بہتر طور پر سمجھ میں آنے والی تاویل ہے کیونکہ دستیاب معلومات کی روشنی میں دیگر ممکنہ صورتیں غیر منطقی ہیں۔ جو نتیجہ ہم نے اخذ کیا اس سے ایک اختلاف ممکن ہے، اور وہ یہ کہ اس تصور کو درست تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خدا کے وجود کے قائل ہوں، چناچہ اس سے خدا کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا سوال اٹھتا ہے۔ گو کہ اس سوال کے جواب سے ہماری اس بحث کو سمجھنا آسان ہو گا، اور اگرچہ کہ خدا کے وجود کے بارے میں کوئی رائے قائم کیے بنا بھی ہمارا نظریہ اپنی جگہ مستحکم ہے، تاہم واضح رہے کہ ہم نے اسے خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے حضرات ہی کے لیے پیش کیا ہے۔ ویسے بھی خدا کا وجود ثابت کرنا کوئی دشوار نہیں اس کتاب میں شروع سے لے کر آخر تک خدا کے وجود کے اثبات کے لیے ایک مدلل بحث پیش کی گئی ہے۔

اس کے برعکس، یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے وجود پر ایمان رکھنا اس بحث کو سمجھنے کی شرط نہیں بلکہ قرآن کا یکتا و بے مثل ہونا خود خدا کے وجود کی نشانی ہے۔ اگر ایک انسان (عرب، غیر عرب، پیغمبر محمد ﷺ) قرآن تخلیق نہیں کر سکتے تھے، اور تمام ممکنہ صورتیں بھی ہم کھنگال چکے، تو آخر وہ کونسی ہستی ہے جس نے اسے تخلیق کیا۔ ایسی ہستی کہ جس کے پاس انسانی تاریخ کے کسی بھی مصنف سے بہتر ادبی صلاحیتیں ہیں۔ اس سوال کا فطری نتیجہ ایک ایسی ذات کا تصور ہے جو کسی بھی انسان سے اعلیٰ درجے کی ادبی استعداد رکھتی ہو، اور یہی دراصل خدا کا تصور ہے۔ خدا در حقیقت عظیم تر ہے۔ چناچہ قرآن کا یکتا و بے مثل ہونا خدا کے وجود کی منطقی بنیاد فراہم کرتی ہے، یا کم از کم ادراک سے بالاتر کسی ہستی کا پتا دیتا ہے۔

سائنسدانوں نے بھی اسی نوعیت کے استدلال کو قبول کیا ہے۔ ہگز باسن (ب) کی حالیہ دریافت کی مثال لے لیجیے۔ ہگز باسن کا ذرّہ ہگز کا دائرہ اثر ((Higgs field نا تا ہے۔ یہ دائرہ اثر کائنات کی تخلیق کے آغاز میں وجود میں آیا اور اس سے ذرّات میں کمیّت پیدا ہوئی۔ جب یہ ذرّہ دریافت نہیں ہوا تھا اس وقت بھی اسے اس امر کی معقول ترین تاویل سمجھ کر قبول کیا جاتا تھا کہ کائنات کی تخلیق کی ابتدا میں ذرّات کی حالت میں ایسی تبدیلی رونما ہوئی کہ جس سے کمیّت نہ رکھنے

والے ذرّات میں کمیّت پیدا ہو گئی (فوٹون ایک استثنا ہیں)۔ چناچہ دستیاب حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہگز باسن سب سے زیادہ سمجھ میں آنے والا تصور تھا باوجود اس کے کہ مشاہدے سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ اسی استدلال کو اب قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے پر استعمال کریں تو واضح ہو گا کہ اس کے منفرد ادبی اور کلامی کمالات کی سب سے بہتر طور پر سمجھ میں آنے والی تاویل اس کا من جانب خدا ہونا ہے۔ دیگر تمام تاویلیں عقل کو مطمئن کرنے میں ناکام ہیں، اور دستیاب معلومات اور حقائق کی سب سے معقول تاویل خدا کا وجود ہی ہے۔

☆ دیگر متبادل تاویلات

قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی متبادل تاویلوں میں سے یہ بھی سوچی جا سکتی ہیں کہ شاید یہ کسی دوسری زیادہ باصلاحیت مخلوق کی جانب سے ہو۔ یا شیطان نے اسے تخلیق کیا ہو۔ لیکن یہ متبادل صورتیں غیر حقیقی ہیں اور اسی وجہ سے ہم نے انہیں اس مضمون کے مرکزی موضوع میں شامل نہیں کیا۔ پھر بھی یہاں ان کا جواب دینے سے واضح ہو جائے گا کہ اصل مضمون میں ہم ان پر بات کیوں نہیں کی۔

یہ نظریہ وضع کرنا کہ قرآن کسی برتر مخلوق کی طرف سے ہے دراصل خدا ہی کے وجود کے اقرار کے ہم معنی ہے۔ کسی ''برتر مخلوق'' سے کیا مراد ہوتی ہے؟ کیا ''برتر مخلوق'' کے وجود کی سب سے بہتر توجیہہ خدا کا تصور خود نہیں؟ اگر برتر مخلوق سے مراد کوئی ایسی ہستی ہوتی ہے جو انسانوں سے کہیں بہتر کلام کی قوت، استعداد اور صلاحیت رکھتی ہو تو خدا سے بہتر اس تعریف پر کون پورا اترتا ہے؟ اس کتاب (دی ڈیوائن ریلاٹی) میں خدا کے وجود کے بالکل علیحدہ ثبوت پیش کیے گئے ہیں اور یہ بالکل ممکن ہے کہ خدا ہم سے کلام کرنا چاہتا ہو۔ یہ اس حقیقت سے واضح ہوتا ہے کہ خدا نے نا صرف ہماری اس کائنات کو وجود بخشا اور اسے شکل دی، بلکہ اس میں ہماری بقا کے لیے تمام اسباب بھی مہیا کیے۔ مزید یہ کہ اس نے ہمیں روح اور شعور عطا کیا اور ہم میں اخلاقیات کی حس بھی پیدا کی۔

صاف نظر آتا ہے کہ ہماری بقا اور ہمارے پھلنے پھولنے میں خدا کی واضح چاہت شامل ہے۔ یہاں تک کہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ ہم سے وحی کی صورت میں کلام کرنا چاہتا ہو۔ اس لیے جب ہم دیکھتے ہیں قرآن جو کہ خدا کا کلام ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور ایسی خاصیتیں رکھتا ہے جو خدائی افعال کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں تو خدا کی ذات کو قرآن کا مصنف تسلیم کرنا عین عقل کا تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ قرآن کسی نامعلوم برتر ہستی نے کسی نامعلوم وجہ سے نازل کیا ہے ایسا ہی ہے جیسے آپ کو جب بھی کچھ ثابت کرنا ہو تو آپ کسی بھی نامعلوم ہستی کا وجود گھڑ لیں۔

خدا کے وجود کے قائل افراد اس امکان پر بھی بات کرتے ہیں کہ آیا قرآن کسی شیطان کی تخلیق ہو سکتا ہے؟ ہمارے خیال میں یہ صورت بالکل لغو ہے۔ قرآن کسی شیطان یا کسی روح کی تخلیق نہیں ہو سکتا کیونکہ شیطان اور روح تو وہ تصورات ہیں جو قرآن اور وحی نے متعارف کرائے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ قرآن کسی شیطان کی جانب سے ہے تو اسے پہلے شیطان کو ثابت کرنا پڑے گا اور اسکے لیے لامحالہ وحی کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔

جب قرآن کو بطور وحی شیطان کے ثبوت کے لیے پیش کیا جائے گا تو یہ قرآن کو الہامی کلام تسلیم کرنے کے مترادف ہو گا کیونکہ شیطان کے وجود پر یقین رکھنے سے قبل یہ تسلیم کیا جائے گا کہ قرآن الہامی کتاب ہے اور اس سے یہ اعتراض از خود اپنے داخلی تضاد کا شکار ہو جائے گا۔ اگر تو جس وحی سے شیطان کا وجود ثابت کیا جا رہا ہو اس کا بائبل میں پائے جانے کا دعویٰ کیا جا رہا ہو، تو شیطان پر یقین کرنے کے لیے ضروری ہو گا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ وہ وحی واقعی بائبل میں موجود تھی۔ بائبل کے تاریخی طور پر مستند ہونے اور اس کے متن کی درستگی پر کی گئی موجودہ دور کی تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ ایسا ثابت کرنا ممکن نہیں۔(79) مزید یہ کہ قرآن کے متن پر غور کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی شیطان کی تعلیمات نہیں کیونکہ قرآن شیطان کی مذمت کرتا ہے اور اور ایسی اخلاقیات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو شیطان کے بارے میں ہمارے تصورات سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ ان سب سے قطع نظر، شیطان کو الزام دینا ہمارے علمی طرزِ عمل سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ ہم کسی بھی معاملے کو شیطان کی کارستانی قرار دے کر جان چھڑا سکتے ہیں، یہ کسی مسئلے پر علمی بحث سے فرار ہونا ہے۔

☆حاصلِ بحث

اس مضمون میں ہم نے ''گواہی'' اور ''تاویل'' کی مدد سے قرآن کے اسلوب کے الہامی ہونے کے دلائل پیش کیے ہیں ۔ ''گواہی'' کے اہم اور کلیدی کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ تاویل کی مدد سے کسی حقیقت کے بارے میں سب سے بہتر طور پر سمجھ میں آنے والی ممکنہ صورت پر یقین کرنا عقل کی رو سے ایک درست طرزِ عمل ہے۔ قرآن کا یکتا و بے مثل ہونا گواہی کی مدد سے ثابت ہے۔ عرب زبان دان اور ماہرینِ ادب نے قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی تصدیق کی ہے، اور گواہی کے ذریعے سے اس بارے میں ان کے جو اقوال ہم تک پہنچے ہیں وہ قابلِ بھروسہ ہیں کیونکہ سیاق و سباق سے متعلق دستیاب معلومات بھی ان کی تصدیق کرتی ہیں۔

جن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے دنیا کو اپنے کلامی اور ادبی شاہکار کے مقابلے کے لیے سوچ سمجھ کر للکارا، اور ساتویں صدی کے عرب اس میدان میں قرآن کا مقابلہ کرنے کی سب سے بہتر استعداد رکھتے تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ وہ قرآن کے جیسا منفرد متن، اور ادبی اسلوب پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ اور چونکہ سابقہ احوال کی مستند معلومات کی روشنی میں قرآن کے یکتا و بے مثل ہونے کی گواہی کو معتبر تسلیم کرنا ایک معقول رویّہ ہے لہٰذا اس کے بعد ہم قرآن کے منفرد کلامی و ادبی کمالات کی ممکنہ صورتوں پر غور کیا یعنی قرآن کو یا تو کسی عرب نے، یا کسی غیر عرب نے یا پھر پیغمبر محمد ﷺ نے یا خدا کی ذات نے تخلیق کیا۔ لیکن جو معلومات دستیاب ہیں انکی روشنی میں قرآن کو کسی عرب، غیر عرب یا محمد ﷺ کی تخلیق کرنا عقل سے بالاتر ہے اس لیے سب سے معقول توجیہہ یہ ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے۔ جو نتیجہ ہم نے اس مضمون میں اخذ کیا ہے اسے رد کرنا ایسا ہی ہے جیسے اس حقیقت کو رد کیا جائے کہ دنیا گول ہے یا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مستند ماہرِ طب کی رائے کو جھٹلا دیا جائے۔ دینا کی گول ساخت کا علم ہم میں سے بیشتر افراد تک کسی

دوسرے فرد کی گواہی کے ذریعے ہی پہنچا ہے، اور کسی تربیت یافتہ طب کے ماہر کی رائے صورتحال کی معقول ترین توجیہہ پر مشتمل ہوتی ہے۔

ہمارے اس دعوے کے جواب میں شاید فوری طور پر کہا جائے کہ دنیا کے گول ہونے اور طبّی تشخیص پر اعتبار کرنا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہمارے علم میں جو دیگر معلومات ہیں یہ حقائق ان سے مناسبت رکھتے ہیں اور یہ کوئی ایسے غیر معمولی خیالات پر اعتبار کرنے کا تقاضہ نہیں کرتے جیسے کسی مافوق الفطرت ہستی پر ایمان لانا۔ یہ ایک عام طور پر پایا جانے والا خیال ہے لیکن اس میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ نیچری فلسفے کو پہلے سے ٹھیک قبول کیے ہوئے ہے۔ اس طرز کے خدشات کے پیچھے یہ اعتقاد چھپا ہوتا ہے کہ کوئی فوق الفطرت شئے اپنا وجود نہیں رکھتی اور یہ کہ کائنات میں جاری ہر عمل کو مادی اسباب کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ غیر محتاط اور مفروضوں پر مشتمل نقطہ نظر بالکل بے معنی اور فکر و تدبر کے فلسفے، زبانوں کے وجود میں آنے اور پروان چڑھنے، خارجی اخلاقی حقیقتوں اور کائناتی علوم سے متصادم ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم اس مضمون میں کسی مافوق الفطرت وجود کا تصور پیش نہیں کر رہے، ہم نے تو پہلے ہی دیگر شائع ہونے شواہد کی روشنی میں خدا کا وجود ثابت کر دیا ہے۔(80) ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اس ہستی کا وجود کہ جسے ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں، بہت سی حقیقتوں کی درست توجیہہ پیش کرتا ہے۔

اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے ہم کہنا چاہیں گے کہ اگر کوئی کھلے دل و دماغ کے ساتھ، اور ذہن کو دنیا کے بارے میں فرض کیے گئے جامد تصورات کی بندشوں سے آزاد کر کے ہمارے دلائل کا مطالعہ کرے گا، تو وہ ضرور اس دانشمندانہ نتیجے پر پہنچے گا کہ قرآن منجانب خدا ہے۔ تاہم، قرآن سے متعلق جو بھی کہا یا لکھا جائے وہ اس کے الفاظ اور انکے مطالب کے بیان اور ان پر تحقیق کے لیے ہمیشہ ناکافی رہے گا۔ ''اے محمد ﷺ کہو اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے''(81)

تحریر حمزہ اینڈرئیس،، دی ڈیوائن ریلٹی، ترجمہ علی حارث

حوالہ جات:

McMyler, B. (2011) Testimony, Truth and Authority. New [1] York: Oxford University Press, p. 3.

Lackey, J. (2006) Introduction. In: Lackey, J. and Sosa, E. [2] (ed.). The Epistemology of Testimony. Oxford: Oxford University Press, p. 2.

McMyler, B. (2011) Testimony, Truth and Authority, p 10.[3]

Coady, C. A. (1992) Testimony: A Philosophical Study. [4] Oxford: Oxford University Press, p. 82.

iERA (2013) Lawrence Krauss vs Hamza Tzortzis – Islam vs [5] atheism debate. Available at: http://www.youtube.com/watch?v=uSwJuOPG4FI#t=7247 [Accessed 2nd October 2016].

Hume, D. (1902). An Enquiry Concerning Human [6] Understanding, section 88. Available at: http://www.gutenberg.org/files/9662/9662-h/9662-h.htm [Accessed 4th October 2016].

Fricker, E. (2006) Testimony and Epistemic Autonomy. In: [7] Jennifer Lackey, J and Sosa, E, ed, The Epistemology of Testimony. Oxford: Oxford University Press, p. 244.

Lehrer, K. (2006). Testimony and Trustworthiness. In: [8] Jennifer Lackey, J and Sosa, E, ed, The Epistemology of Testimony, p.145.

Ibid, p.149.[9]

Ibid, p.150.[10]

Ibid.[11]

Ibid.[12]

Ibid, p.151.[13]

Ibid, p.156.[14]

Ibid, pp. 156-157.[15]

McMyler, B. (2011) Testimony, Truth and Authority, p 66.[16]

Ibid, p 69.[17]

Hume, D. (1902) An Enquiry Concerning Human [18] Understanding, section 91. Available at: http://www.gutenberg.org/files/9662/9662-h/9662-h.htm [Accessed 4th October 2016].

Ibid, section 99.[19]

Lipton, P. (2004) Inference to the Best Explanation. 2nd ed. [20] Abingdon: Routledge, p.56.

Ibid, pp. 64-65.[21]

Harman, G. (1965) The Inference to the Best Explanation. [22] The Philosophical Review, 74(1), 88-95. Also available at: http://people.hss.caltech.edu/~franz/Knowledge%20and%20Reality/PDFs/Gilbert%20H.%20Harman%20-%20The%20Inference%20to%20the%20Best%20Explanation.pdf [Accessed 4th October 2016].

The Qur'an, Chapter 96, Verse 1.[23]

The Magnificent Qur'an: A Unique History of Preservation. [24] (2010). London: Exhibition Islam, pp. 145-204.

Al-Suyuṭi. J. (2005) Al-Itqan fi 'Ulum al-Qur'an. Madina: [25] Mujamma Malik Fahad, p. 1875.

Shafi, M. (2005) Ma'riful Qur'an. 2nd Edition. Translated by [26] Muhammad Jasan Askari and Muhamad Shamim. Karachi: Maktaba-e-Darul-Uloom. Vol 1, pp. 139-149.

Usmani, M. T. (2000) An Approach to the Quranic Sciences. [27] Translated by Dr. Mohammad Swaleh Siddiqui. Revised and Edited by Rafiq Abdur Rehman. Karachi: Darul Ishaat, p. 260.

Cited in Irwin, R. (1999) The Penguin Anthology of [28] Classical Arabic Literature. London: Penguin Books, p. 2.

Ibn Khaldun, A. The Muqaddimah. Translated by Franz [29] Rosenthal. Chapter 6, Section 58. Available at: http://www.muslimphilosophy.com/ik/Muqaddimah/Chapter6/Ch_6_58.htm [Accessed 9th October 2016].

Ibn Rasheeq, A. H. (2000) Al-'Umda fee Sina'atu al-Sh'iar wa Naqdihi. Edited by Dr. Al-Nabwi Sha'lan. Cairo: Maktabu al-Khaniji, p. 89. [30]

Al-Qutaybah, A. (1925) 'Uyun al-Akhbar. Beirut: Dar al-Kutub al-Arabi. Vol 2, p. 185. [31]

Kermani, K. (2006) Poetry and Language. In: Rippin, A. (ed.). The Blackwell Companion to the Qur'an. Oxford: Blackwell Publishing, p. 108. [32]

Abdul-Raof, H. (2003) Exploring the Qur'an. Dundee: Al-Makhtoum Institute Academic Press, p.64. [33]

Personal interview with Professor Angelika Neuwrith in German. A copy of the recording is available on request. [34]

Islahi, A. A. (2007) Pondering Over the Qur'an: Tafsir of Surah al-Fatiha and Surah al-Baqarah. Vol 1. Translated by Mohammad Saleem Kayani. Kuala Lumpur: Islamic Book Trust, pp. 25-26. [35]

Cited in Islahi, A. A. (2007) Pondering Over the Qur'an: Tafsir of Surah al-Fatiha and Surah al-Baqarah. Vol 1, p. 26. [36]

Palmer, E. H. (tr.). (1900) The Qur'an. Part I. Oxford: Clarendon Press, p. lv. [37]

Draz, M. A. (2000) Introduction to the Qur'an. London: I. B. Tauris, p. 90. [38]

Zammit, M. R. (2002) A Comparative Lexical Study of Qur'anic Arabic. Leiden: Brill, p. 37. [39]

Waliyyullāh, S. (2014) Al-Fawz al-Kabīr fī Uṣūl at-Tafsīr. The Great Victory on Qur'ānic Hermeneutics: A Manual of the Principles and Subtleties of Qur'anic Tafsīr. Translated, Introduction and Annotated by Tahir Mahmood Kiani. London: Taha, p.160. [40]

Arberry, A. J. (1998) The Koran: Translated with an Introduction by Arthur J. Arberry. Oxford: Oxford University Press, p. x. [41]

Usmani, M. T. (2000) An Approach to the Quranic Sciences, [42] p. 262.

Al-Suyuṭi. J. (2005) Al-Itqan fi ‘Ulum al-Qur’an. Madina: [43] Mujamma Malik Fahad, p. 1881.

Ibid.[44]

Lawrence, B. (2006) The Qur’an: A Biography. London: [45] Atlantic Books, p 8.

Gibb, H. A. R. (1980) Islam: A Historical Survey. Oxford [46] University Press, p. 28.

Van Gelder, G. J. H. (2013) Classical Arabic Literature: A [47] Library of Arabic Literature Anthology. New York: New York University Press, pp. 31-33.

McAuley, D. E. (2012) Ibn `Arabi’s Mystical Poetics. [48] Oxford: Oxford University Press, p.93.

Ibid, p. 94.[49]

Cited in D. E. (2012) Ibn `Arabi's Mystical Poetics. Oxford: [50] Oxford University Press, p.94.

Bonebakker, S. A. (1984) Hatimi and his Encounter with [51] Mutanabbi: A Biographical Sketch. Oxford: North-Holland Publishing Company, p.47.

Ibid, p.15; and see Ouyang, W. (1997) Literary Criticism in [52] Medieval Arabic Islamic Culture: The Making of a Tradition. Edinburgh University Press.

Ibid, p. 44.[53]

Mabillard, A. (1999) Shakespearean sonnet basics: Iambic [54] pentameter and the English sonnet style. Available at: http://www.shakespeare-online.com/sonnets/sonnetstyle.html [Accessed 5th October 2016].

Holland, P. (2013) Shakespeare, William (1564–1616). [55] Oxford Dictionary of National Biography. Oxford University Press. Available at: http://dx.doi.org/10.1093/ref:odnb/25200 [Accessed 9th October 2016].

Cited in Abdel Haleem, M. (2005) Understanding the Qur'an: Themes & Styles. London: I. B. Tauris, p. 184. [56]

Abdul-Raof, H. (2003) Exploring the Qur'an. Dundee: Al-Maktoum Institute Academic Press; Abdul-Raof, H. (2001) Qur'an Translation: Discourse, Texture and Exegesis. Richmond, Surrey: Curzon. [57]

Abdel Haleem, M. (2005) Understanding the Qur'an: Themes & Styles, p. 185. [58]

Ibid, p. 188. [59]

Chowdhury, S. Z. (2010) Introducing Arabic Rhetoric. Updated Edition. London: Ad-Duha, p. 99. [60]

Ibid. [61]

The Qur'an, Chapter 108, Verses 1 to 3. [62]

Robinson, N. (2003) Discovering The Qur'an: A Contemporary Approach to a Veiled Text, 2nd Edition. Washington: Georgetown University Press, p. 254. [63]

Cited in Qadhi, Y. (1999) An Introduction to the Sciences of [64] the Qur'an. Birmingham: Al-Hidaayah, p. 269. The original translation has been amended; the name Allah has been replaced with God.

Kermani, K. (2006) Poetry and Language. In: Rippin, A. [65] (ed.). The Blackwell Companion to the Qur'an. Oxford: Blackwell Publishing, p. 110.

The Qur'an, Chapter 16, Verse 103.[66]

Ibn Kathir, I. (1999) Tafsir al-Qur'an al-'Atheem. Vol 4, p. [67] 603.

Vanlancker–Sidtis, D. (2003) Auditory recognition of [68] idioms by native and nonnative speakers of English: It takes one to know one. Applied Psycholinguistics 24, 45–57.

Ibid.[69]

Hyltenstam, K. and Abrahamsson, N. (2000), Who can [70] become native-like in a second language? All, some, or none? Studia Linguistica, 54: 150–166. doi: 10.1111/1467-9582.00056.

Ali, M. M. (2004) The Qur'an and the Orientalists. Ipswich: [71] Jam'iyat Iḥyaa' Minhaaj Al-Sunnah, p. 14.

Kermani, K. (2006) Poetry and Language, p. 108.[72]

Usmani, M. T. (2000) An Approach to the Quranic Sciences, [73] p. 261.

Draz, M. A. (2001) The Qur'an: An Eternal Challenge. [74] Translated and Edited by Adil Salahi. Leicester: The Islamic Foundation, p. 83.

Lings, M. (1983) Muhammad: his life based on the earliest [75] sources. 2nd Revised Edition. Cambridge: The Islamic Texts Society, pp. 53-79.

Islamic Awareness (no date) The text of the Qur'an. [76] Available at: http://www.islamic-awareness.org/Quran/Text/ [Accessed 1st October 2016].

Arberry, A. J. (1967) Poems of Al-Mutanabbi. Cambridge: [77] Cambridge University Press, pp. 1-18.

For example these can include reproductions of Picasso's art. [78] Available at: http://www.sohoart.co/artist/Pablo-Picasso.html [Accessed 6th October 2016].

See Textual Integrity of the Bible. Available at: [79] http://www.islamic-awareness.org/Bible/Text/ [Accessed 7th October 2016].

Tzortzis, H. (2016) The Divine Reality: God, Islam & The [80] Mirage of Atheism. California, San Clemente: FB Publishing.

The Qur'an, Chapter 18, Verse 109.[81]

خدا کے بغیر زندگی—الحاد کے اثرات

زندگی محض کھیل ہے—ایک مایوس کن اور غیر اطمینان بخش تصور دنیا

الحاد محض ایک عقلی نقطہ نظر کا نام ہی نہیں، اگر اس کے دعوے کو سچ مان لیا جائے تو ہمیں چند بہت ہی ناگزیر لیکن مایوس کن وجودی نظریات کو ماننا پڑے گا۔ زندگی کے متعلق الحادی نظریہ یہ کہتا ہے کہ یہ صرف کھیل ہے۔ ہماری ایک ہی زندگی ہے اور ہمیں اس کا بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ جب آپ ایک کھیل کھیلتے ہیں تو آپ یا جیتتے ہیں یا ہار جاتے ہیں، اور اس کے بعد آپ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور پھر کھیل ختم!! لیکن کیا واقعی زندگی محض ایک کھیل ہے؟ ہماری یہ تحریر اس بات کو فوکس کرے گی کہ زندگی کو محض ایک کھیل قرار دینے کے نظریے کے وجودی مضمرات کیا ہیں، خدا کو اور خدا کے بنائے کسی احتسابی نظام کو نظر انداز کرنا یا اس کا یکسر انکار کر دینا کس طرح وجودی بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔ خدائی مقصد اور نظامِ احتساب کو انکار کرنا کیسے ایک آخری اور قطعی امید اور سچی طمانیت کی ضد ہے (اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں یہاں آتی ہیں لیکن مجھے الفاظ کی حد میں رہنا ہے)۔ یہ نتائج کوئی دقیانوسی مذہبی نعرے نہیں، بلکہ یہ اس نظریۂ حیات پر عقلی دلائل سے سوچے جانے کے بعد کے حاصل شدہ نتائج ہیں۔

کوئی امید نہیں:

کسی واقعے کے واقع ہونے کی خواہش یا احساس اور توقع کو امید کہا جاتا ہے۔ ہم سب اچھی زندگی، اچھی صحت اور اچھی ملازمت کی امید رکھتے ہیں۔ سب کچھ پا کر بھی ہم سب لافانی اور مسرت زدہ وجود چاہتے ہیں۔ زندگی ایک ایسا خوبصورت تحفہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس شعوری وجود کا خاتمہ نہیں چاہتا۔ اسی طرح ہر کوئی چاہتا ہے کہ ایک حتمی انصاف ہو جس سے سب بُرائیوں کو ٹھیک کیا جائے اور ایسے افراد کا احتساب کیا جا سکے۔ یہ بات نمایاں طور پر قابل ذکر ہے کہ اگر ہماری زندگیاں خستہ حال رہیں اور ہم دکھ اور تکالیف سہتے رہیں تو ہم امن، مسرت اور آسانی کی امید لگا

لیتے ہیں۔ یہ انسانی جذبے کا اظہار ہے؛ ہم ایک اندھیری سرنگ کے دوسری جانب روشنی کی امید کرتے ہیں، اور اگر ہم پُرسکون اور خوش جی رہے ہوں تو ہماری خواہش ہوتی ہے کہ زندگی اسی طرز پر چلتی رہے۔

یہ نظریہ کہ زندگی محض ایک کھیل ہے، خُدائی احتسابی عمل کا انکار کرتا ہے، یہ نظریہ حیات بعد از موت یا موت کے بعد کی زندگی کا بھی منکر ہے۔ اب جبکہ اس خدائی احتساب کے یقین کے بغیر زندگی میں سکھ اور مصیبت کاٹنے کے بعد مسرت کی بھی کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی اس لیئے اس زندگی کے خاتمہ کے بعد کسی مثبت واقعے کی توقع بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس نظریے کے ساتھ ہم اپنے وجود کی اندھیری سرنگ کے دوسری طرف روشنی کی امید بھی نہیں رکھ سکتے۔ ذرا تصور کریں کہ آپ ایک غریب ملک میں پیدا ہوتے ہیں اور ساری زندگی غربت اور بھوک افلاس میں گذار دیں۔ اس نظریے کے مطابق آپ کی قسمت میں صرف اسی کسمپرسی کی حالت میں ختم ہو جانا لکھا ہے۔۔! اب اس کا اسلامی تصور سے موازنہ کریں۔ ہماری زندگیوں میں جو بھی اچھے برے حالات آتے ہیں ان میں ہمارا امتحان ہوتا ہے، وہ ایک بڑے فائدے کے لیئے آتے ہیں۔ اس طرح وسیع النظری میں کوئی بھی دکھ یا تکلیف بلا وجہ پیش نہیں آتی۔ خُدا ہمارے نامساعد حالات سے باخبر ہے، اور وہ ان کا اجر اور ہمارے غم سے نجات ضرور دے گا۔

تاہم زندگی کو کھیل سمجھنے والے نظریے کے مطابق ہماری خوشیاں بھی بے معنی ہیں اور ہمارے دکھ درد بھی۔ نیکو کار لوگوں کی عظیم قربانیاں اور پریشانیوں کے شکار لوگ بس گرتے مجسمے ہیں جن کی دنیا کو کوئی پرواہ نہیں۔ انکا نا کوئی عظیم مقصد ہے اور نا کوئی فائدہ۔ موت کے بعد کسی زندگی کی حتمی امید ہے اور نہ کسی خوشی کا تصور۔ حتی کہ اگر ہم خوش باش اور لگژری سے بھری زندگی گزاریں تو ہم میں سے زیادہ تر لوگ ناگزیر طور پر کسی نہ کسی بُرائی یا لا متناہی خواہشوں کے حصول کی دوڑ کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ قنوئیت پسند فلاسفر ARTHUR SCHOPENHAUER نے کمال ہوشیاری سے اس ناامیدی اور بد قسمتی کا ذکر کیا ہے، جو ہماری منتظر ہے:

''ہم کھیت میں موجود ان بھیڑوں کی طرح ہیں جو بڑے مزے سے اپنے آپ میں مگن تو ہوتی ہیں لیکن قصائی کی نظروں کے عین سامنے رہتی ہیں۔ قصائی ان کو یکے بعد دیگرے اپنے شکار کے طور پر چُنتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بھی اچھے وقتوں میں اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ قسمت ہمارے لیئے کیا کیا مصیبتیں لیئے تاک میں بیٹھی ہے۔ بیماری، غربت، چیر پھاڑ، نظریا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا کھو جانا۔ ہستی کی اذّیت کا بڑا حصہ اسی میں موجود ہے، جو وقت مسلسل ہمارے اوپر مسلط کر رہا ہے، اور ہمیں سانس لینے کا بھی موقع نہیں دیتا، بلکہ ہمیشہ ایک سرکوب کی طرح ایک کوڑا لیئے ہمارے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اگر کبھی وقت اپنا ہاتھ روکتا ہے تو وہ صرف اس وقت جب ہمیں بوریت کے کرب کے حوالے کیا جاتا ہے۔ در حقیقت یہ رائے کہ اس دنیا اور انسان کو موجود ہی نہیں ہونا چاہیئے، ہمارے اندر ایک دوسرے کے لیئے برداشت پیدا کرتی ہے۔ بلکہ نہیں، اس نظریے کے تحت ہمیں ایک دوسرے کو جناب، سَر یا جنابِ عالی کے بجائے مظلوم ساتھی کہہ کر مخاطب کرنا چاہیئے۔''(2)

قرآن اس ناامیدی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ مسلمان کبھی مایوس نہیں ہو سکتا، امید ہمیشہ قائم رہتی ہے جو کہ خُدا کی رحمت سے پیوستہ ہے۔ اور خُدا کی رحمت اس دنیا اور اگلے جہان دونوں میں لازماً ظہور پذیر ہو گی۔(3)

زندگی کو ایک کھیل قرار دینے والے نظریے کے تحت عدل و انصاف ایک ناقابلِ حصول چیز ہے، زندگی کے صحرا میں ایک سراب کی مانند۔ کیونکہ آخرت کی زندگی کے نظریہ کو نظر انداز یا انکار کیا جاتا ہے اس لیئے ایسی کوئی توقع رکھنا بیکار ہے کہ لوگوں کو کسی احتسابی عمل کا سامنا ہو گا۔ آپ ۱۹۴۰ کے جرمن نازیوں کی مثال لے لیں۔ ایک معصوم یہودی عورت جو اپنی باری پر گیس چیمبر میں ڈالے جانے کی منتظر ہے، جس نے ابھی اپنے شوہر اور بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا، اس کو اس زندگی کے اختتام پر کسی انصاف کی امید نہیں۔ اگرچہ بالآخر نازیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ عدل اس عورت کی موت کے بعد ہوا۔ اس مضحکہ خیز نظریۂ حیات کے تحت اس عورت کی اوقات محض مادے کی ایک نئی تشکیل سے زیادہ کچھ نہیں، اور آپ کسی بے جان چیز کو تسکین نہیں پہنچا سکتے۔

تاہم اسلام ہم سب کو بے داغ خُدائی انصاف کی امید دلاتا ہے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی، اور سب کو جواب دہ ٹھہرایا جائے گا۔

''اس دن لوگ الگ الگ جماعتوں میں آگے آئیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ جس نے ایک ذرہ برابر بھی نیکی کے ہو وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بھی بُرائی کی ہو وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔''(4)

''اللہ نے زمین اور آسمانوں کو ایک ٹھیک مقصد کے لیئے پیدا کیا۔ تاکہ وہ ہر نفس کو اس کے اعمال کا بدلہ دے۔ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی''۔(5)

زندگی کو ایک کھیل قرار دینے والا نظریہ ایسا ہی ہے جیسے ایک ماں اپنے بچے کو کھیلنے کے لیئے ایک کھلونا دے اور پھر بلا وجہ واپس لے لے! بلاشبہ زندگی ایک زبردست تحفہ ہے، تاہم اس زندگی کے دوران کوئی بھی خوشی، مسرت یا محبت ہم سے اچانک اور ہمیشہ کے لیئے لے لیا جائے گا۔۔۔! کیونکہ یہ نظریۂ حیات خُدائی اختیار اور زندگی کے بعد موت کا منکر ہے، اس کا مطلب ہے کوئی بھی خوشی جو ہمیں ملی ہمیشہ کے لیئے ختم ہو جائے گی۔ ایسی کوئی امید نہیں کہ اس زندگی میں ملنے والی خوشیاں، مسرتیں، یا محبت مرنے کے بعد بھی جاری و ساری رہ سکتی ہیں۔ اسلام کے نظریے کے تحت ایسے تمام مثبت مشاہدات کا دنیاوی زندگی سے بڑھ کر تسلسل نظر آتا ہے۔

''ان کے لیئے وہاں وہ سب ہو گا جس کی وہ آرزو کرتے ہیں، اور ہمارے پاس ان کے لیئے اس سے بھی زیادہ (نعمتیں) ہیں۔''(6)

''وہ لوگ جنہوں نے پرہیزگاری کی زندگی گزاری ان کے لیئے اچھا بدلہ ہے اور اس سے بڑھ کر ہے''(7)

''بیشک جنتی اس دن عیش میں ہوں گے؛ (ان سے کہا جائے گا) سلامتی ہو، اللہ کی طرف سے، جو نہایت شفقت کرنے والا ہے''(8)

کوئی خوشی نہیں:

خوشی کی تلاش ھم سب انسانوں کی فطرت کا ضروری جزو ھے۔ ھم سب خوش رھنا چاھتے ھیں—حالانکہ کبھی کبھی ھمیں خود بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ خوشی دراصل ہے کیا۔اسی لیے اگر آپ کسی بھی عام آدمی سے پوچھیں گے کہ وہ اچھی ملازمت کا حصول کیوں چاھتے ہیں، تو شاید ان کا جواب یہ ہو گا کہ آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے۔تاہم اگر آپ ان سے مزید سوال کریں اور پوچھیں کہ آپ ایک آرام دہ زندگی کیوں گزارنا چاہتے ہیں تو غالباً وہ یہ جواب دیں گے کہ خوش رہنے کے لیے۔ لیکن خوشی ایک مقصد ہے نا کہ ذریعہ۔ یہ منزل مقصود ہے نا کہ صرف اس طرف کیا جانے والا سفر۔ کیونکہ ہم سب خوش رہنا چاہتے ہیں اس لیے ہم ہمیشہ ایسے ذرایع کی تلاش میں رہتے ہیں جن سے ہم ہمیشگی والی خوشی حاصل کر سکیں۔

یہ سفر جس کی ہر کسی کو جستجو ہوتی ہے ہر انسان کے لیے مختلف ہوتا ہے۔اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔تاہم جو لوگ زندگی کو صرف ایک کھیل سمجھ کر گزار رہے ہوتے ہیں وہ زندگی میں راحت و لذت کے متلاشی رہتے ہیں۔اس سے ایک بہت بڑا سوال جنم لیتا ہے: حقیقی خوشی کیا ہے؟

ان سوالات کے جواب جاننے کے لیے دی گئی صورت حال کا تصور کریں: یہ تحریر پڑھتے ہوئے آپ اپنی خواہش کے بر عکس نیم مدہوش ہیں۔ اچانک آپ کی آنکھ کھلتی ہے اور آپ خود کو ایک ہوائی جہاز میں پاتے ہیں۔ آپ فرسٹ کلاس میں موجود ہیں جہاں انتہائی پُر تعیش کھانے دستیاب ہیں۔ آپ کی سیٹ ایک آرام دہ بیڈ ہے جسے انتہائی آرام دہ اور پُر تعیش سفر کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہاں آپ کی تفریح اور مہمان نوازی کا بے انتہا سامان دستیاب ہے۔ عملے کی خدمت گزاری بے مثال ہے۔ آپ ان سب نفیس اور عمدہ سہولیات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اب آپ ایک لمحے کے لئے سوچیئے اور خود سے پوچھیں کیا آپ اس وقت واقعی خوش ہوں گے؟

آپ کیسے خوش ہو سکتے ہیں؟ آپ پہلے کچھ سوالات کے جوابات جاننا چاہیں گے۔ آپ کو مدہوش کس نے کیا؟ آپ جہاز پر کیسے پہنچے؟ آپ کے اس سفر کا مقصد کیا ہے؟ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اگر ان سوالات کے جوابات نہیں ملتے تو آپ کیسے خوش ہو سکتے ہیں؟ خواہ آپ ان سب سہولیات سے لطف اندوز ہونا بھی شروع کر دیں تو بھی آپکو سچی خوشی نصیب نہیں ہو گی۔ کیا ایک کف دار بیلجیئن چاکلیٹ والی مٹھائی کی آپ کی کھانے کی ٹرے پر موجودگی سے یہ سب سوالات ختم ہو جائیں گے؟ یہ سب محض ایک فریب، ایک عارضی اور دھوکے والی خوشی ہو گی جو ان سب انتہائی اہم سوالات کو نظر انداز کرنے سے حاصل ہو گی۔

اب اس اصول کو اپنی زندگی پر لاگو کر کے دیکھیں اور خود سے پوچھیں، کیا میں خوش ہوں؟ ہمارا وجود میں آنا جہاز پر موجود ہونے اور مدہوش ہونے سے مختلف نہیں، ہم اپنی پیدائش کا، اپنے ماں باپ کا خود انتخاب نہیں کر سکتے، ہم نہیں جانتے ہم کہاں سے آئے کہاں جانا ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ یہ سوالات نہیں پوچھتے، یا ان سوالات کے جوابات تلاش نہیں کرتے جن سے ہم ایک دائمی خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔

سچی خوشی کہاں پائی جاتی ہے؟ لامحالہ طور پر اگر ہم پچھلی مثال پر غور کریں تو حقیقی مسرت ہمارے وجود کے بارے میں اہم سوالات کے جوابات میں پوشیدہ ہے۔ ایسے سوالات جیسے کہ، ''زندگی کا مقصد کیا ہے؟'' اور یہ کہ ''میں مرنے کے بعد کہاں جاؤں گا؟'' اس لحاظ سے ہماری خوشی، ہمارے اندرونی تفکر میں اور ہمارے اپنے بارے میں جاننے میں، اور ان سوالات کے جوابات کی تلاش میں پوشیدہ ہے۔

جانوروں کی جبلت کے برعکس ہم محض اپنی فطرت پر ردِ عمل ظاہر کر کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ صرف اپنے ہارمونز کی اطاعت اور دیگر جسمانی ضروریات پوری کرنے سے ہم حقیقی خوشی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کو سمجھنے کے لیئے ایک اور مثال پر غور کریں:

تصور کریں کہ آپ ان پچاس لوگوں میں سے ہیں جن کو ایک ایسے کمرے میں بند کیا گیا ہے جس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔اس کمرے میں صرف 10 روٹیاں ہیں اور اگلے 100 دن کے لئے کھانے کا کوئی اور بندوبست نہیں۔آپ کیا کریں گے ؟اگر آپ اپنی حیوانی جبلت پر عمل کریں گے تو اس کا انجام خون خرابہ ہو گا۔لیکن اگر آپ اس بات پر توجہ دیں اور سوچیں ''ہم سب کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں؟'' تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ آپ سب زندہ رہ سکتے ہیں کیونکہ آپ اس کی کوئی تدبیر کر لیں گے۔

اب اس مثال کو اپنی اس زندگی میں بھی لاگو کریں۔آپ کی زندگی میں بہت سے تغیرات وقوع پذیر ہوتے ہیں جن کا نتیجہ لاانتہا ہی صورتوں میں نکل سکتا ہے۔تاہم ہم میں سے بہت سے افراد صرف اپنی جسمانی ضروریات کی پیروی کرتے ہیں۔ ہماری ملازمت کے لئے پی ایچ ڈی یا دوسری ڈگریاں درکار ہو سکتی ہیں،اور شاید ہم اپنی زندگی میں اپنے دوستوں کے ساتھ شراب و کباب سے لطف اندوز بھی ہوتے رہیں، لیکن یہ سب صرف افزائش تک محدود ہے۔ حقیقی خوشی اسوقت تک حاصل نہیں کی جاسکتی جب تک ہم یہ نا جان لیں کہ ہم حقیقت میں کیا ہیں؟

تاہم زندگی محض ایک کھیل تماشا قرار دینے والے نظریے (الحاد) کے تحت ان سب سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ ہم یہاں کیوں ہیں؟صرف ایک کھیل تماشے کے لئے، کسی گہرے مقصد کے بغیر۔ ہم سب کہاں جا رہے ہیں؟ کہیں نہیں!! ہم ایسے ہی مر جائیں گے؛اور یہ کھیل جلد ہی ختم ہو جائے گا۔۔۔ حتیٰ کہ کچھ فلسفی حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی ایک کھیل نہیں۔مثال کے طور پر لڈوگ وٹجنسٹائن LUDWIG WITTGENSTEIN ایک جگہ کہتا ہے،''میں نہیں جانتا کہ ہم یہاں کیوں ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم یہاں عیش کرنے لئے موجود نہیں ہیں''

خُدا کی بندگی

حقیقی مسرت حاصل کرنے کے لئے ہم سب کو اس بنیادی سوال کا جواب دینے کی ضرورت ہے کہ ہماری یہاں کیوں موجودہیں۔ اسلام میں اس کا جواب بہت سادہ لیکن گہرا ہے، ہم یہاں خدا کی اطاعت و بندگی کے لیے موجود ہیں۔ ''اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا''۔(10)

لیکن اسلام میں عبادت یا بندگی کا تصور اس لفظ کے مشہورِ عام مطلب سے کافی مختلف ہے۔ عبادت ہمارے ہر ہر عمل سے عیاں ہو سکتی ہے۔ ہمارے ایک دوسرے سے روزمرہ معاملات میں بات چیت کرتے وقت، یا دوسروں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کر کے۔ اگر ہم اپنے خُدا کو اپنے اعمال سے خوش کرنے پر توجہ دیں تو ہمارے عام معمولاتِ زندگی بھی عبادت بن جائیں گے۔

اسلام میں عبادت ایک جامع تصور ہے۔ اس سے مراد ہے اللہ سے محبت، اس کی خوشنودی، اس کی معرفت، اور سب امور میں صرف اس اکیلی ذات کی تعظیم واطاعت جیسا کہ دعا والتجا کرنا۔ خُدا کی عبادت ہمارے وجود کا بنیادی اور قطعی مقصد ہے۔ یہ ہمیں تمام غلامیوں سے آزاد کرتی ہے۔ اللہ قرآن میں ہمیں ایک طاقتور مثال سے سمجھاتا ہے:

''اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے ایک غلام ہے جس میں کئی ضدی شریک ہیں اور ایک سالم ایک ہی شخص کا غلام ہے کیا دونوں کی حالت برابر ہے؟ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں سمجھتے۔''(11)

یہ بات ناگزیر ہے کہ جب ہم ایک اللہ کی عبادت نہیں کرتے، ہم دوسرے ''خُداؤں'' کی پرستش میں لگ جاتے ہیں۔ ذرا سوچیں: ہمارے کاروباری شراکت دار، افسران، اساتذہ، احباب، ہمارا معاشرہ، حتیٰ کہ ہماری خواہشات ہمیں کسی نا کسی طرح اپنا ''غلام'' بنا لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری سماجی رسوم ورواج لے لیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ خوبصورتی کی تعریف اپنے سماجی دباؤ کو مدِ نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہماری بہت سی پسند ناپسند ہوں لیکن وہ سب دوسروں کے خیالات کی پابند ہوتی ہیں۔ ذرا اپنے آپ سے پوچھیے: میں نے یہ پتلون یا یہ سکرٹ کیوں پہن رکھی ہے؟ یہ کہہ دینا کہ مجھے یہ پسند ہے بہت سطحی سا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کو یہ کیوں پسند ہے؟ اگر ہم اس طرح چھان

بین کریں تو ہم میں سے بہت سے لوگ یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ''کیونکہ دوسرے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اچھا لگتا ہے'' بد قسمتی سے ہم سب ایسے ہی بہت سے اشتہارات سے متاثر ہو جاتے ہیں جو ہمیں ہر وقت اپنا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔

اس لحاظ سے ہمارے بہت سے ''آقا'' ہیں اور وہ سب ہم سے کچھ نا کچھ چاہتے ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے سے اُلجھے رہتے ہیں۔ اور نتیجتا ہماری زندگیاں پریشان اور تشنگی سے بھری رہتی ہیں۔ اللہ جو ہمیں ہم سے بہتر جانتا ہے، جو ہماری ماؤں سے زیادہ شفیق ہے، ہمیں بتا رہا ہے کہ وہ ہمارا سچا مالک ہے۔ اور صرف اس کی عبادت و اطاعت کر کے ہم حقیقی معنوں میں آزاد ہو سکتے ہیں۔ مسلمان مصنف یاسمین موگاحد (YASMIN MOGAHED) اپنی کتاب RECLAIM YOUR HEART میں بیان کرتی ہیں کہ خدا کے علاوہ ہر شے کمزور اور ناتواں ہے، اور یہ کہ اصل آزادی خدا کی عبادت سے ہی حاصل ہوتی ہے:

''جب بھی آپ کسی کمزور اور ناتواں چیز کے پیچھے جاتے ہیں یا اس سے مدد مانگتے ہیں تو در حقیقت آپ خود کمزور ہو جاتے ہیں۔ بے شک آپ جو حاصل کرنا چاہ رہے تھے وہ مل بھی جائے تو بھی آپ کے لئے ہمیشہ ناکافی رہے گی۔ جلد ہی آپ کو کسی اور چیز کی طلب ہو جائے گی۔ آپ کو کبھی بھی حقیقی قناعت یا اطمینان نصیب نہیں ہو گا۔ اسی لیئے ہماری زندگیوں میں اشیاء کے تبادلے اور حیثیت و سہولت میں مزید سے مزید بہتری واقع ہوتے ہیں۔ آپ کا فون آپ کی کار آپ کا کمپیوٹر آپ کی بیوی آپ کا شوہر، یہ سب ہمیشہ ایک نئے اور بہتر ماڈل کے ساتھ تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم اس غلامی سے نجات کا ایک طریقہ بھی ہے۔ جب ایک ایسی چیز مل جائے جو غیر متزلزل ہو، مضبوط، ناقابل شکست اور دائمی ہو، جس پر آپ مکمل دار و مدار کر سکیں، تو آپ کبھی گر نہیں سکتے''(12)

وجودیت کے نقطہ نظر سے تنہا خدا کی بندگی حقیقی آزادی ہے۔ اگر عبادت علم و دانش، محبت اور خدا کی اطاعت سے مشروط ہے تو در حقیقت ہم میں سے بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں دوسرے خدا بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ہم

میں سے کئی افراد اپنی انا اور خواہشات سے محبت کرتے ہیں اور ان کی پیروی یا اطاعت کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں ہم ہمیشہ صحیح ہوتے ہیں، ہم کبھی غلطی پر نہیں ہو سکتے اور ہم ہمیشہ اپنی سوچ کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ہم اپنی ذات کے ہی غلام ہوتے ہیں۔ قرآن اس بے قدر روحانی حالت کی نشاندہی کرتا ہے اور ایسے شخص کو موازنہ میں جانور سے بھی بدتر قرار دیتا ہے جو اپنی خواہشات، ہوائے نفس اور ذہنی خیالات کو ہی خدا بنالیتا ہے۔

اے پیغمبر آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے سو کیا آپ اس کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ یا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں (کہ وہ بات کو نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں) بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ (13)

خود پرستی کی وجہ سے بعض اوقات ہم سماجی دباؤ، خیالات، رسم و رواج اور کلچر کو پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سب ہمارا بنیادی ریفرینس بن جاتے ہیں اور ہم ان سے محبت کا شکار ہو کر ان کے بارے میں مزید جاننے کی جستجو میں ان کی پیروی شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ آپ مادہ پرستی ہی کو لیجیئے۔ ہم پیسے اور مادی ضروریات میں مکمل گُم ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے پیسے اور اپنی ضروریات کی خواہش رکھنا ہمیشہ بری بات نہیں، تاہم ہم نے ان ضروریات کو اپنی شناخت بنالیا ہے۔ ہماری سب توانائی، وقت اور کوششیں دولت جمع کرنے میں وقف ہو چکی ہیں اور اس ہیولا ہی کامیابی کا دکھاوا ہماری زندگیوں کا بنیادی مقصد بن گیا ہے۔ اس نقطہ نظر سے مادی اشیاء ہمیں کنٹرول کرنا شروع کر دیتی ہیں جس سے خدا پرستی کے بجائے مادہ پرستی کا کلچر ہم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ میں اس سے واقف ہوں کہ ایسا ہم سب کے ساتھ نہیں ہوتا، تاہم اس طرح کی بے حساب مادہ پرستی بہت عام ہے۔

ایسا لازمی ہو گا کہ اگر ہم خدا کی اطاعت نہیں کر رہے تو کسی اور شے کی ضرور کر رہے ہیں۔ یہ ہماری اپنی انا یا خواہش بھی ہو سکتی ہے، یا پھر کچھ عارضی اور مادی مال و اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ اسلامی روایت میں خدا کی اطاعت ہماری پہچان بنتی

ہے، کیونکہ یہ ہماری فطرت کا ہی ایک جزو ہے۔ اگر ہم خدا کو بھول جائیں اور ان چیزوں کی پرستش شروع کر دیں جو اس کی مستحق نہیں ہیں تو ہم رفتہ رفتہ اپنی ذات کو ہی فراموش کر دیں گے۔

''اور ان کی طرح نہ ہوں جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا پھر اللہ نے بھی ان کو (ایسا کر دیا) کہ وہ اپنے آپ ہی کو بھول گئے یہی لوگ نافرمان ہیں''(14)

ہمارا اپنی ذات کے متعلق علم اللہ کے ساتھ ہمارے تعلق پر منحصر ہے، اور یہ تعلق ہماری بندگی اور عبادت سے بنتا ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں (ہم صرف وہی کرتے ہیں جو اللہ چاہتا) تو ہم دوسرے جھوٹے خداؤں کی پیروی اور ان کی غلامی سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ ہماری اپنی ذات کے بُت ہوں یا ان چیزوں کے جو ہماری ملکیت ہیں۔

اگلا سوال ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہمارے پاس چوائس ہے، اللہ کی دائمی، لامحدود رحمت کو قبول کر لیں یا اس سے دور بھاگ جائیں۔

اس کی رحمت کو مان کر، اس کے پیغام کا جواب دے کر، اس کی اطاعت و عبادت کر کے اور اس ہستی سے محبت کر کے ہم جنت میں ہمیشہ والی زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ جبکہ اس کا انکار اور اس کی رحمت سے دوری اس امر کو ضروری بنا دیتی ہے کہ ہم اس کی رحمت اور خوشنودی سے خالی مقام یعنی جہنم میں ڈالے جائیں۔ اس طرح ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ یا تو ہم اللہ کی رحمت کو پسند کر لیں یا اس سے دور بھاگ جائیں۔ اس بات کی ہمیں آزادی اللہ نے عطا کی ہے۔ بے شک اللہ ہمارے ساتھ بھلائی چاہتا ہے لیکن پھر بھی وہ ہمیں ٹھیک راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس زندگی میں ہماری ترجیحات ہماری اگلی زندگی کے بنانے سنوارنے کا باعث ہیں:

جب وہِ دن آئے گا تو کوئی شخص اللہ کی اجازت کے سِوا بات بھی نہ کر سکے گا سو ان میں سے بعض بد بخت ہیں اور بعض نیک بخت"۔(15)

"۔۔۔یہی لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلہ میں جنت کے بالا خانے دیے جائیں گے اور ان کا وہاں دعا اور سلام سے استقبال کیا جائے گا"۔(16)

کیونکہ ہمارا مطلقی مقصد اللہ کی عبادت کرنا ہے اس لئے ہمیں اپنا قدرتی توازن قائم کرنے کی اور اپنی ذات کو جاننے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو ہم خود کو آزاد کر کے اپنی ذات تک پہنچ پاتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہم اپنی انسانی حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں۔

"اور ان کی طرح نہ ہوں جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا پھر اللہ نے بھی ان کو (ایسا کر دیا) کہ وہ اپنے آپ ہی کو بھول گئے یہی لوگ نافرمان ہیں"(17)

خلاصہ یہ کہ زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ لینا ہمارے شعوری احساس کی حتمی اور قطعی بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ یہ نظریہ ہمارے وجود کے متعلق موجود بہت سے سوالات کے جوابات نہیں دیتا، اور اس طرح ہم حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ اس نظریے کے ساتھ واقعی خوش ہے تو میں کہوں گا کہ یہ ایک مخموری قسم کی خوشی ہے۔ ان کو ہوش اسی وقت آتا ہے جب وہ اپنی ذات کے متعلق گہرائی سے سوچنا شروع کرتے ہیں۔

، تحریر کتاب 'دی ڈیوائن ریلٹی" از حمزہ اینڈرئیس، ترجمہ محمد نعیم

حوالہ جات

THE QUR'AN, CHAPTER 44, VERSE 38[1]

ARTHUR SCHOPENHAUER, ON THE SUFFERINGS OF THE WORLD. HTTP://EN.WIKISOURCE.ORG/WIKI/ON_THE_SUFFERINGS_OF_THE_WORLD. [2]

THE QUR'AN CHAPTER 12, VERSE 87[3]

THE QUR'AN, CHAPTER 99, VERSES 6 TO 8[4]

THE QUR'AN, CHAPTER 45, VERSE 22[5]

THE QUR'AN, CHAPTER 50, VERSE 35[6]

THE QUR'AN, CHAPTER 10, VERSE 26[7]

THE QUR'AN, CHAPTER 36, VERSES 55 TO 58[8]

THE QUR'AN, CHAPTER 7, VERSE 128[9]

THE QUR'AN, CHAPTER 51, VERSE 56[10]

THE QUR'AN, CHAPTER 39, VERSE 29[11]

YASMIN MOGAHED. RECLAIM YOUR HEART. FB PUBLISHING. 2012, P. 55. [12]

THE QUR'AN, CHAPTER 25, VERSES 43 TO 44[13]

THE QUR'AN, CHAPTER 59, VERSE 19[14]

THE QUR'AN, CHAPTER 11, VERSE 105[15]

THE QUR'AN, CHAPTER 25, VERSE 75[16]

THE QUR'AN, CHAPTER 59, VERSE 19[17]

کیاسائنس نے خدا کو مسترد کر دیا ہے؟ جھوٹے الحادی مفروضوں کا تنقیدی جائزہ

تصور کیجئے کہ آپ ایک حیران کن محل میں داخل ہوتے ہیں۔ جیسے ہی آپ داخلی راستے پر چلتے ہیں اتنی بڑی عمارت دیکھ کر آپ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ قریبی دروازہ کھول کر اسے دیکھا جائے، آپ جب کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سیکڑوں کرسیاں اور میزیں ترتیب میں رکھی ہوئی ہیں جیسے کوئی کمرہء جماعت (کلاس روم) ہو. اور باقی کمروں کو دیکھنے کا شوق یک دم ختم ہو جاتا ہے، آپ محل سے نکلنے کا ارادہ کرتے ہیں اور اپنے دوست سے ملاقات کے لئے مقامی کافی شاپ کا رخ کرتے ہیں. چائے پیتے ہوئے آپ کا دوست آپ سے پوچھتا ہے ''پھر کیا دیکھا تم نے محل میں؟'' آپ جواب دیتے ہیں ''صرف ایک کمرہ جو کہ کسی کمرہء جماعت کی ترتیب میں میزوں اور کرسیوں سے بھرا ہوا تھا.'' آپ کا دوست پوچھتا ہے: ''تم نے دوسرے کمرے کیوں نہیں دیکھے؟'' آپ جواب دیتے ہیں ''اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہاں دیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں، اگر یہ کمرہ میزوں اور کرسیوں سے بھرا ہوا تھا پھر باقی کمروں میں بھی کچھ نہیں ہو گا.''

کیاآپ کاجواب معقول ہے؟ کیاآپکاجواب دلائل پر مبنی ہے؟ کہ محض ایک کمرے میں کچھ نہیں تھاتو دوسرے کمروں میں بھی کچھ نہیں ہوگا. یقیناً یہ معقول جواب نہیں ہے. ملحد جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنس نے خدا کو غلط ثابت قرار دے دیاہے 'اسی قسم کی منطق کی پیروی کرتے ہیں۔

سائنس صرف ان چیزوں پر اپنی توجہ مذکور کرتی ہیں جنہیں مشاہدات سے حل کیا جاتاہے جبکہ خداایسی ہستی ہے جو اس مادی کائنات سے ماوراہے. اسی لیے خدا کا براہِ راست مشاہدہ کرنا ناممکن ہے. کوئی ملحد شاید یہ کہے کہ بلواسطہ مشاہدہ تو خدا کے وجود کی تردید یا تصدیق کرنے میں معاون ثابت ہو سکتاہے. یہ بھی درست نہیں ہے، بلواسطہ مشاہدے کی بھی کوئی صورت خدا کے وجود کی نفی نہیں کر سکتی کیونکہ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کہا جائے کہ کوئی ایسا عمل جس کا مشاہدہ کیا گیا ہو وہ اس عمل کی نفی کرتاہے جسے دیکھا ہی نہ گیاہوں. یہ دلیل مندرج بالا بیان کردہ محل کی مثال کی طرح ہی ہے.

اس حقیقت کہ 'سائنس انکار خدا کی طرف نہیں لے جاتی' کی فلاسفہ کی اکثریت تصدیق کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر یگ گوچ(Hugh Gauch) صحیح نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''یہ اصرار کرنا کہ۔۔ سائنس الحاد پرستی کی حمایت کرتی ہے 'ایک جذباتی دعویٰ تو ہو سکتاہے مگر دلیل، منطق یا اصول پر مبنی نہیں.''(301)

یہ بات بالکل قابلِ فہم ہے کہ سوچ کا وہ طریقہء کار جو مکمل طور پر مشاہدات پر منحصر ہو، اسکا انکار نہیں کر سکتا جس کا مشاہدہ ہی نہ کیا گیا ہو۔ سائنس کیا کر سکتی ہے؟ یا اس معاملے پر خاموش رہتی ہے یا پھر ایسے ثبوت تجویز کر سکتی ہے جن کو استعمال میں لاتے ہوئے کوئی یہ نتیجہ نکال سکتا کہ خدا کا وجود ہے.

کچھ ملحد یہ کیوں سوچتے ہیں کہ سائنس خدا کا انکار کر سکتی ہے؟

سائنس نے دنیا بدل کر رکھ دی ہے۔ علمِ طب سے لیکر برقی پیغام رسانی تک ہماری زندگیوں کو جس طرح سائنس نے بہتر کیا ہے اتنا علم کے کسی اور شعبے نے نہیں کیا. سائنس مسلسل ہماری زندگی کو سنوار رہی ہے اور دنیا و کائنات کے متعلق ہماری سمجھ بوجھ اور فہم میں اضافہ کر رہی ہے. سائنس کی انہی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے کچھ ملحدین نے بے جوڑ اور غلط مفروضے قائم کر لئے ہیں. ذیل میں ان مفروضوں اک خلاصہ بیان کیا جارہا ہے؛

مفروضہ نمبر 1: بعض ملحدین یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس سچ کو جانچنے کا واحد پیمانہ ہے اور یہ بھی کہ سائنس کے پاس ہمارے تمام سوالوں کے جوابات ہیں. یہ بات الحاد پرستوں کو یہ ماننے پر راغب کرتی ہے کہ اب جن چیزوں کا ہم علم نہیں رکھتے ان کی توجیہہ کے لیے خدا کی مزید ضرورت نہیں رہی۔ یہ ایک غلط مفروضہ ہے کیونکہ سائنس کی حدود ہیں اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کے بارے میں سائنس جواب نہیں دے سکتی. مزید یہ کہ علم و آگاہی کے دیگر ذرائع بھی ہیں جنھیں سائنس ثابت کرنے سے قاصر ہے 'جبکہ وہ علم کے اہم اور بنیادی ذرائع ہیں. اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائنس حقیقت اور دنیا کے بارے میں سچ ثابت کرنے کا واحد ذریعہ نہیں ہے.

مفروضہ نمبر 2: دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ چونکہ سائنس بہت کامیاب ہے لہٰذا سائنسی نتائج ضرور درست ہونگے. یہ بات سائنس کے فلسفے [philosophy of science] کے متعلق عمومی جہالت کا پول کھولتی ہے. محض اس لئے کہ کوئی چیز کام کرتی ہے اس سے یہ ضروری نہیں کہ وہ درست بھی ہو. یہ سائنس کے فلسفے کا بہت بنیادی تصور ہے. بدقسمتی سے بعض الحاد پرستی کے بڑے دعوے دار بھی یہ بے میل اور بے جوڑ قسم کی رائے رکھتے ہیں کہ سائنسی تھیوری یا نظریئے کا کامیاب عملی استعمال یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ تھیوری یا نظریہ قطعی طور پر درست ہے۔ میں ایک مرتبہ 2010ء میں ڈبلن آئرلینڈ میں منعقدہ ملحدین کے عالمی اجتماع (ورلڈ ایتھیسٹ کنونشن) میں رچرڈ ڈاکنز سے ملا. میری ان سے مختصر سی گفتگو ہوئی، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ایک سوال کرنے والے سے یہ کیوں کہا کہ سائنس کے فلسفے کو نہ پڑھو بلکہ سائنس کو عملی طور پر اختیار کرو ["just do the science"]. انھوں نے مجھے اطمینان بخش جواب نہ دیا. ان کے عمومی کاموں کا جائزہ لینے سے اب یہ واضح ہوا کہ اسکی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ

سائنس کامیاب ہے یااس سے کام نکلتا ہے. اگرچہ یہ بات فطری ہے لیکن غلط ہے۔ یہ لازمی نہیں ہوتا کہ کسی چیز سے کام نکلتا ہے تو وہ درست بھی ہو.

کسی شے کا 'کام چلا سکنا' اور اسکا 'ٹھیک ھونا' دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں کوئی منطقی ربط نہیں۔ سائنس میں ایک نظریہ سالہاسال تک ٹھیک سمجھا جاتا رھتا ہے، سائنس دان اسے پڑھتے پڑھاتے رھتے ہیں، لیکن پھر سائنس کی دنیا میں وہ نظریہ چنداں متروک ہو جاتا ھے لیکن ماضی کے ان تمام غلط ترین حسابات و تجربات کے باوجود اسی غلط نظریئے کے تحت بے شمار ایجادات بھی ہوتی رہتی ہیں جن سے لوگوں کے 'کام چلتے رھتے ہیں'۔ تمام سائنسی علوم اس قسم کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ معلوم ھوا کہ سائنس کے ورک کرنے کیلئے اسکا ٹھیک ہونا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی کافی ((neither necessary nor sufficient، یہ بس کام چلانے کا ایک طریقہ ھے، چونکہ کام چل رہا ہے لہذا لوگوں کو یہ بھلی معلوم ہو رہی ھے، لیکن نادان لوگ اس کے 'اس کام چلانے کی صلاحیت' کو اسکے 'ٹھیک ہونے کا پیمانہ' سمجھے بیٹھے ہیں۔ سائنس میں سچائی اور حقیقت کا کتنا عنصر ہے یہ خود سائنسدانوں کو بھی معلوم نہیں ہوتا، سائنس کا اصل میدان 'تلاش حقیقت' اور 'تفہیم کائنات' نہیں، بلکہ نفس انسانی کی تسکین کیلئے 'تخلیق حقیقت' ہے۔

مفروضہ نمبر 3: تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ سائنس یقینی یا حتمی صورت [[certainty کی طرف لے جاتی ہے، جب کسی چیز پر سائنسی حقیقت [[scientific fact کا لیبل لگ جائے تو ہمیں خدا کی وحی کو بھی مسترد کر دینا چاہیے اگر وہ اسکی مخالفت کرتی ہو۔ یہ بھی درست نہیں ہے. جب سائنسدان کسی چیز کو حقیقت [[Fact کا نام دے رہے ہوتے ہیں تو وہ یہ نہیں کہہ رہے ہوتے کہ یہ بالکل حتمی یا قطعی [[absolute ہے اور اس میں کبھی ردوبدل نہیں ہوگا. بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص عمل یا مظہر کی ہمارے محدود مشاہدات پر مبنی اب تک دستیاب بہترین وضاحت ہے. تاہم نئے مشاہدات یا چیزوں کو پرکھنے کے نئے طریقے بھی سامنے آسکتے ہیں، جو کہ گذشتہ مشاہدات سے نرالے ہوں. یہی سائنس کی خوبصورتی ہے کہ یہ کوئی پتھر پر لکیر نہیں ہے. اس لئے سائنس کا اگر مقدس مذہبی کتاب سے مختلف نظر آتی ہے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، کیوں؟ کیونکہ سائنسی تفہیم بدل سکتی ہے. جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ قابل

مشاہدہ مظہر کی موجودہ سمجھ بوجھ ہی ہے جو کہ ہمارے محدود مشاہدات پر مبنی ہے اور کسی خاص مقدس کتاب سے انوکھی ہے، مگر یہ بدل سکتی ہے. یہ اس سے بہت بعید ہے کہ اسے مذہبی کتابوں کے دعووں کو توڑنے کے لیے ایک بیس بال کے بیٹ کی طرح استعمال کیا جائے. بعض بہت واضح قسم کے سائنسی حقائق تو بدلتے نہیں دکھائی دے رہے، مگر بہت سے وہ دلائل جو مذہبی کتابوں کی مخالفت میں پیش کئے جاتے ہیں اور بہت پیچیدہ نظریات پر مشتمل ہوتے ہیں جیسا کہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء اگر خدا کی طرف سے وحی کی گئی کتاب کا متن سائنسی حقائق سے مختلف ہو تو سائنس کی بات تسلیم کرنے کے لئے مقدس کتاب کا انکار کرنا ضروری نہیں ہے، مزید یہ بھی کہ خدا کی کتاب کو ماننے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ سائنس کا انکار کریں. بلکہ یہ آپ کا علمی حق ہے کہ آپ بیک وقت دونوں کو تسلیم کر سکتے ہیں. تاہم درست طریقہ کار یہ ہے کہ آپ سائنس کو بطور بہترین وضاحت ضرور تسلیم کریں مگر ایمان کی حد تک تجاوز نہ کریں اور یہ اخذ نہ کریں کہ یہ بالکل حتمی اور قطعی ہے. اور ساتھ ہی ساتھ آپ خدا کی کتاب کو تسلیم کر سکتے ہیں کیونکہ اسکو تسلیم کرنے کے لیے آپ کے پاس معقول وجوہات ہیں. (دیکھئے مضمون خدائی شہادت-الہامی تصنیف قرآن)

آخری مفروضہ: آخری مفروضہ ایسا چشمہ فراہم کرتا ہے جس سے بہت سے ملحدین دنیا کو دیکھتے ہیں. یہ عینک جیسا کہ اس کتاب کی دیگر ابواب میں ذکر کیا گیا ہے ،فطرت پرستی ہے. فطرت پرستی کی دو اقسام ہیں؛ فلسفیانہ [[philosophical فطرت پرستی، طریقیاتی فطرت پرستی((Methodological۔ فلسفیانہ فطرت پرستی یہ ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر کی مادی عوامل سے وضاحت کی جاسکتی ہے اور کوئی بھی چیز مافوق الفطرت یا قدرت نہیں ہے. طریقیاتی فطرت پرستی یہ ہے کہ اگر کوئی بھی چیز سائنسی معلوم ہوتی ہے تو اسکا خدائی قوت یا حکمت سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا.

اس باب کے بقیہ حصے میں ہم ان مفروضات پر بات کریں گے اور اسکا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم سائنس کی بنیاد کی طرف جائیں کہ: سائنس کیا ہے؟، سائنس کی حدود کو سمجھیں اور سائنس کے فلسفے میں موجود چند بحثوں کی گرہیں کھولیں۔

سائنس کیا ہے؟

لفظ سائنس لاطینی زبان کے لفظ سائنٹیا[[scientia سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنٰی ہیں علم. سائنس یہ جاننے کی انسانی کوشش ہے کہ مادی دنیا کیسے کام کرتی ہے. ماہرِ علمِ ریاضیات و فلاسفر آف سائنس برٹرینڈ رسل نے بہترین الفاظ میں سائنس کی وضاحت کی ہے کہ سائنس ''کسی چیز کو دریافت کرنے کی کوشش ہے، جس کی بنیاد مشاہدات اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج پر ہے... خصوصی طور پر دنیا سے متعلق حقائق اور وہ قوانین جو ان حقائق کو منسلک کرتے ہیں.''(303)

رُسل((Russel کی تعریف کی روشنی میں ہم سائنسی طریقہ کار کو مزید حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں.

سائنس کا ایک خاص دائرہء کار ہے. یہ مادی دنیا پر توجہ مذکور کرتی ہے اور صرف فطرت کے عوامل اور مظاہر پر گفتگو کر سکتی ہے۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو سوالات جیسا کہ روح کیا ہے؟ معنویت کیا ہے؟ یہ سائنسی دائرہ کار سے باہر کے سوالات ہیں.

سائنس کا مقصد مادی دنیا کی وضاحت کرنا ہے، بطورِ مجموعی اس کا مقصد یہی ہے کہ یہ اس بات کی درست وضاحت کرے کہ فطرت کیسے کام کرتی ہے؟ اس مقصد کی تکمیل کے لیے سائنس قابلِ آزمائش مفروضوں پر کام کرتی ہے. کسی مفروضے کے قابلِ آزمائش ہونے کیلئے ضروری ہے وہ عقلی طور پر کچھ توقعات کو جنم دے،اس مفروضے کو دیکھئے؛''چائے پہلوانوں کی کارکردگی کو بہتر کرتی ہے''یہ مفروضہ آزمائش اور امتحان کرنے کے قابل ہے، کیونکہ یہ درج ذیل توقعات کو جنم دیتا ہے؛ چائے کارکردگی کو بہتر کرتی ہے. چائے کارکردگی پر برا اثر ڈالتی ہے. چائے کا کارکردگی سے کوئی تعلق نہیں.

سائنس کاایک خوبصورت پہلو یہ ہے کہ ایسا نہیں کہ یہ درست مفروضے کی تحقیق کرتی ہے بلکہ یہ تجربات اور آزمائش کو بھی ضروری قرار دیتی ہے. یہی وجہ ہے کہ سائنسی رائے محض قابل آزمائش نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت اسے آزمایا بھی گیاہوتاہے. نتائج کاواحد مجموعہ زیادہ پسندیدہ انتخاب نہیں ہے بلکہ اصل سائنس یہ پسند کرتی ہے کہ مختلف سائنس دان جتنی زیادہ مرتبہ ہوسکے اپنے تجربوں کودہرائیں۔

جن باتوں کااب تک تذکرہ کیا جاچکاہے ،یقیناً سائنس اس سے کہیں زیادہ ہے، مگر یہ باتیں سائنسی طریقہ کار کے بنیادی عناصر کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں. یہ سائنس سے متعلق ان غلط مفروضوں کاجواب دینے میں مددگار ثابت ہونگی جو بعض الحاد پرستوں نے قائم کئے ہوئے ہیں کہ سائنس الحاد پرستی کی طرف لے جاتی ہے..!

مفروضہ: سائنس حقیقت کو جاننے کاواحد راستہ ہےاور یہ تمام سوالوں کے جواب دے سکتی ہے۔

اس دعویٰ کو سائنسیت [scientism] کہاجاتاہے۔اس کے مطابق اگر کسی بیان کو سائنسی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا تو وہ سچ نہیں ہے. الحاد پرستوں اور انسان پرستوں سے مختلف مواقع پر گفتگو سے یہ پتا چلا کہ وہ مستقل یہ دعوی کرتے ہیں. جبکہ سائنس دنیا کے بارے میں سچ واضح کرنے کاواحد راستہ نہیں ہے. سائنسی طریقہ کار کا محدود دائرہ یہ واضح کرتاہے کہ سائنس تمام سوالوں کے جوابات دینے سے قاصر ہے. اس کی چند حدود درج ذیل ہیں؛

1. یہ مشاہدے تک محدود ہے.

2. اخلاقی طور پر غیر جانبدار ہے.

3. یہ ذاتی تحقیق نہیں کرسکتی.

4. یہ (اس بات کا) جواب نہیں دے سکتی کہ چیزیں کیوں ہو رہی ہے.

5. بعض مابعد الطبیعاتی (میٹافزیکل) سوالوں کے جوابات نہیں سے سکتی.

6. قطعی حقیقت کو ثابت نہیں کر سکتی.

تاہم اس سے پہلے کہ ہم سائنس کے محدود ہونے کی بحث کریں، یہ بات قابلِ غور ہے کہ سائنس ازم کا نظریہ خود کی نفی کا باعث ہے[.[scientism is self-defeating سائنس ازم یہ دعویٰ کرتی ہے کہ کوئی بھی بیان درست نہیں ہے اگر اسے سائنسی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا، تو اوپر لکھا گیا ہے یہ جملہ خود سائنسی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا. یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے یہ کہا جائے کہ ''اردو زبان میں کوئی جملہ تین الفاظ سے زیادہ نہیں ہو سکتا'' یہ دعوی خود اپنے آپ کو غلط ثابت کر رہا ہے کیونکہ یہ جملہ خود تین الفاظ سے زیادہ ہے.(304)

1۔مشاہدے تک محدود:

یہ واضح حد بندی محسوس ہوتی ہے مگر اسے عموماً مکمل طور پر سمجھا نہیں جاتا. سائنس دان ہمیشہ اپنے مشاہدے تک محدود ہوتے ہیں، مثال کے طور پر اگر کوئی سائنس دان چوہوں پر کیفین کے اثرات کو جانچنا چاہتا ہے تو وہ ان چوہوں کی تعداد اور اقسام تک محدود ہے جو اس کے پاس تجربے کے وقت موجود ہوں. سائنسی فلسفی ایلیٹ سنوبر اپنے مضمون ''تجربہ کاری'' میں اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہیں؛ ''کسی بھی موقع پر سائنس دان ان مشاہدات تک محدود ہوتے ہیں جو اس کے پاس موجود ہوں...اور خامی یہ ہے کہ سائنس ان مسائل پر توجہ مذکور کرنے پر مجبور ہوتی ہے جن کو مشاہدات حل کر سکتے ہوں.''(305)

نہ صرف یہ کہ سائنس دان مشاہدے محتاج ہیں بلکہ یہ بھی کہ مستقبل کے مشاہدے نئے نتائج اخذ کر سکیں جو کہ گذشتہ مشاہدے کے مخالف جا سکیں.(The Problem of Induction) ایک اور حد یہ ہے کہ ٹیکنالوجی میں

ترقی یا بارہا تحقیق کرنے کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ جن چیزون کا ہم آج مشاہدہ نہین کر پارہے مستقبل میں ہم ان کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں. مائیکرواسکوپ اور الیکٹرانک مائکرواسکوپ کی ایجاد اور استعمال سائنسی ترقی کی بہترین مثال ہے. اسی لیے مادی دنیا کے بارے میں اپنی موجودہ سمجھ بوجھ کے متعلق کوئی یقینی مؤقف قائم نہیں کر سکتے کیونکہ مشاہدت میں بہتری کے ساتھ یہ بدل سکتا ہے.

2۔اخلاقی طور پر غیر جانبدار؛

سائنس اخلاقی طور پر غیر جانبدار ہے،اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ سائنس دانوں میں اخلاقیات نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس اخلاقیات کی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہے. مثال کے طور پر سائنس اخلاقیات کا مطلب یا اسکے مقاصد نہیں بیان کر سکتی اور یہ نہیں بتاسکتی ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح؟

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ سائنس ان مختلف شعبوں کے امتزاج کا حصہ نہیں بن سکتی جو اخلاقیات کا درس دیتے ہوں. تاہم سائنس بذات خود ایسی بنیاد فراہم کرنے میں ناکام ہے جو یہ بتاسکے کہ ہم کس چیز کو اچھا تصور کریں اور کس کو برا.

سائنس لازمی طور پر یہ تو بتاتی ہے کہ ''کیا ہے'' مگر یہ نہیں بتاتی کہ ''کیا ہونا چاہئیے''، یہ جملہ ''کیا ہے'' سے ہم یہ اخذ نہیں کر سکتے کہ ''کیا ہونا چاہئیے''. یہ ایک فلسفیانہ جملہ ہے مگر کسی حد تک سچ ہے. سائنس یہ بتاسکتی ہے کہ کسی کو چھری یا چاقو لگے تو کیا ہوتا ہے، تمام متاثرہ عوامل بتاسکتی ہے، مگر یہ نہیں بتاسکتی ہے کہ کیا یہ غیر اخلاقی ہے. خون، درد اور جسمانی نقصان کسی زندگی بچانے والی اہم سرجری کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے یا کوئی قاتلانہ حملہ کا. قابل غور بات یہ ہے کہ کسی انسان کے گوشت میں میں کٹ لگنے اور چھری کے جسم میں داخل ہونے کے عمل کو سمجھنا کسی اخلاقی نتیجے تک نہیں پہنچا سکتا.

چارلس ڈارون نے اخلاقیات اور سائنس (بالخصوص بائیو لوجی) کا مطالعہ کیا، اور بائیولوجیکل عوامل سے اخلاقیات کے درس کی ممکنہ صورت کی مثال پیش کی، اس کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہماری مختلف بائیولوجی کی شرائط کے مطابق پرورش پاتے تو ہمارا اخلاقی تصور موجودہ نظریات سے مختلف ہو سکتا تھا. (306) ڈارون یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ انسانی اخلاقی تصور دراصل پہلے سے تہہ حیاتیاتی شرائط کا نتیجہ ہے. اگر مستقبل میں یہ شرائط کا مجموعہ بدل جاتا ہے تو نتیجتاً اخلاقیات کا معیار بھی بدل جائے گا. یہ بات اخلاقیات کے مطلب کے تعین اور اس کی بنیاد پر بڑا اثر رکھتی ہے. اول تو یہ کہ حیاتیاتی یا طبیعی شرائط کا اخلاقیات کی بنیاد کے طور پر قیام، اخلاقیات کے موضوع کو خراب کرتا ہے کیونکہ اخلاقیات کا تعلق ہماری طبیعی حالت میں متوقع تبدیلیوں کیساتھ ہوتا ہے۔ اخلاق مادی دنیا میں تیزی کے ساتھ بدلتے تھے اور بدلتے ہیں. جبکہ یہ بات اس فطری اور ناقابل تردید حقیقت کی مخالفت کرتی ہے کہ اخلاق کا تعلق ذات یا حالات سے نہیں ہوتا بلکہ حیاتیات سے ہوتا ہے اور یہ پہلے سے متعین ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اگر ہماری اخلاقی حس کی بنیاد بائیولوجیکل حالات پر ہوئی تو ہمارے اخلاق کا کیا مطلب ہوا؟ اگر ہمارے لئے اخلاقیات کا معیار ہی کچھ اور ہوگا، اگر ہماری پرورش مختلف حالات میں ہوتی تو پھر ہمارے اخلاق کی کوئی حیثیت ہی نہ رہی. کیونکہ اس طرح یہ محض اتفاق اور جسمانی عوامل کا نتیجہ ٹھہریں گے۔

ایک بدلحاظ ملحد اور نیوروسائنٹسٹ سیم حارث (Sam Harris) اپنی کتاب ''دی مورل لینڈ سکیپ (The Moral Landscape)'' میں یہ وضاحت کرتے ہوئے کہ کس طرح سائنس ہماری اخلاقی اقدار معلوم کرسکتی ہے، معروضی اخلاقیات [Objective Morality] کی حس کو ثابت کرنے کی کوشش کی. اسکی پیروی کرنے والے الحادپرست ساتھیوں نے اس کی کوششوں کو سراہا مگر اسے اپنے ہی ہم خیال ساتھیوں اور خدا کی ذات پر یقین رکھنے کے حامل لوگوں کی طرف سے سخت تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا. حارث نے اخلاقیات سے متعلق اپنا نقطہ نظر [landscape of morality] ہمارے سامنے اس طرح پیش کیا کہ اس نے اخلاقی اچھائی کو بلندی پر رکھا اور اخلاقی برائی کو گہری پستی میں. حارث نے برائی کو نقصان اور اچھائی کو فلاح قرار دیا ہے لیکن یہ معقول نہیں. اگر

یہ ثابت کر دیا جائے کہ لوگ دوسروں کو نقصان پہچا کر اپنی بھلائی کر سکتے ہیں تو اسکی اخلاقیات کا خاکہ تباہ ہو جائے گا۔ فرض کریں اس رشتہ دار سے جس سے نکاح حرام ہو، مانعِ حمل تدابیر اختیار کرتے ہوئے باہمی رضامندی سے ازدواجی تعلقات قائم کیا جائے جس سے دونوں فریقین کو فرحت ملے اور کسی قسم کے نقصان یا مصیبت کا بھی خطرہ نا ہو۔۔! بحث کے دوران میں نے یہ معاملہ پروفیسر کراس((Krauss کے سامنے بھی اٹھایا مگر وہ اپنے مؤقف کو پورے یقین کے ساتھ واضح نہیں کر سکے. (انہوں نے کہا کہ انہیں یہ واضح نہیں ہے کہ یہ غلط ہے اور وہ اخلاقی طور پر اس کی مذمت بھی نہیں کر سکے (307). یہ لازمی نہیں ہوتا کہ جو اشیاء ہمیں نفع پہنچائیں وہ اخلاقی طور پر بھی ٹھیک ہوں ۔اگر کوئی اس مثال سے اتفاق نہ کرے، ایسی دیگر بہت سی مثالیں ہیں جو اس نقطہ نظر کو واضح کر سکتی ہیں.

الحاد پرست اور فلاسفر آف سائنس رابرٹ جانسن نے اپنی کتاب ''عقلی اخلاقیات (ریشنل موریلٹی)''میں حارث کی دلیل پر اسی قسم کی تنقید کی ہے. جانسن نے لکھا؛''ایسا لگتا ہے کہ حارث ابھی بھی اس مسئلے کا شکار ہیں اور وہ یہ فرض کر رہا ہے کہ ''بھلائی''نامی چیز کا حقیقت میں وجود ہے. کیا ہم اس حقیقت کو چٹانوں تلے پتھروں پر تلاش کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس کو کوانٹم مکینکس کے قوانین کے تناظر میں اسے ثابت کر سکتے ہیں؟ نہیں. دراصل وہ واحد شے جو ہمارے ان خیالات کے پیچھے ہیں کہ اخلاقی حقائق وجود رکھتے ہیں، وہ محض ہمارے فطری تصورات ہیں۔۔ یہ مسئلہ بذات خود منصفانہ اور آسان الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ حارث نے یہ درست تشخیص کی ہے کہ فی الحال اخلاقیات کی تعریف کیسے کی جاتی ہے، اسکا یہ مطلب نہیں کہ اخلاقیات کو حقیقت مان لینا چاہیئے. درحقیقت حارث خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ ہم بہت سی ایسی چیزوں کی اجازت دیتے ہیں جو کہ غیر اخلاقی ہے.''(308)

3۔ذاتی/شخصیتی تحقیق نہیں کر سکتی:

سائنس کو اپنے اوپر ناز ہے کہ وہ تجربات کے ذریعے نظریے کو جانچتی ہے. تجربات کے بغیر سائنس نہیں. تاہم بعض اوقات آزمانے سے اعتماد ٹوٹ جاتا ہے. مثال کے طور پر ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ لوگ کیا خواہش رکھتے ہیں؟ یا لوگ کیا محسوس کر رہے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ سائنسدان یہ دلیل دیں کہ جھوٹ جاننے والا آلہ اور دیگر نفسیاتی اور رویوں کی نشاندہی کے ذریعے ہم احساسات کا پتہ لگا سکتے ہیں (حالانکہ یہ دعویٰ غلط ہے، اس کی وضاحت ذیل میں موجود ہے) بظاہر ان کی بات معقول لگتی ہے مگر یہ اتنی سادہ ہے نہیں. آپ دوستی کی مثال لیں۔ آپ کا دوست آپ سے پوچھتا ہے کہ آپ کا دن کیسا گزرا؟ آپ کے احساسات کیا ہے؟ آپ کہتے ہیں بہت عمدہ دن تھا اور میں بہت خوش ہوں. تصور کیجئے اگلے دن آپ اس سے ملتے ہیں تو وہ یہی سوال دہراتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ یقین صرف اس صورت میں کرے گا کہ آپ اپنے آپ کو جھوٹ بولنے والے آلے کے ساتھ منسلک کر کے فزیولوجیکل ثبوت دیں. کیا اس عمل سے آپ کی دوستی کو نقصان نہیں پہنچے گا؟ اگر وہ آپ کے ہر جواب پر یہ مطالبہ کرے تو کیا اس سے آپ کے تعلقات پر کوئی اثر پڑے گا؟ یقیناً پڑے گا. دوستی کا لطف ہی تب ہے جب ہم اعتماد کریں اور ایک دوسرے کا یقین کریں.

اسی طرح ایک اور مثال جذبات کی ہے. ہمیں یہ کیسے پتا چلے گا کہ کوئی ڈپریشن محسوس کر رہا ہے؟ کیا ہمارے پاس ڈپریشن یا مایوسی کو جانچنے کے لئے بھی کوئی آلہ ہے جسے ہم استعمال کر سکیں؟ اگرچہ کچھ فزیولوجیکل (جسمانی) ڈیٹا کچھ مدد دیتا ہے مگر اصل چیز ماہرِ نفسیات اور مریض کے درمیان گفتگو ہی ہوتی ہے جو کہ بہت سارے سوالات و جوابات پر مبنی ہوتی ہے. ضروری یہی ہوتا ہے کہ ہم مریض کی باتوں پر یقین کریں. لہٰذا مجھے یہ لگتا ہے کہ انسانی زندگی کے بعض شعبوں میں صرف مشاہدہ ہی کافی نہیں ہوتا جیسا کہ دوستی اور ذہنی معاملات میں۔ تو ثابت یہ ہوا کہ سائنس صرف تجربے پر انحصار نہیں کر سکتی اسکو اعتماد اور یقین بھی کرنا پڑتا ہے۔

سائنس صرف کسی تیسرے فرد کی فراہم کردہ معلومات کو ڈیل کرتی ہے، انسان کی عادات، مزاج، احساسات اور تجربات کیا تھے کا دارومدار محض اس بات پر ہے کہ ہم اس تیسرے شخص کی بات پر اعتماد کریں. جبکہ انکا تعلق فرسٹ پرسن سے ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سائنس کسی شخصیت کو مکمل جان نہیں سکتی۔

4۔سائنس کے پاس ''کیوں ''کا جواب نہیں؛

فرض کریں میری چچی آپ کے دروازے پر دستک دیتی ہے اور آپ کو گھر کا بنا خوبصورت چاکلیٹ کیک دے جاتی ہے ،آپ اسے قبول کر لیتے ہیں اور اپنی ٹیبل پر رکھ دیتے ہیں۔اس کا پہلا لقمہ لینے سے پہلے آپ کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ وہ مجھے یہ کیوں دے کر گئی ہیں؟ بحثییت سائنسدان آپ اس کیک کی تحقیق کر سکتے ہیں،اس پر تحقیق کر کے آپ اسکے اجزاء کا تو پتا لگا لیں گے اسکا بھی کہ یہ کس درجہء حرارت پر پکا ہے مگر یہ تمام معلومات آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتیں.اس کا واحد حل یہ ہے کہ آپ خاتون سے پوچھیں.اس مثال سے یہ واضح ہے کہ سائنس ہمیں یہ تو بتا سکتی ہے کہ ''کیا ہے 'اور ''کیسے ہیں ''مگر یہ نہیں بتا سکتی کہ ''کیوں ہے ''. کیوں سے ہماری مراد یہ کہ ہر چیز کے پیچھے کوئی مقصد ہوتا ہے، پہاڑوں کا وجود کیوں ہے؟ سائنس اس کا جواب زمینی عوامل یا مادی اسباب کی بنیاد پر تو دے سکتی ہے مگر پہاڑوں کا وجود کے پیچھے کیا اصل مقصد تھا، سائنس یہ نہیں بتا سکتی. بہت سے لوگ اس بات ہی کا انکار کر دیں گے کہ ہر کام کا کوئی مقصد ہوتا ہے.

بہت سے ملحدین یہ خیال کرتے ہیں کہ مقصد تلاش کرنا محض مذاہب کی دقیانوسی سوچ کی وجہ سے ہے،اس دنیا میں اپنے وجود کو اس نظر سے دیکھنا بے فائدہ ہے. کپڑوں کی فیکٹری میں ہم بھی ایک کپڑا ہیں اور ہمیں بھی کپڑوں کے ڈھیر میں گرنا ہے کیونکہ ہم سے پہلے بھی کپڑے اس ڈھیر پر گر رہے تھے۔۔نہ صرف یہ کہ یہ غیر معقول بات ہے بلکہ یہ ہمارے اس مزاج سے بھی متضاد ہے کہ ہم روز مرہ کی سرگرمیوں میں وجہ یا مقصد تلاش کر کے ہی کوئی چیز اپناتے ہیں. تصور کیجئے کہ آپ یہ کتاب پڑھتے پڑھتے آخری باب تک پہنچ جاتے ہیں اور آپ کو آخری میں یہ جملہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ ''اس کتاب کو لکھنے کا کوئی مقصد نہیں !''. کیا آپ اس جملے کو سنجیدہ مان لیں گے ؟

5۔سائنس بعض ماطبیعیاتی[[metaphysical سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی؛

بعض سوالات ایسے ہیں جنہیں تجربے سے آزما کر سائنسی جواب نہیں دیا جاسکتا مثلا سائنس اپنے شعبے علمِ کائنات[[cosmology کی بنیاد پر کائنات کی ابتداء پر بحث کرتی ہے مگر پھر بھی چند معقول سوالوں کے جواب نہیں دے پاتی. جیسے: استخراجی منطق[[deductive reasoning سے اخذ کردہ نتائج کو پہلے سے موجود بنیاد کی پیروی کیوں کرنی چاہیے؟ کیا موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے؟ کیا روح کا بھی کوئی وجود ہے؟ یہاں کچھ نہیں کے بجائے کچھ کیوں ہے؟ سائنس ان سوالوں کے جوابات دینے سے قاصر ہے کیونکہ یہ انکا تعلق مادے اور مشاہداتی دنیا سے نہیں ہے۔

6۔ضروری سچائیوں[[Necessary truths کو ثابت نہیں کرسکتی:

سائنس میت[[Scientism ریاضی اور منطق کی ضروری سچائی کو ثابت نہیں کرسکتی جیسا کہ درست استخراجی دلیل[[deductive argument کے نتیجہ کو ضرور اپنے مقدمے کی پیروی کیوں کرنی چاہیے۔ یہ آرگومنٹ دیکھیے:

1۔ وہ نتائج جن کا دارومدار محدود مشاہدات پر ہوں وہ قطعی اور حتمی نہیں ہو سکتے.

2۔ سائنس کا دارومدار محدود مشاہدات پر ہے.

3۔ چنانچہ سائنسی نتائج قطعی یا حتمی نہیں ہو سکتے.

اس دلیل کی معقولیت کی بنیاد مشاہداتی ثبوت نہیں ہیں، اسکا تعلق منطقی دلائل کے بہاؤ[logical flow of [the argument سے ہے اور اسکو مقدمے کی سچائی سے کوئی لینا دینا نہیں۔ مقدمے اور نتیجے میں ایک منطقی ربط ہے اس ربط کا تعلق مشاہدے سے نہیں بلکہ ذہن سے ہے۔ کیا سائنس مقدمے اور سچائی میں منطقی ربط کو جسٹیفائی کرسکتی ہے؟ نہیں۔ ہمارے ذہن میں اسکا خاکہ ہوتا ہے جو ہمیں مقدمے سے نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ ہم ایسی چیز دیکھتے ہیں

جو مشاہدے پر مبنی نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے ہمارے ذہن کو منطق کے اندرونی ڈھانچے یا پہلو ہیں جو اس قسم کے استدلال کو سہولت دیتے ہیں۔ مشاہدے کی کوئی شکل استخراجی دلیل کے بہاؤ کو جسٹیفائی نہیں کر سکتی۔

اسی طرح ریاضیاتی سچ تین اور تین چھے ہوتے ہیں خالص مشاہداتی نہیں ہے۔(309) مثال کے طور پر پوچھا جائے کہ ایک فلاں جمع ایک فلاں جواب ہو گا دو۔ چاہے یہ معلوم ہی نا ہو کہ فلاں ہے کیا۔ ہم یہی جانتے ہیں کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔

علم و حکمت کے دوسرے ذرائع؛

سائنس علم و آگاہی کے دوسرے ذرائع کی وضاحت نہیں کر سکتی جیسا کہ گواہی کی بنیاد پر حاصل ہونے والا علم. پروفیسر بنجمن میکلیئر (Benjamin McMyler) اس بات کا خلاصہ لکھتے ہیں کہ: ''مجھے چند ایک باتیں معلوم ہیں کہ جیسے کہ فلاں جنگل میں سانپ پایا جاتا ہے یا یہ کہ نپولین جنگ ہار گیا تھا یا یہ کہ پیٹرول کی قیمت یہ ہے، یہ سب وہ چیزیں ہیں مجھے کسی کی گواہی سے پتہ چلی ہیں انہیں کسی ایک سے یا بہت سے لوگوں سے سنا گیا ہے'.(312)

بنجمن کا خلاصہ فطری ہے اور واضح کرتا ہے کہ کیوں بہت سا علم صرف سنی سنائی پر انحصار کرتا ہے۔ مثلاً اس بات پر ایمان کہ زمین گول ہے۔ اس کا دار و مدار ہم میں سے بہت سوں کا ریاضی یا سائنس پر نہیں بلکہ گواہی سے حاصل شدہ معلومات پر ہی مبنی ہے. ہو سکتا ہے آپ کا رد عمل اس بات پر کچھ اس قسم کا ہوں؛

''میں نے تصاویر دیکھی ہیں.''''میں نے یہ سائنس کی کتابوں میں پڑھا ہے.''میرے تمام اساتذہ نے یہی بتایا ہے.'' ''میں بلند ترین پہاڑ کی چوٹی میں جا کر زمین کی گولائی کو دیکھ سکتا ہوں.''اور اس قسم کی بہت ساری باتیں. یہ تمام

جوابات عقلی طور پر مطمئن نہیں کر سکتے ان سب کادار و مدار ان معلومات پر ہے کہ جو ہمیں لوگوں سے سن کر حاصل ہوئی ہیں. تصاویر کا مصور، کتاب کا مصنف اور استاد ہو یہ سب ذرائع ہیں جن کا ہم یقین کر رہے ہیں. اور پہاڑ کی چوٹی پر جا کر تحقیق کرنے والی بات بھی سنی سنائی ہے کیونکہ ہم میں سے اکثریت نے یہ کبھی ایسا نہیں کیا۔ آپکا یہ مفروضہ کہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر آپ تمام زمین کی گولائی کا پتا چلا سکتے ہیں بذات خود ایک سنی سنائی بات ہے. اگر آپ نے پہلے یہ کیا بھی ہو تو یہ زمین کی گولائی کو درست ثابت نہیں کر سکتا۔ چوٹی پر کھڑے ہو نا صرف یہ بتائے گا کہ زمین کہیں سیدھی ہیں اور کہیں گول۔ اسکا باقی حصہ سیدھا بھی ہو سکتا ہے، یہ آدھی گول بھی ہو سکتی ہے اور پھول کی طرح بھی ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہماری اکثریت جن حقائق کو تسلیم کرتی ہے وہ در حقیقت دوسروں سے حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہے

.دوسروں سے حاصل شدہ معلومات کے بغیر علم ممکن ہی نہیں ہے. تصور علم کے پروفیسر سی اے جے کوڈی اب تک پیش کیے گئے پوائنٹ کا خلاصہ بیان کرتے اور ایسی باتوں کی لسٹ بناتے ہیں جو صرف گواہی کی بنیاد پر ہی قبول کی گئی ہیں ""ہم میں سے بہت سے لوگوں نے بچہ پیدا ہوتا نہیں دیکھا ہو گا، نا ہی خون کی گردش کا مشاہدہ کیا ہو گا، نا زمین کے اصل جغرافیہ کو دیکھا ہو گا، نا زمین کے کسی قانون کا مشاہدہ کیا ہو گا، نا کبھی اسکا بات کا مشاہدہ کیا ہو گا کہ آسمان میں روشنی جن اجسام کی وجہ سے ہے وہ کتنے فاصلے پر ہیں:۔(313) گواہی کی اہمیت کے موضوع پر مزید تفصیل کے دیکھیے تحریر: خدائی شہادت: الہامی تصنیف قرآن

مختصر یہ کہ یہ نظریہ کہ سائنس ہی واحد ذریعہ ہے جس سے حقائق کو جانا جا سکتا ہوں، غلط ہے. سائنس ازم کا نظریہ اپنا رد خود کرتا ہے: سائنس علم حاصل کرنے کا محدود ذریعہ ہے، اسکو اخلاقی، ریاضیاتی، منطقی سچائی جاننے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا، اسطرح علم کے دوسرے ذرائع مثلا شہادت کی بنیاد پر حاصل ہونا والا علم بھی موجود ہیں جن سے علم حاصل ہوتا ہے لیکن وہ سائنسی نہیں ہیں۔

☆تو کیا سائنس نے خدا کو غلط ثابت کر دیا ہے؟

اوپر بحث کی روشنی میں اسکا جواب 'نہیں' ہے، سائنس علم کا ایک خوبصورت طریقہ جس نے انسانیت کو بہت نفع پہنچایا ہے لیکن اسکے نتائج پتھر پر لکیر نہیں ہوتے۔ سائنس تحقیق کے اپنے ایک مخصوص طریقہ کار کی حیثیت سے خدا کے وجود کا انکار نہیں کر سکتی، سارے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی اور حقیقت کو جاننے کا واحد ذریعہ نہیں۔ سائنس کے متعلق بہت سے الحادی مفروضے ذاتی خواہشات پر مبنی، غیر منطقی اور فلاسفی آف سائنس سے ناواقفیت کی بناء پر ہیں۔

حوالہ جات:

Gauch, H. G,]r. (2012) Scientific Method in Brie£ 301 Cambridge: Cambridge University Press, p. 98.

Farhad, A. (2013) Richard Dawkins – science works bitches! 302 Available at: https:llyoutu.be/OOtFSDKrq88?t=73 [Accessed 2nd October 2016].

Russell, B. (1935) Religion and Science. Oxford: Oxford 303 University Press, p. 8.

Adapted from DPMosteller. (2011) Has science made belief 304 in god unreasonable,]. P. Moreland. Available at:

http://www.youtube.com/watch?v=TU9iiCqHxbE [Accessed 2nd October 2016].

Sober, E. (2010). Empiricism. In: Psillos, S and Curd, M, ed, 305 The Routledge Companion to Philosophy of Science, pp. 137-138.

Darwin, C. The Descent of Man and Selection in Relation to 306 Sex. 2nd Edition, p. 99. Available at: http://www.gutenberg.org/ebooksI2300 [Accessed 4th October 2016].

iERA (2013) Lawrence Krauss vs Hamza Tzortzis – Islam vs 307 atheism debate. Available at: https://youtll.be/uSwJuOPG4FI?t=4161 [Accessed 18th October 2016]

Johnson, R. (2013) Rational Morality: A Science of Right 308 and Wrong. Great Britain: Dangerous Little Books, pp. 19-20.

Craig, W.L. (2011) Is Scientism Self-Refuting. Available at: 309 http://www.reasonablefaith.orglis-scientism-self-refuting [Accessed 4th October 2016].

McMyler, B. (2011) Testimony, Truth and Authority. New 310 York: Oxford University Press, p. 3.

Lackey,]. (2006) Introduction. In: Lackey,]. and Sosa, E. 311 (ed.). The Epistemology of Testimony. Oxford: Oxford University Press, p. 2.

McMyler, B. (2011) Testimony, Truth and Authority, p 10.312

m Coady, C. A (1992) Testimony: A Philosophical Study. Oxford: Oxford University Press, p. 82.

See Shapiro,]. A. (2011) Evolution: A View from the 21 Sf 314 Centuty. New Jersey: FT Press; and Pigliucci, M. and Mulier, G. B. (ed). (2010) Evolution: The Extended Synthesis. Cambridge, MA: MIT Press; and Godfrey-Smith, P. (2014) Philosophy of Biology. Princeton, NJ: Princeton University Press.

Barker, G. and Kitcher, P. (2013) Philosophy of Science: A 315 New Introduction. Oxford: Oxford University Press. 2014, p. 17.

Annas,]. and Barnes,]. (1994). Sextus Empiricus: Outlines of 316 Scepticism. New York: Cambridge University Press, p. 123.

Hume, D. (2002) Of scepticism with regard to reason. In: 317 Epistemology: Huemer, M, ed, Contemporaty Readings. Abingdon: Routledge, pp. 298-310. Originally published in Hume, D. (1902) Sceptical doubts concerning the operations of understanding. In: Selby-Bigge, 1. A, ed, An enquity concerning human understanding. In: Enquiries concerning human understanding and concerning the principles of morals, 2nd edition. Oxford: Clarendon Press, pp. 298-310.

Ibid, p. 305.318

Ibid, pp. 304-5.319

Rosenburg, A (2012) Philosophy of Science: A 320 Contemporaty Introduction. New York: Routledge, p. 182.

Okasha, S. (2002) Philosophy of Science, A Vety Short 321 Introduction. Oxford: Oxford University Press, p. 77.